جولائی - ستمبر ۲۰۱۵

اُردو ادب میں عالمی معیار کا تحقیقی و تخلیقی مجلہ

سہ ماہی

الاقرباً

اسلام آباد

''مجھے یہ بات بھی بالکل واضح کرنے کی اجازت دیجئے کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہوگی اور کوئی زبان نہیں ہوگی۔ جو کوئی بھی آپ کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ حقیقت میں پاکستان کا دشمن ہے۔''

قائداعظم محمد علی جناح
ڈھاکہ
۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء
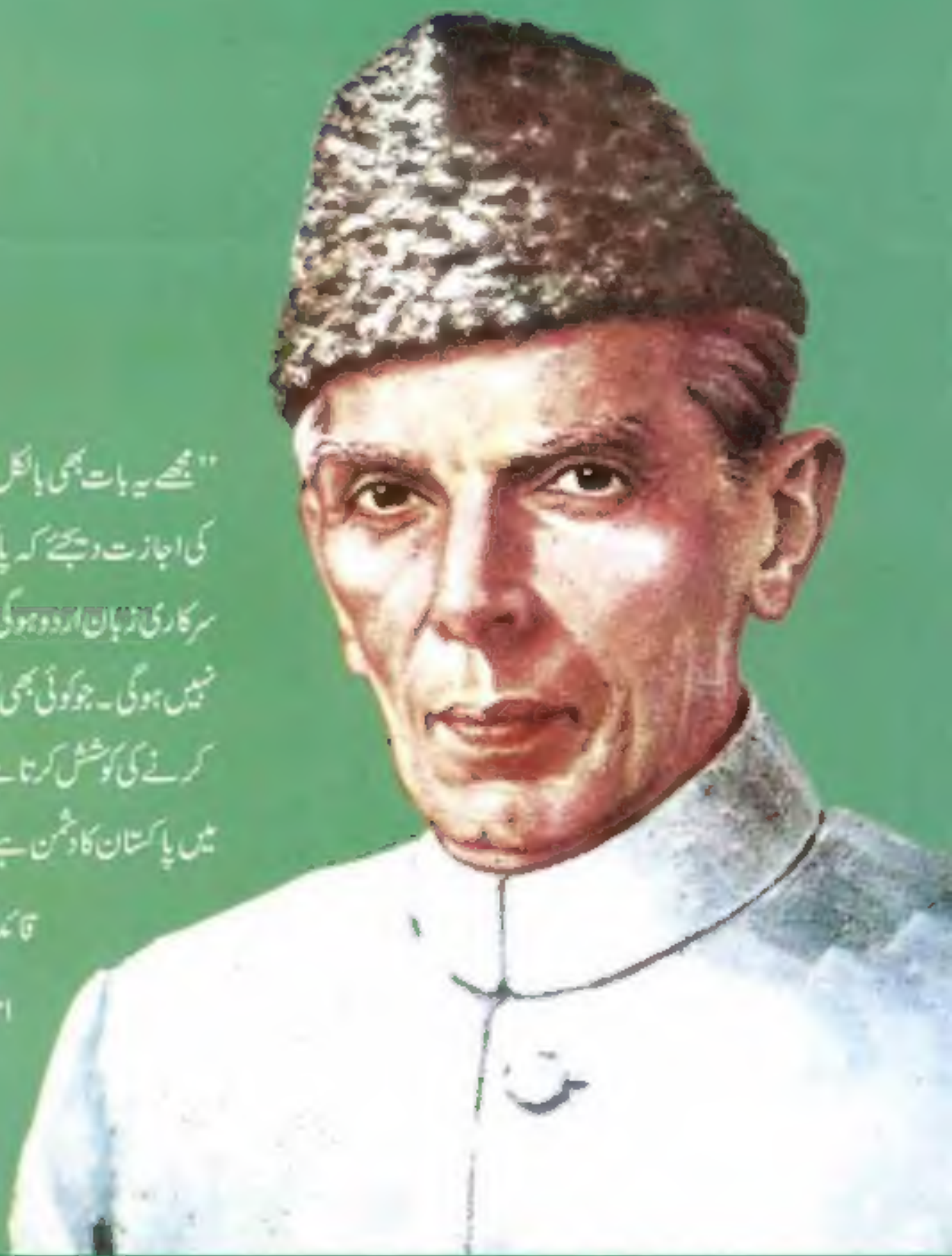
الاقرباء فاؤنڈیشن، اسلام آباد

سہ ماہی **الاقرباء** اسلام آباد

(تہذیب و معاشرت، علم و ادب اور تعلیم و ثقافت کی اعلیٰ قدروں کا نقیب)

جلد نمبر ۱۸ شمارہ نمبر ۳ جولائی۔ستمبر ۲۰۱۵ء

الاقرباء فاؤنڈیشن، اسلام آباد

مکان نمبر ۳۶۴، سٹریٹ نمبر ۵۸، آئی ۸/۳، اسلام آباد (پاکستان)

Fax 051-2221670
Ph.051-4442686
E-mail
alaqreba@hotmail.com
website
www.alaqreba.com

2-A Barclay Chamber, Barclay Road, Leytonstone

London, E-11. 3 DG (U.K.)

Phone (0208)5582289, Fax (0208)5583849

Email: Barqureshi@ hotmail.co.uk

محمد اویس جعفری

3202, 140th street, SE

Mill Creek WA 98012- 4677 (USA)

Phone: (001) 425-385-8666

E-mail: Jafreyomi@gmail.com

زرِ تعاون

فی شمارہ	۳۰۰ روپے
سالنامہ ۲۰۱۵ء	۶۰۰ روپے
سالانہ (مع محصول ڈاک)	۱۲۰۰ روپے
بیرون ملک فی شمارہ (مع محصول ڈاک)	۱۰ امریکی ڈالر/ ۷ برطانوی پاؤنڈ
بیرون ملک سالانہ (مع محصول ڈاک)	۴۰ امریکی ڈالر/ ۳۰ برطانوی پاؤنڈ

کوائف نامہ

شمارہ	جولائی۔ ستمبر ۲۰۱۵ء
کمپوزنگ	محمد انور چوہدری
طابع	ضیاء پرنٹرز، اسلام آباد
ناشر	سید ناصر الدین

مندرجات

انشائیہ۔افسانہ

متفرقات

حمد و نعت

غزل

نظم

ادار یہ

اوّل اوّل ہر قدم پر تھیں ہزاروں منزلیں
آخر آخر اک مقامِ بے مقام آ ہی گیا

محبانِ وطن! مژدہ ہو کہ آپ کے پاکستان کی عدالتِ عظمٰی کے چیف جسٹس عزت مآب جواد ایس خواجہ اور ان کے گرامی مرتبت رفقاء نے آپ کے وطن عزیز کی پیشانی سے یہ داغ ہمیشہ کے لیے دھو دیا ہے کہ دنیا بھر کے اسلامی ملکوں میں پاکستان واحد ملک ہے جہاں غیر ملکی زبان سرکاری زبان ہے دوسری طرف یہ حسنِ اتفاق کسی بھی مورخ کے لیے ناقابل فراموش ہوگا کہ بابائے اُردو صحافت مولانا ظفر علی خاں مرحوم جنھیں قراردادِ پاکستان (۱۹۴۰ء) کو اردو میں ترجمہ کرنے کا اعزاز بھی حاصل تھا اور جناب جسٹس جواد ایس خواجہ جو پاکستان کی تہذیبی و قومی شناخت کا ایک پُر عظمت اور تاریخ ساز باب رقم کر چکے ہیں دونوں ہی وزیر آباد میں وطن کی مٹی سے جنم لینے والے فرزندانِ عظیم ہیں۔

وہ تمام مراحل و منازل جن سے گزر کر ہم قومی تشخص کے حصول کی منزل تک پہنچے اس کا نقش اوّل بابائے قوم حضرت قائدِ اعظمؒ کی ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کی ڈھاکہ میں وہ یادگار تقریر ہے جس کے صرف چند جملوں ہی کو بانی پاکستان کی بصیرت کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ ہوں:

"مجھے یہ بات بھی بالکل واضح کرنے کی اجازت دیجئے کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہوگی اور کوئی زبان نہیں ہوگی۔ جو کوئی بھی آپ کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ حقیقت میں پاکستان کا دشمن ہے۔ جب تک ایک سرکاری زبان نہ ہو کسی قوم میں بھی پائیدار اتحاد قائم نہیں ہو سکتا۔"

قائدِ اعظمؒ کے ان ارشادات کے تناظر میں اگر ۱۹۷۱ء میں اُس وقت کے پاکستان کے

دولخت ہونے کی پس پردہ حقیقتوں کا جائزہ لیا جائے تو سب سے اہم بنیادی سبب بنگلہ زبان کا ہندی/سنسکرت رسم الخط ہے جب کہ مغربی پاکستان میں تمام علاقائی زبانوں کا بنیادی رسم الخط بشمول اردو زبان قرآنی رسم الخط ہے جو لسانی ہم آہنگی اور قومی اتحاد کا ضامن ہے۔ اردو رسم الخط کو رومن رسم الخط میں تبدیل کرنے کا وقتاً فوقتاً جو شوشہ چھوڑا جاتا رہا ہے وہ بلاشبہ پاکستان دشمنی کے مترادف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو بحیثیت قومی زبان ہمارا سرمایۂ افتخار ہے جو نہ کسی لسانی تعصب پرمبنی ہے اور نہ جغرافیائی حدود کی اسیر۔ یہی وجہ ہے کہ خود اقوام متحدہ کا ذیلی ادارہ یونیسکو اپنے ایک عالمگیر سروے (۲۰۰۸ء) میں بتا چکا ہے کہ اردو دنیا بھر میں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے والی تیسری عالمی زبان ہے لیکن جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ پاکستان مخالف سفارتی حلقوں کی سازش کے زیر اثر اردو کو 'ہندوستانی' کا نام دیدیا گیا ہے حالانکہ اس نام کی کوئی زبان دنیا کے کسی بھی خطے میں موجود نہیں جب کہ ہندوستان (انڈیا) کی قومی و سرکاری زبان بھی 'ہندوستانی' نہیں 'ہندی' ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے بار بار توجہ دلانے کے باوجود ہماری وزارت خارجہ نے اس ضمن میں یونیسکو کے ریکارڈ میں تصحیح کے لیے اقوام متحدہ میں ہمارے سفارتی مشن کو نہ متحرک کیا اور نہ یہ مطالبہ کیا کہ اردو کو اقوام متحدہ کی سرکاری زبانوں میں شامل کیا جائے کہ اب یہ اردو زبان کا ناقابلِ تردید حق ہے۔

بہر حال داخلی محاذ پر اہلِ وطن کو جو کامیابی نصیب ہوئی ہے اس کا تمام تر سہرا عدالتِ عظمیٰ کے سر ہے جو آئین کی محافظ بھی ہے اور شارح و مفسر بھی۔ کم و بیش ڈیڑھ درجن تاریخہائے ساعت کے دوران جو صورت حال دیکھنے میں آئی ہے وہ ایک انتباہ بھی ہے اور ماضی سے سبق حاصل کرنے کا ایک موقع بھی۔ درخواست گزار ایڈووکیٹ جناب کوکب اقبال اور جناب سید محمود اختر نقوی خوش نصیب ہیں کہ اُن کی برسوں کی امید بر آئی اور مقتدر حلقوں کی جانب سے حیلوں بہانوں کے باوجود جن میں ایک وفاقی وزیر کی یہ خرد باختہ تجویز بھی شامل ہے کہ اردو اور انگلش کو 'اُردش' نام دے کر بیک وقت نافذ کر دیا جائے بفضلِ خدا حتمی فیصلہ عوام کی امنگوں کا ترجمان ثابت ہوا۔ ۱۰ جولائی کی

سماعت کے دوران وفاقی سکریٹری اطلاعات نے وزیراعظم کا حکم نامہ پیش کیا کہ حکومتی عہدہ دار آئندہ اردو میں تقاریر کریں گے لیکن ۲۴ اگست کو نئی دہلی میں منعقدہ پریس کانفرنس میں بھارتی وزیر خارجہ سشما سوراج نے ہندی میں اور وزیراعظم پاکستان کے مشیر برائے امور خارجہ سرتاج عزیز نے انگریزی زبان میں پریس کانفرس سے خطاب فرمایا مختلف تاریخہائے سماعت کے دوران عزت مآب جناب جواد ایس خواجہ اور دیگر بینچ کے فاضل اراکین کو جن میں جسٹس دوست محمد، جسٹس عظمت سعید اور جسٹس مقبول باقر شامل تھے بعض مواقع پر ایسے ریمارکس بھی دینا پڑے جن سے خود حکومت میں موجود عناصر کی رخنہ اندازی کی نشاں دہی ہوتی تھی حکومت کی جانب سے نفاذِ اردو کے ضمن میں وزیراعظم کے احکام پر مشتمل جو مراسلہ وفاقی وزارتوں، ملحقہ محکموں اور خودمختار و نیم خودمختار اداروں کو جاری کیا گیا وہ انگریزی زبان میں تحریر کیا گیا تھا۔ ایسے ہی تاخیری حربوں کی درج ذیل تفصیل عدالتی فیصلے میں شامل ہے۔

"گزشتہ سات ماہ کے دوران عدالت کی جانب سے جاری کردہ درج ذیل حکم ناموں کے طائرانہ جائزے سے ہی متعلقہ عمال حکومت کی آرٹیکل ۲۵۱ کے نفاذ کے معاملے سے عدم دلچسپی اور غیر سنجیدگی واضح ہو جاتی ہے"۔

۱	۲۰۱۵-۱-۲۲	جناب عبدالرشید اعوان فاضل DAG نے مختصر بیان جمع کرانے کی استدعا کی
۲	۲۰۱۵-۴-۱۰	فاضل لاء افسر کوئی اطمینان بخش جواب دینے سے قاصر ہے کہ آئینی شق سے کیا گیا انحراف تاحال درست کیوں نہ کیا جا سکا۔ تاخیر کی وجوہات جاننے کے لیے انھوں نے ایک مرتبہ پھر وقت مانگا ہے۔
۳	۲۰۱۵-۴-۲۳	فاضل لاء افسر نے ایک دفعہ پھر مزید جامع بیان داخل کرنے کے لیے وقت مانگا۔

۴	۳۰-۴-۲۰۱۵	فاضل لاء افسر نے ایک مرتبہ پھر مختصر بیان داخل کرنے کی غرض سے وقت مانگا۔
۵	۱۲-۵-۲۰۱۵	فاضل لاء افسر نے بیان کیا کہ اُن کی تمام تر کوششوں کے باجود حکومتِ پاکستان کے سیکرٹری کابینہ اور سیکرٹری انفارمیشن اور دیگر متعلقہ عہدیداران نے عدالتِ ہٰذا کے احکامات پر کان نہیں دھرے۔
۶	۱۳-۵-۲۰۱۵	فاضل اٹارنی جنرل پیش ہوئے اور یقین دہانی کرائی کہ اگر حکومت کو کچھ اور وقت دیا جائے تو آئین کے آرٹیکل ۲۵۱ کے نفاذ سے متعلق ٹھوس تجاویز پیش کی جا سکتی ہیں۔
۷	۲۰-۰۵-۲۰۱۵	عدالت نے مشاہدہ کیا کہ وفاقی حکومت کا رویہ غیر سنجیدہ ہے۔ فاضل DAG نے اپنی رپورٹ دائر کرنے کے لیے وقت مانگا۔ وفاقی حکومت پر ۱۰،۰۰۰ کا ہرجانہ عائد کیا گیا۔
۸	۰۲-۶-۲۰۱۵	احکامات کے باوجود وفاقی حکومت نے تاحال یہ واضح نہیں کیا کہ گزشتہ ۴۲ برس میں آئین کے آرٹیکل ۲۵۱ کے نفاذ کے لیے کیا اقدامات کئے گئے ہیں اور اگر نہیں تو اس نااہلی کا ذمہ دار کون ہے۔؟
۹	۰۵-۰۶-۲۰۱۵	عدالت نے مشاہدہ کیا کہ حکومتِ پنجاب پنجابی زبان کو اُس کا مقام دلوانے میں ناکام رہی ہے اور اس زبان کو حصولِ علم کا ذریعہ بنانے کے لیے کوئی خاطر خواہ اقدامات نہیں کیے گئے۔
۱۰	۱۱-۶-۲۰۱۵	سیکرٹری انفارمیشن نے بیان کیا کہ آئین کے آرٹیکل ۲۵۱ کے نفاذ کے لیے سمری مع تجاویز سیکرٹری کابینہ کو ارسال کی جا چکی ہے۔ اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل پنجاب نے رپورٹ جمع کروانے کے لیے مزید وقت مانگا۔

۱۱	۲۰۱۵۔۷۔۰۲	کابینہ کا فیصلہ زیرِ تجویز ہے لہٰذا مقدمے کی سماعت ملتوی کی گئی۔
۱۲	۲۰۱۵۔۷۔۱۰	کابینہ کا اجلاس ابھی نہیں ہو پایا کیونکہ وزیرِ اعظم بیرونِ ملک دورے پر ہیں تاہم فوری نفاذ کی غرض سے انتظامی طور پر جناب وزیرِ اعظم صاحب نے کچھ احکامات جاری کیے۔
۱۳	۲۰۱۵۔۸۔۱۱	سیکرٹری انفارمیشن نے بروئے مراسلہ بتاریخ ۲۰۱۵۔۷۔۰۶ اطلاع دی کہ حکومت کی جانب سے کچھ ہدایات جاری کی گئی ہیں۔ جناب سکندر جاوید چیئرمین جی۔ای۔سی۔ نے عدالت کو مطلع کیا کہ وزارتِ قانون نہ تو اُن کی جانب سے ترتیب دی جانے والی قانونی لغت کی طباعت میں کوئی دلچسپی لے رہی ہے (جس کا مقصد قوانین کے اُردو ترجے کو آسان بنانا ہے) اور نہ ہی کوئی مالی معاونت فراہم کر رہی ہے۔
۱۴	۲۰۱۵۔۰۸۔۱۸	حکومت کی جانب سے ابھی تک تسلی بخش انتظامات کی اطلاع موصول نہیں ہوئی۔

"مذکورہ بالا حکم ناموں سے عیاں ہے کہ آئین کے احکامات کے نفاذ کے لیے زبانی خاطر جمع سے بڑھ کر کوئی ٹھوس عملی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ جیسے اسے آئین کے آرٹیکل ۲۵۱ پر عمل نہ کرنے کا حق یا اجازت حاصل ہے۔ یہ انتہائی تشویشناک امر ہے"۔

۱۹۷۳ء کے آئین میں آرٹیکل ۲۵۱ پر عمل درآمد میں مسلسل ۴۲ سال تک کوتاہی بلا جواز اور مجرمانہ فعل ہے جو آرٹیکل ۵ کی بھی سنگین خلاف ورزی ہے اور آرٹیکل ۶ کے تحت وطن سے بغاوت کے سبب قابلِ مواخذہ قرار پاتی ہے حالانکہ وفاق اور صوبوں میں پہلے ہی اتنا کام کیا جا چکا تھا اور اُس میں تا حال مسلسل اضافہ ہوا ہے کہ سوائے صریح بدنیتی اردو کو ملک کی سرکاری دفتری زبان

بنانے میں کوئی امر مانع نہیں تھا۔ پنجاب میں مجلس زبانِ دفتری کا قیام سردار عبدالرب نشتر مرحوم کے حکم پر اُن کے عہد گورنری میں وجود میں آچکا تھا جو آج تک مصروف عمل ہے اور نہایت اہم پیش رفت کر چکی ہے جن میں دفتری اصطلاحات ومحاورات کی لغت کی تدوین واشاعت، اردو کی بورڈ کی تیاری۔ حکومتی اہلکاروں کی اردو مختصر نویسی میں تربیت۔ پنجاب کے تمام اضلاع میں ڈپٹی کمشنر صاحبان کی سربراہی میں نفاذ اردو کمیٹیوں کا قیام اور ایک صوبائی ماہانہ مجلّہ 'اردو نامہ' کا اجراء جو اردو زبان اور دیگر علاقائی زبانوں کے باہمی ربط اور مشترکہ لسانی ارتقا کے مسلسل جائزے کے علاوہ اردو میں دفتری مراسلت اور متعلقہ امور کا احاطہ کرتا ہے۔ اسی طرح وفاقی حکومت کا نہایت فعال ادارہ "مقتدرہ قومی زبان" نے جسے ملک کی اہم ترین علمی وادبی شخصیات کی سربراہی کا شرف حاصل رہا اور اب جسے 'ادارہ فروغ قومی زبان' کا نام دے دیا گیا ہے اردو کو سرکاری ودفتری زبان کی حیثیت سے فروغ دینے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی لیکن حکومتِ وقت نے نفاذ اردو کے قومی نصب العین کو بلا جواز معرض التوا میں رکھا۔ اس ادارہ کی سنگ میل خدمات میں "دفتری ترکیبات، محاورات اور فقرات" کی لغت مرتبہ مجیب الرحمٰن مفتی "اردو تھیسارس" مرتبہ رفیق خاور اور وفاقی حکومت کا ضابطۂ امور عملہ (ESTA CODE) کا تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل ترجمہ جو وفاقی ملازمین کی قیود وشرائط ملازمت نیز مجموعۂ قوانین اور قواعد وہدایات پر مشتمل ہے صدر نشین مقتدرہ پروفیسر فتح محمد ملک کی زیرِ نگرانی پایۂ تکمیل کو پہنچا اور جس کے دو ایڈیشن منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ ان اہم دستاویزات سے بلوچستان اور خیبر پختون خوا کی حکومتوں نے استفادہ کیا اور بطور دفتری زبان اردو کا نفاذ عمل میں آیا۔ آزاد کشمیر میں بھی سردار عبدالقیوم خاں مرحوم کے عہد حکمرانی میں اردو کو سرکاری زبان کی طور پر رائج کیا گیا۔ اس ضمن میں مقتدرہ قومی زبان اپنی نہایت جامع درج ذیل سفارشات ۱۹۸۱ء میں عدالتِ عظمیٰ میں پیش کر چکا ہے جو فیصلہ کا اہم حصہ ہیں۔

"ادارہ فروغ قومی زبان" (مقتدرہ قومی زبان) کی سفارشات:

(الف) دفتری اور کاروباری زبان کے طور پر اردو کو اپنانے کے ضمن میں سفارشات

(i) صدر پاکستان ایک آرڈیننس جاری کر کے مرحلہ وار اردو کو دفتری اور کاروباری زبان کے طور پر اپنانے کے لیے ایک حکمنامہ جاری کریں۔

(ii) اردو زبان میں رودادیں، مسودات کی تیاری اور خلاصہ نویسی کا کام کیا جائے

(iii) اردو زبان میں دفتری امور انجام دینے کا تقریباً تین چوتھائی کام ہو جائے گا۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ اردو ٹائپ مشین کی خریداری کے لیے فنڈز فراہم کرے۔

(iv) کابینہ ڈویژن کے تمام خلاصہ جات اردو زبان میں تیار کیے جائیں اور وفاقی سیکریٹریٹ میں بشمول ایوانِ صدر تمام امور اردو زبان میں انجام دیے جائیں۔

(ب) اردو کو بطور ذریعہ تعلیم اپنانے کے لیے سفارشات

(i) انٹرمیڈیٹ (ایف۔اے، ایف ایس سی، آئی کام) پیشہ وارانہ ڈپلومہ، بی اے، ایم کام، بی ایڈ اور ایل ایل بی کے لیے ذریعہ تعلیم اردو زبان میں ہو

(ii) بی ایس سی، ایم ایس سی، بی کام، ایم کام، ایم ایڈ، بی بی اے اور ایل ایل ایم کے تمام امتحانات اردو زبان میں ہوں۔

(iii) ایم۔ایس۔سی اور ایم۔بی۔اے کے امتحانات بھی اردو میں منعقد ہوں

(iv) ملک کے ہر ایک ڈویژن میں ایک ماڈل اردو سکول قائم کیا جائے۔ تدریس کی زبان کے طور پر اردو کے استعمال کو فروغ دینے کے لیے ورکشاپس منعقد کرائی جائیں۔ تمام پی۔ایچ۔ڈی کے مقالات کا اردو ترجمہ کیا جائے اور تمام نئے مقالات کا ایک خلاصہ اردو میں دینا ضروری قرار دیا جائے نیز انگریزی ذریعہ تعلیم کے سکولوں کے قیام کی حوصلہ شکنی کی جائے۔

(ج) مقابلے کے امتحانات میں اردو کو ذریعہ اظہار بنانے کے لیے سفارشات

(i) مقابلے کے امتحانات میں عملی اردو کا ایک لازمی پرچہ ہونا چاہیے جس کے کل نمبر ۵۰ ہوں

(ii) اردو ادب کا ایک اختیاری پرچہ متعارف کرایا جائے جس کے ۲۰۰ نمبر ہوں

(iii) مقابلے کے امتحانات کے لیے اردو کو فوری طور پر زبان کے طور پر اپنایا جائے اور تمام پرچہ جات اردو اور انگریزی میں دیے جائیں۔''

اس سلسلہ میں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ عدالتِ عظمیٰ نے نفاذ اردو کے عمل میں 'ادارہ فروغ قومی زبان' کو جو مرکزی کردار سونپا ہے وہ بجا مگر یہ ادارہ وفاقی حکومت کا 'ماتحتِ محض' ہے اس لیے وفاقی حکومت میں ہمہ مقتدر افسر شاہی کا خطرہ باقی رہے گا جس کے متعلق بنچ کے فاضل رکن جسٹس دوست محمد نے فرمایا تھا ''اردو کے بطور سرکاری زبان ترویج میں سب سے بڑی رکاوٹ افسر شاہی ہے۔'' اور بھی متعدد ملکی اداروں نے اہم خدمات انجام دی ہیں جن میں وفاقی اردو یونیورسٹی کی اہمیت مسلّم ہے جس نے سائنسی علوم کی تدریس کے لیے اردو کو ذریعہ بنایا اور شعبۂ تالیف و ترجمہ کے تحت گرانقدر کام انجام دیے ہیں منہاج القرآن کی ''قاموس الاصطلاحات'' نیز اردو سائنس بورڈ خصوصاً اردو لغت بورڈ کی بائیس جلدوں پر مشتمل اردو لغت ایک بے مثال اور عظیم الشان کارنامہ ہے۔

بدبختی اگر راہ میں رکاوٹ نہ ہوتی تو قیام پاکستان کے بعد ہی سے انگریزی کے متبادل کے طور پر اردو اپنی تمام لسانی وسعتوں کے ساتھ موجود رہی ہے۔ ریاست بہاولپور کے تمام شعبوں میں بشمول عدلیہ اردو سرکاری و دفتری زبان کے طور پر مروّج تھی۔ آج بھی جس کا گواہ 'محافظ خانہ' بہاولپور میں موجود ہے جہاں سرکاری دستاویزات دفتری فائلیں محفوظ ہیں۔ ریاست حیدر آباد ایک عدیم المثال حوالہ ہے جہاں ابتداء سے اعلیٰ ترین تعلیمی سطح تک مضامین کی تدریس اردو میں ہوتی تھی۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی مرحوم نے وہیں سے اردو ذریعہ تعلیم کے تحت ریاضی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی اور بحیثیت معلم بین الاقوامی شہرت رکھتے تھے وہ پاکستان کی بیشتر جامعات کے رئیس الجامعہ رہے مگر ہماری بدقسمتی کہ اردو زبان کی دنیا بھر میں اس وسیع الشروتی کے باوجود آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ عزت مآب جسٹس جواد ایس خواجہ کی سربراہی میں نفاذ اردو کے آگئی اور قومی غیرت وحمت پر مبنی عدالتِ عظمیٰ کے تازہ ترین فیصلہ پر ایوان اقتدار میں اکثر چتونوں پر بل پڑے ہوئے ہیں۔

محمد طارق غازی

(ٹورانٹو) کینیڈا

تصورملت پرایک نظر ☆

معاشرہ کے سیاسی ظہور کا نام امت ہے اور اسکا عمرانی ظہور ملت ہے۔ دونوں کا تعلق اجتماعیت سے ہے۔ علماء نے ملت کی اصطلاح کو عموماً بنیادی مرادات اسلام کے لیے استعمال کیا ہے۔ اُس کا منفی رخ خواہشات، گمراہیاں، مرضیاں، ہوائے نفس، کج رائی، بدعات، حق سے انحراف اور اتباع شہوات ہے۔ اسی لیے تہذیبی ارتقاء کے دور میں بکثرت مادی، طبیعیاتی عنصری علوم پیدا ہوتے ہیں۔ مادہ پسند اہل دانش گمان کرتے ہیں کہ تمام حسی یا ماورائے حس احوال کے اسباب وعلل کو ظن و تخمین سے سمجھا جاسکتا ہے۔ اسی گمانی دلیل سے وہ مذہبی اور روحانی امور پر بھی نظر کرتے ہیں اور کم فہمی کی وجہ سے ان کا انکار کردیتے ہیں۔ یوں شرک کا راستہ کھلتا ہے اور تمدن برباد ہوجاتا ہے۔

إِنَّهُمْ إِنْ يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوكُمْ أَوْ يُعِيدُوكُمْ فِي مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوا إِذًا أَبَدًا ○ (الکهف ١٨:٢٠)

ترجمہ: وہ کہیں تمہاری خبر پا جائیں تو یا تمہیں سنگسار کردیں یا اپنی ملت پر پھیرلیں تو پھر تم کبھی فلاح نہ پاؤ گے۔

اجتماعیت پر بڑی بحثیں پائی جاتی ہیں ابن خلدون نے اس کو عمرانیات کی بنیاد بنایا کیونکہ آسمانی اور دیگر مذہبی صحیفوں کے مقابلہ میں قرآن حکیم میں الناس، اقوام اور امم کے ذکر کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے اس سے پہلے ان اصطلاحوں میں بات نہیں کی گئی تھی ابن خلدون کے بعد مغربی اہل دانش نے بھی اسے اہمیت دینی شروع کی اور اس موضوع پر خاصی پیچیدہ سائنس وجود میں آگئی جس سے متاثر مسلمان ان یورپی اور امریکی دانشگاہوں میں اپنا تعلیمی تشخص مرتب کرتے نظر آتے ہیں۔

اسلامی علمی زاویہ نظر سے یہ حقیقت ایک مختصر جملہ میں بیان ہوجاتی ہے:

☆ تاریخ تہذیب پر زیر قلم کتاب کے مقدمہ کا ایک جزو (مصنف)

معاشرہ کے سیاسی ظہور کا نام امت ہے اور اس کے عمرانی ظہور کو ملت کہا جاتا ہے دونوں کا تعلق اجتماعیت سے ہے۔

انہی دونوں اجتماعی کیفیات میں انسان کا اسلامی تہذیبی عمل مشاہدہ میں آتا ہے۔ اگر یہ عمل روحانی اثر سے باہر ہو تو فقط اجتماعی سیاسی ظہور پر آ کر رک جاتا ہے جو اپنے مادی وجود کو تہذیب اور ترقی کے عنوان سے پیش کرتا ہے عہد رواں میں یہ مادی وجود چارلس ڈارون کے نظریہ ارتقاء سے پہچانا جاتا ہے۔ ڈارون کے نظریہ کے خلاف اگرچہ بہت بحثیں ہو چکی ہیں یہاں تک کہ اس کے کم فہم عذر خواہوں کا بڑا طبقہ پیدا ہو گیا جو کہنے لگا ہے کہ ڈارون نے انسان کی بات نہیں کی تھی بلکہ عام طور سے جان داروں کے بارے میں نظریہ پیش کیا تھا یہاں اس لا طائل بحث میں نہیں پڑنا صرف یہ واضح کرنا ہے کہ موجودہ ترقی کے عدیم المثال اور ہمیشہ ارتقا پذیر رہنے کی بس یہی ایک دلیل بنتی ہے کہ جس طرح ڈارونی نظریہ ارتقاء کے مطابق حیات ارضی ایک خلیہ والے خورد بینی آبی جاندار ایمبا (Amoeba) (جُثیو یہ) سے شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ مچھلی، مگرمچھ، ڈائنوسور، ہاتھی، گھوڑے، شیر، بندر اور انسان موجودہ شکلوں میں وجود میں آ گئے بالکل اسی طرح مادی معاشرتی ترقی بھی بتدریج ہوئی ہے اور حیاتیاتی تبدیلیوں کی طرح تہذیبی ارتقاء کا یہ عمل بھی ناتمام ہے اور ہمیشہ اسی طرح ترقی کی سمت چلنے والا ہے یعنی اب سے چند ہزار نہیں تو چند لاکھ سال بعد زمین پر زندگی کی موجودہ تمام شکلیں بہت بدل جائیں گی اس موضوع پر کئی دستاویزی فلمیں بن چکی ہیں جن میں کمپیوٹری تناظر اور تمثال کاری کے ذریعہ آج کے جنگلی جانداروں کی مفروضہ ارتقائی شکلیں پیش کی جاتی ہیں لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ایسی فلموں میں انسان کی کوئی نئی ارتقائی شکل کسی سائنسداں یا فلمساز کے ذہن میں نہیں آئی اور نہ پیش کی جاتی ہے۔

ارتقائیات سے متاثر افکار

عام آدمی کی غیر علمی سطح پر گمان یہی کیا جاتا ہے کہ اس مستقبل بعید میں انسان کی جو بھی

ارتقائی شکل بنے گی وہ آج کے ترقی یافتہ انسان سے کہیں زیادہ آگے جا چکی ہوگی مگر سائنسی لہجے میں بات کرنے والے لوگ اس ضمن میں انسان کی بات نہیں کرتے اس موضوع پر انسان کے بارے میں بڑے متضاد خیالات رائج ہیں عام طور سے مستقبل نما تحریروں، بالخصوص فلمی تمثال کاری میں انسان کی جسمانی ساخت میں ارتقاء زیر بحث نہیں آتا جس سے گمان ہوتا ہے کہ انسان اپنی موجودہ شکل میں اس انتہائی ترقی یافتہ درجہ کو پہنچ چکا ہے جس کے بعد اس میں مزید ترقی اور تبدیلی کی گنجائش نہیں رہی دستاویزی فلموں کا یہ خیال نظریہ ارتقاء کی تردید کرتا ہے۔ مادی ارتقاء کی اس کہانی کا دوسرا رخ یہ ہے کہ جس زمین پر یہ شاندار ارتقاء ہونے والا ہے انسان اس سے فرار ہونے کے منصوبے بھی بنا رہا ہے۔

سائنسی اور نیم سائنسی اداروں میں یہ خیال خاصا قوی ہے کہ خود انسان کے تہذیبی کرتوتوں یا عناصر کے بے محابا استعمال یا قدرتی آفات کے نتیجہ میں ایک دن یہ کرہ ارض انسانی قیام کے قابل نہیں رہے گا اس لیے آدمی کو باہر خلا میں اپنی وجود کی بقا کی زمینیں اور ماحول یا ڈھونڈنا چاہیے یا بنانا چاہیے دونوں صورتوں میں انسانی دماغی صلاحیت کا ارتقاء ثابت ہوتا ہے خود انسانی جسمانی ارتقاء نہیں ہر سال کھربوں ڈالر اس تحقیق پر صرف کیے جا رہے ہیں کہ کسی دوسرے خلائی کرہ میں خصوصاً نظام شمسی کے سیاروں میں سے مریخ اور زحل اور مشتری وغیرہ کے زمین جیسے حجم اور امکانی روئیدگی والے کسی چاند پر ہی آکسیجن اور پانی مل جائے تا کہ وہاں زمین سے فرار ہونے والے اعلیٰ طبقہ کے منتخب چودھریوں کے زندہ رہنے کا کچھ امکان بنے اور مثلاً کسی بڑے حادثہ یعنی قیامت وغیرہ کے وقت اعلیٰ ذات اور اعلیٰ طبقہ کے چند منتخب لوگوں کو زمین سے بھاگنا پڑے تو زمین کے باہر پیر ٹکانے کی جگہ موجود ہو اور اس آفت زدہ کرہ ارضی سے نکل کر کسی نئے سیارہ پر وہ ہوا اور پانی کے بغیر مر نہ جائیں مغرب میں اس مفروضہ پر بے شمار ناول اور فلمیں اور علمی تحقیقی مقالے وجود میں آ چکے ہیں ان خیالات میں قدیم معدوم قوموں کے تہذیبی تصورات کی گونج سنی جا سکتی ہے۔

اس پریشانی میں عموماً ماہرین طبعیات، یونیورسٹی پروفیسر، سائنسی (Sci.fiction) داستان گو مبتلا ہیں برطانوی طبیعیاتی ڈاکٹر بیسل سنگر (Basil Singer) سیارہ زہرہ پر نوآبادیاں قائم کرنے کے فکر میں ہے اگرچہ اس سیارہ پر سورج کے قرب کی وجہ سے ''دوزخی'' گرمی ہوتی ہے ڈاکٹر سنگر کا خیال ہے کہ وہاں بادلوں میں تیرتی ہوئی انسانی پناہ گاہیں بنائی جا سکتی ہیں اس کا دعویٰ ہے کہ مستقبل بعید میں انسان اپنے موجودہ مسکن کو ترک کر کے کہیں اور لینے پر مجبور ہوگا ورنہ اس کا مکمل خاتمہ ہو جائے گا جاپان نژاد امریکی طبعیاتی پروفیسر میچیو کاکو (و:۱۹۴۷ـMichio Kaku) جس نے ہارورڈ اور برکلے کی کیلیفورنیا یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی ہے خلاء میں ایک ایسا نیا نظام شمسی تخلیق کرنے کا تصور رکھتا ہے جو ہر طرح انسانی ضروریات کے عین مطابق ہو امریکہ کے کارنیگی انسٹی ٹیوشن کے سابق اہلکار آر۔پال بٹلر (۱۹۶۰ءـR. Paul Butler) کی رائے میں ذب اکبر کا ستارہ نمبر ۴۷، جو نظام شمسی کا قریب ترین ستارہ ہے وہ مناسب جگہ ہے جس کے گرد ڈاکٹر میچیو کاکو کا انسان ساختہ نظام شمسی تعمیر کیا جا سکتا ہے امریکی سائنسی اساطیری فلمساز جیرارڈ اونیل (۱۹۲۷ـ۱۹۸۲ءـGerard O Neill) نے ارتھ۔۲ (Earth.2) نامی فلم بنائی تھی جس میں ایک مصنوعی دنیا سورج کے گرد چکر لگاتی ہے۔ یہ فلم ۲۸ نومبر ۱۹۷۱ء کو امریکی ٹیلیوژن پر دکھائی گئی تھی اونیل نے ۱۹۷۸ء میں لبرا (سنبلہ۔Libra) نام کی ایک اور فلم بنائی تھی جس میں دکھایا تھا کہ ۲۰۰۳ء میں سارے کرۂ ارض کی ایک ہی جابر استبدادی حکومت ہوگی جو باریک بین کمپیوٹروں کی مدد سے تمام دنیا کی نگرانی کرے گی، آزاد تجارت کو ختم کر دے گی اور اس کے مقابل خلائے بسیط میں کسی جگہ ایک حکومت ہوگی جو ان آزادیوں کو روا رکھے گی جن پر امریکی اور یورپی اقوام جان دیتی ہیں۔

یورپ کی تہذیبی پریشانیاں

ان آزادیوں اور ان پر مبنی تہذیب کے انجام کی طرف سے بیسویں صدی کے کئی یورپی دانشور متفکر تھے برطانوی قصہ نویس الڈس ہکسلے (۱۸۹۴ـ۱۹۶۳ءـAldous Huxley)

کا مستقبل نما ناول دی بریو نیو ورلڈ (The Brave New World_۱۹۳۲) ۲۵۴۰ء کی مفروضہ زندگی کا احاطہ کرتا ہے وہ بھی مارکسی نظریات کے تابع مستقبل کی ایک جابر عالمی حکومت سے خوف زدہ تھا جو انسانوں کو غلام بنائے ہوگی برطانوی کہانی کار جارج اور ویل (۱۹۰۳-۱۹۵۰ء_Orwell George) کی داستانیں اینمل فارم (Animal Farm_۱۹۴۵) اور انیس سو چوراسی (Nineteen Eighty Four_۱۹۸۴) ایک ایسے عہد کی نشان دہی کرتی ہیں جب انسان سے وہ تمام آزادیاں چھین لی جائیں گی جو فلاحی ریاست کے عنوان سے اہل یورپ نے صدیوں کی جاں گسل جدوجہد کے بعد حاصل کی ہیں یہ داستانیں دراصل یورپ کے اس داخلی سیاسی کرب واضطراب کی مظاہر ہیں جو انسانی تاریخ کی دو نہایت ہیبت ناک جنگوں میں کروڑوں انسانوں کو انسانی وحشت کی بھینٹ چڑھا نے کے بعد پیدا ہوا تھا اور جو دعوے کی حد تک تہذیب کی دہائی دیتے ہوئے لڑی گئی تھیں ان خوفزدہ قلم کاروں نے اپنے تہذیبی اضطراب کو اپنے زمانہ کے طاقت ور سوویت یونین کے پس منظر میں پیش کیا تھا حالانکہ اصل میں وہ خود اپنے مروجہ مغربی معاشرہ اور اس کے سیاسی تماشے سے پریشان تھے مگر چونکہ برملا اس کا اظہار نہیں کر سکتے تھے اس لیے اپنی پریشانی پر سوویت انتہا پسندی کا غلاف چڑھا کر خود کو محفوظ سمجھانا چاہتے تھے وہ اس حقیقت کو کھل کر تسلیم نہیں کر سکتے تھے کہ مارکسی فلسفہ بجائے خود مغرب کے سرمایہ دارانہ فلسفہ کی کوکھ سے پیدا ہوا تھا اور موجودہ مغربی تہذیب کا ارتقائی تسلسل تھا افغانستان پر جارحیت کی نتیجہ میں سوویت یونین کے انہدام کے بعد مغربی قلم کاروں کی یہ تخلیقات نہ صرف ایک مختلف پس منظر میں زیادہ قابل فہم ہوگئی ہیں بلکہ اس پس منظر کی تشکیل نو کا سبب بھی واضح کرتی ہیں اس تہذیبی فلسفہ کا لب لباب یہ ہے کہ عہد رواں کا تمدن کسی بڑے دشمن کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا یہ صورت ذہنی اضطراب اور اعتماد کی کمی ثابت کرتی ہے۔

اس دنیا سے فرار کے موضوع پر امریکی فلسفاز جیرارڈ اونیل نے ایک کتاب بھی لکھی ہے دی ہائی فرنٹیر: ہیومن کولونیز ان سپیس = بعید سرحد خلاء میں انسانی نو آبادیاں (High Frontier

(Human Colonies In Space) روسی نژاد امریکی سائنسداں آئزک ایسیموف (Isaac Asimov ـ ۱۹۲۰ـ۱۹۹۲ء) نے خلائی نوآبادیوں پر کئی کتابیں لکھی ہیں جن میں مشہور فاؤنڈیشن سلسلہ (Foundation Series) ہے پانچ جلدوں میں ایسیموف کا یہ ناول پکسلے کی حدِ قلم سے کہیں زیادہ لمبی چھلانگ ثابت ہوا یعنی یہ داستان اب سے ۲۵،۰۰۰ ہزار سال بعد کی تاریخ کا بیان ہے جب کرۂ ارض کے ناقابلِ آبادی بن جانے کے بعد انسان یہاں سے فرار ہو کر ہماری کہکشاں پر محیط ایک کہکشانی حکومت قائم کر چکا ہے اور ساری کہکشاں میں صدیوں کا سفر گھنٹوں میں طے کرنے پر قادر ہو چکا ہے۔ ایسی سب کتابیں ، داستانیں ، فلمیں اور ناسا (NASA-National Aeronautics and Space Administration) جیسے سرکاری اداروں کی خلائی تحقیقات کا مقصود یہی ہے کہ ایک وقت آئے گا جب زمین پر نوعِ انسانی کا خاتمہ ہو جائے گا، یا اس پر انسانی وجود کا امکان باقی نہیں رہے گا تو وہ وقت آنے سے پہلے انسان کو یہاں سے فرار ہونے کا انتظام کر رکھنا چاہیے۔

یہاں اس نظریہ سے بھی کوئی بحث نہیں سوائے اس کے کہ یہ باتیں بجائے خود ارتقاء کے نظریہ کو سائنسی طور پر غلط ثابت کرتی ہیں۔ یہ ساری سائنسی، تحقیقی اور اختراعی جدوجہد تصدیق کرتی ہے کہ اس زمین پر طوفانِ نوح قسم کی کوئی بڑی آفت آنے والی ہے جس میں سب کچھ ملیامیٹ ہو جائے گا ورنہ زمین پر ہونے والی حیاتیاتی تبدیلیوں کے ساتھ انسان کا یہاں زندہ اور باقی رہنا اتنا ہی ممکن اور آسان ہونا چاہیے جتنا ہاتھی یا چھچھوندر یا مچھر کی ارتقائی شکل کا۔ تاہم تہذیبِ رواں کے سائنسداں اس مخمصہ سے صرفِ نظر نہیں کر سکے وہ کھل کر انسان کے روحانی وجود کی ابدیت کو تسلیم نہیں کرتے اس لیے ایک نیا متوازی نظریہ انسانی وجود کی نفی اور نظریہ ارتقاء کے خاتمہ کا پیش کرتے ہیں اس کا لبِ لباب یہ نظریہ بنتا ہے کہ موجودہ انسان ۲۰ کروڑ سال بعد پیش آنے والی ان مفروضہ ارتقائی تبدیلیوں کو برداشت کرنے کی صلاحیت سے عاری ہو جائے گا حالانکہ اسی تدریجی ارتقائی نظام میں پھوا فیل پیکر بن جائے گا اور نئے ڈائناسورس پیدا ہوں گے۔ یہ متضاد نظریات

پیش کرنے والے سائنسداں جانتے ہیں کہ ۲۰ کروڑ یا ۲۰ لاکھ سال بعد اگر یہ نظریات غلط ثابت ہوئے تو کوئی انہیں پکڑنے والا نہیں ہوگا، کیونکہ دی فیوچر از وائلڈ (The Future is Wild)۔ مستقبل وحشی ہے) قسم کے فلمی ٹکڑوں میں انسان کو تو دکھایا ہی نہیں جاتا اور دلچسپ بات یہ کہ درختوں اور ان کے پتوں کی شکل وصورت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی اور حیاتیاتی نظام ارضی کا اہم جزو ہونے کے باوجود ان کے اندر ارتقاء کا عنصر اس طرح نمایاں نہیں ہے جیسے حشرات الارض اور رینگنے والے جانوروں اور کچھ چوپایوں میں دکھایا جاتا ہے۔

نظریہ ارتقا کے توہمات

یہ سارے توہمات اسی نظریہ ارتقاء نے پیدا کئے ہیں۔

ڈارون کے نزدیک مذہب روحانی حقیقت کے بجائے توہمات اور شبہات کا نام ہے (ڈیسنٹ آف مین ۶۶ Descent of Man) جن کے آثار اسے یا تو اپنے مالک سے کتے کی فرماں برداری میں دکھائی دیتے ہیں یا تاریکی میں ہوا کے اچانک جھونکے سے انسان یا جانور کے خوفزدہ ہو جانے میں محسوس ہوتے ہیں دوسری جانب اس نے بھی وہی عام غلطی دہرائی جو مغربی دانشوری کی پہچان بن چکی ہے کہ بالاتر ذہنی استعداد کی وجہ سے انسان نے پہلے نادیدہ ''روحی'' (Spiritual) مظاہر پر اعتقاد قائم کیا پھر جادو اور توہمات کی راہ سے نادیدہ کو اصنام کی شکل میں دیدنی بنایا اور انہی دیدنی اصنام کی نادیدہ قوتوں اور شرک کی راہ سے گزر کر توحید تک پہنچا تھا تو آج دنیا میں ایک بھی مشرک باقی نہیں رہنا چاہیے تھا، جب کہ دوسری طرف آج ۲۰۱۵ء میں بھی دنیا کی دو تہائی آبادی مشرک ہے اور کسی ارتقائی نظام کے ماتحت توحید تک پہنچنے میں نہ صرف ناکام ہے بلکہ شدت سے توحید کے خلاف ہے خود مسیحیت کی تاریخ اس خیال کی تردید کرتی ہے سینٹ پال نے پہلی صدی عیسوی میں تثلیث کی راہ سے عیسائی عقیدہ میں شرک کی آمیزش کر دی تھی لیکن ڈارون کے خیال کے مطابق اٹھارہ صدیوں میں یورپ اور باقی مغرب ارتقائی نظریہ کے برخلاف

نہ تو خود توحید کی طرف آسکا نہ معاشرہ میں یہودیوں کی موجودگی اسے اس طرف متوجہ کر سکی اور نہ مسلمانوں سے صدیوں کا تال میل انہیں اس راہ پر لا سکا اسلئے خود ڈارون اور جان لیوک (John Lubbock،۱۹۱۳۔۱۸۳۴) جیسے سائنسداں تثلیث سے الحاد کی طرف چلے گئے حالانکہ ڈارونی فلسفہ کی رو سے ان کو توحید کی سمت آنا چاہیے تھا۔ یہ خام خیالی اور غیر سائنسی سوچ ہے اسلامی تہذیبی روایت میں یہ الٹی طرف سے الف الیلہ پڑھنا ہے۔

مذہب پر بے اعتقادی کے باوجود ڈارون دیگر مغربی دانشوروں کی مانند اس جال سے باہر نہ آسکا تاہم اس نے معاشرتی اخلاقی پہلو کو بالکل مسترد نہیں کیا تھا اگرچہ ڈارون کے شارح اور وکیل جیمس مارک بالڈون (James Mark Baldwin،۱۹۳۴۔۱۸۶۱) نے اس پہلو کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے البتہ ڈارونی اخلاقیات بجائے خود کوئی روحانی عمل یا انسان کی جبلی خوبی نہیں بلکہ عمرانیات سے ماخوذ ثقافات ہیں یہ خیال بھی ریت کا گھروندہ ہے واقعہ یہ ہے کہ معاشرہ انسان سے بنتا ہے خود معاشرہ انسان ساز ادارہ نہیں ہے جبکہ ڈارون کا خیال ہے کہ معاشرہ افراد کو پیدا کرتا ہے اور پھر فرد کو فرائض پر مطلع کرتا ہے (بالڈون ڈارون اینڈ ہیومنٹیز ۹۶) پھر بھی عقیدتاً ڈارون بہر حال ایک عیسائی تھا اور اعتقادی انحراف کے باوجود اپنے مذہب کے عمرانی تضاد سے ہرگز باہر نہیں تھا وہ کہتا ہے کہ انسان کا قربانی کا ایک عمل اپنے قبیلہ کے لیے بھلائی اور نیکی کی ایک ایسی مثال قائم کرتا ہے جو اس کے لیے فقط بچے پیدا کرنے سے بہتر ہے (ڈیسنٹ آف مین ۱۲۹/ بالڈون ڈارون اینڈ ہیومنٹیز ۵۲ حاشیہ) اپنے افکار میں اس تضاد کے باوصف وہ بائبل کی تضاد بیانی سے صرف نظر نہیں کر سکا۔ چنانچہ اس کا ارتقائی فلسفہ بڑی حد تک بائبل کے الحاقی بیانات کا نتیجہ ہے جو تاریخ و توقیت کے معاملہ میں مسیحی اعتقادات کی تردید میں مرتب کرنا پڑا تھا مگر ڈارون اور اس کے وکلاء یہ جاننے سے قاصر رہے کہ خود ان کا فکری تضاد بھی اسی بائبلی اعتقادی تضاد کا شاخسانہ ہے جسے انسیات (Anthropology) کے نظریات کی اساس پر شرک کے تاریخی مطالعہ میں محدود کر دیا گیا اور اسی کو دین کی تاریخ باور کر لیا گیا، اگرچہ ان مشرکانہ اعتقادات کو بالڈن خود بار بار

خامکارانہ (Crude) قرار دیتا ہے مگر اس کی متبادل حیثیت پر نظر نہیں کرتا۔

شرک کا جدید ارتقائی رخ

ظاہر بیں انسان خواہ وہ یونیورسٹیوں میں پڑھتے اور پڑھاتے ہوں یا برگر کے کباب بھونتے اور بیچتے ہوں نظریہ ارتقاء سے زیادہ مظاہر ارتقاء پر نظریں جمائے ہوئے ہیں ان مظاہر ارتقاء نے ایک جدید مادی مذہب پیدا کیا ہے جس میں ہر دوسرے روز ایک نیا دیوتا تخلیق ہوتا ہے جو عام انسان سے نگوں ساری کا مطالبہ کرتا ہے یہ دیوتا پیدا کرنے والے لوگ اساطیری قصوں کے کاہنوں اور حکمراں ہامانوں اور فرعونوں سے مختلف نہیں ہوتے ان کرداروں کا تفصیلی ذکر تو آگے تہذیبوں کی تاریخ میں آئے گا سردست ان دیوتاؤں اور اس عہد کی بے مثال تاریخی ترقی کے دعوے داروں کے مادّی اور ظاہری دلائل کا جائزہ لینا ہے۔

ماضی سے قطع نظر حقیقت یہ ہے موجودہ دور میں مادی ترقی کا ایک بہت اونچا معیار ضرور قائم ہوا ہے ان میں اظہار اور اصرار ان اشیاء پر ہے جن کو رفاہی تسلیم کیا جاتا ہے اور جن سے اربوں انسان روزانہ فائدہ اٹھاتے ہیں یا ان کے ذریعہ لطف و حظ حاصل کرتے ہیں یا ان کی وجہ سے آسائش زندگانی کی ارزانی ہوتی ہے ان مظاہر کے یا ادوات و آلات ترقی کے تخریبی رخ یا تباہ کن عنصر پر پردہ پڑا رہتا ہے۔ یہ پہلو عام طور سے دبا رہتا ہے اس پر سنجیدگی سے عام علمی بحث و گفتگو نہیں ہوتی جو کچھ بات اس ضمن میں ہوتی ہے اسے معلوماتی سطح پر نا قابل قبول قرار دے کر ابلاغیہ میں مسترد کر دیا جاتا ہے اس لیے تاریخی دلائل مرتب ہونے سے پہلے اس پر گفتگو نہیں ہوتی جو کچھ بات اس ضمن ہوتی ہے اسے معلوماتی سطح پر نا قابل قبول قرار دے کر ابلاغیہ میں مسترد کر دیا جاتا ہے اس لیے تاریخی دلائل مرتب ہونے سے پہلے اس پر گفتگو نتیجہ خیز نہیں ہوگی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہر تہذیب میں ترقی کے منفی پہلوؤں کو پوشیدہ رکھنے کی روایت پائی جاتی ہے۔ چونکہ پروہتوں، سیاست کار چودھریوں اور ان کے کارندے سائنسدانوں کی کوششوں کے نتیجہ میں اختراعات کے تخریبی پہلو عام نظروں سے چھپے رہتے ہیں اور اسباب روایت اور ابلاغیہ میں

فی الجملہ ان خرابیوں کا تذکرہ ناپسندیدہ ہوتا ہے اس لیے تہذیب جب ختم ہوتی ہے تو اس کے باقی آثار میں مستقبل کے مورخ کو اصل اسباب تباہی کا کوئی حسی سراغ نہیں ملتا اور تاریخ غلط اندازوں پر لکھ دی جاتی ہے جس سے بعد کے معاشروں کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا چنانچہ معاشرتی تاریخ کے درست بیان کے لیے کسی بے لاگ وضاحت کا اعتبار رکھنے والے ذریعہ معلومات کی ضرورت پڑتی ہے انسانی سطح پر ایسا ذریعہ میسر آنا بڑا دشوار ہے لامحالہ نظر آسمانی کتب کی طرف جاتی مگر خود ان میں اکثر صحیفوں میں ایک سے دوسری زبان میں ترجمہ کی وجہ سے یا بعد کے لوگوں کے اضافوں کے سبب سے ان کا پایہ اعتبار کمزور ہو جاتا ہے۔ مسئلہ ارتقاء پر ان سماوی کتب نیز دھرم شاستروں اور گرنتھوں میں لوازمہ نہیں ہے اس لیے اس راہ سے اس پر بلا واسطہ تبصرہ نہیں کیا جا سکتا مزید یہ کہ عہد رواں کی ترقی سے پہلے آسمانی کتابوں کا سلسلہ موقوف ہو چکا ہے اس لیے مروجہ مذہبی صحائف اور شاستروں میں متبادل رائے نہیں مل سکتی کیونکہ خواہ وہ معلوم اور مشہور آسمانی صحائف ہوں یا دیگر مذاہب کے مقدس گرنتھ، گاتھا اور شاستر ہوں کوئی بھی نظریہ ارتقاء جیسے تصور کی تائید نہیں کرتا رگ وید اور دیگر سناتنی پرانوں اور براہمانوں میں مختلف قسم کے بیانات درج ہیں جو اس تحقیق میں کچھ زیادہ معاون ثابت نہیں ہوتے۔

جدید تہذیبی ترقی کے مظاہر

چنانچہ سردست ارتقاء کا وہی پہلو موضوع گفتگو ہے جو سائنسدانوں اور عام انسانوں کے لیے دلائل کی صورت اختیار کرتا ہے۔

ترقی کے مظاہر بہت ہیں اور ان کی نام شماری بجائے خود ارتقائی مراحل کی دلیل سمجھی جاتی ہے۔ اٹھارویں صدی کے صنعتی انقلاب کے بعد سے جو مادی ارتقاء ہوا ہے وہ انسانی یادداشت کی حد تک بے مثال ہے اس میں بھی بیسویں صدی کے دوران ہونے والی مادی ترقی کے بارے میں ایک کتاب کا نقطۂ آغاز ہی یہ جملہ تھا کہ انسان نے گزشتہ پچاس برس میں جتنی ترقی کی ہے اتنی گزشتہ پانچ سو برس میں ملا کر بھی نہیں کی تھی۔ یہ دعویٰ کچھ غلط نہیں ہے ترقی کا معیار بڑا اساطیری

ہے انسان کو تیز رفتار سفر کی سہولتیں حاصل ہوئیں خاندان بھر کے سیکڑوں میل طویل آسودہ سفر کے لیے موٹر کاریں سامان ڈھونے کے لئے لاریاں اور ۵۳ فٹ لمبائی او ساڑھے آٹھ فٹ چوڑائی اور اونچائی کے ٹرک جو ایک وقت میں ۲۴۰۰۰ کیلوگرام وزن اٹھا کر ۱۲۰ کیلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے زمین کے سینے پر دوڑتے ہیں بیس اور تیس ڈبوں والی مسافر ٹرینیں وہ چار سو ڈبوں والی مال گاڑیاں سمندروں کی طوفانی موجوں کو چیرتے دیوہیکل سے بھی بڑے ٹینکر اور تفریحی بحری جہاز ایک وقت میں چار چھ سو افراد کو اٹھا کر اڑنے والے ہوائی سفر کے لیے مہیب طیارے جو کہیں رکے بغیر تقریبا ۴۰۰۰۰ فیٹ کی بلندی پر ہزاروں میل کا سفر دس پندرہ گھنٹے میں طے کر ڈالتے ہیں معالجاتی امداد مہیا کرنے والی اکثر ہیبت ناک مشینیں یا جسم کے اندر کی خبر لانے والے آلات ایکس رے کیٹ سکین وغیرہ اور ذروں کے مانند ننھے کیمرے جو انسانی بدن کے اندر شریانوں، عروق، نیز دماغ، دل، گردہ، جگر اور اعضائے تناسل کی کیفیات اور عوارض کا آنکھوں دیکھا حال ڈاکٹروں کے سامنے اور کبھی کبھی عام تماش بینوں کی تفریح کے لیئے پیش کرتے ہیں اور ایسی ادویات جو امراض اور وباؤں کی روک تھام کے ذریعہ عمر میں اضافہ کا باعث بنتی ہیں یہ نہیں کہ انسان کی عمر اب دو تین سو سال کی ہونے لگی ہے البتہ پچاس ساٹھ ستر سال کی عمر میں جسمانی طور پر اب وہ خود کو اتنا کمزور محسوس نہیں کرتا جتنا کبھی پہلے کرتا تھا، اور تین سال کی عمر میں دوڑ نگیاں لگاتا پھرتا ہے جب کہ ابھی سو سال پہلے تک اس عمر میں قدم اٹھانا بھی نہیں سیکھتا تھا (شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی۔ آپ بیتی ۱:۲۷)

آلات تفریح و معلومات

ان ترقیات میں سے کچھ آلات تفریح مہیا کرتے ہیں اس کا آغاز تصویر اتارنے والے کیمرہ سے ہوا پھر متحرک تصویروں سے فلمیں بننے لگیں جس کو لاکھوں لوگوں نے بڑی تفریح کا ذریعہ سمجھا یہ کوئی نئی تفریح نہیں تھی اگلے زمانہ میں داستان گو اور قصہ گو اور سوانگ بھرنے والے طائفے ہوتے تھے جو آواز کے اتار چڑھاؤ کی مدد سے کہانیاں سنا کر کچھ تھوڑی بہت اداکاری کر کے لوگوں کو گھنٹوں محویت کے عالم میں اپنا پابند رکھتے اور تفریح مہیا کرتے تھے فلمیں اسی زمرہ کی

ایک نئی شکل تھیں ہوا میں موجود آواز کو فضا کی برقی رو سے گرفتار کر کے ریڈیو اور آڈیو کے ذریعہ اور پھر فضا میں موجود مادی پیکروں کے غیر مرئی ہیولوں کو مرئی بنا کر ویڈیو اور ٹیلیوژن کے ذریعہ گھروں کے اندر ۲۴ گھنٹے کی ہر لحہ من پسند تفریح مہیا کرنے کے وسائل کی ارزانی ہوئی جن سے اب خبر رسانی کا کام بھی ذیلی طور پر لیا جاتا ہے اگر چہ یہ خبر رسانی تمام سننے والوں کے لیے بے فیض ہے اور تمام عالمی معاشروں میں ذہنی انتشار تشنج، حزن و غم، نفسیاتی فتور پیدا کرنے کا ایک بڑا سبب ہے۔

طباعت کے نظام میں محیر العقل انقلاب آیا سامی زبانوں میں عربی اور اس کے حروف تہجی سے متاثر فارسی اور اردو اور قدیم عثمانی ترکی کے برخلاف یورپی زبانوں میں دستی تحریر میں تو حروف باہم ملے ہو سکتے ہیں مگر طباعت کی سہولت کی خاطر ہر لفظ کے تمام حروف الگ الگ لکھنے اور دو لفظوں کے درمیان خلا دے کر انہیں باہم ودگر متمیز کرنے کا رواج ڈالا گیا اس کے ساتھ سیسہ کے حروف گھڑ کر انہیں باہم متصل رکھنے سے الفاظ بنانے کا تصور پیدا ہوا اور ان زبانوں میں متحرک ٹائپ آسان ہو گئی ٹائپ کے ساتھ ان زبانوں میں طباعت کا تصور پیدا ہونا فطری بات تھی یہ طباعتی ارتقاء اصل میں چین اور کوریا کی ایجادی صلاحیت کا نتیجہ تھا یورپ میں یہ خیال چینی اور کوریائی متحرک ٹائپ دیکھنے کے صدیوں بعد پیدا ہوا تھا چین میں گیارھویں صدی عیسوی میں متحرک ٹائپ سے طباعت کا آغاز ہو گیا تھا کوریا میں پندرھویں صدی میں دھات کے متحرک حروف سے لفظ مرتب کر کے چھاپے کا کام شروع ہوا تھا یورپ میں طباعت کا یہ کام جرمنی کے سونے کے زیورات گھڑنے والے یوحناس گوٹنبرگ ۱۳۶۸۔۱۳۹۸ء (Johannes Gutenberg نے ۱۴۵۰ء میں پہلی بار دھات کے متحرک حروف گھڑ کر اور انہیں ایک ایک کر کے ملا کر عبارت سازی اور پھر اس کے فرموں سے چھپائی شروع کی اس نے پہلی کتاب بائبل چھاپی تھی جس کے ۴۸ نسخے ابھی دنیا میں موجود بتائے جاتے ہیں۔ یہ چھپائی دستی پریس پر مسطح فرمہ جما کر کی جاتی تھی جو بہر حال ایک میکانیکی نظام تھا طباعت کا موجودہ نظام چھ سو برس میں موجودہ مقام پر پہنچا ہے یعنی یہ ترقی چند دنوں میں نہیں ہو گئی تھی ہاں یہ ضرور ہے کہ آج پہیوں پر جمائی ہوئی

جست کی دھاتی تختیوں سے کمپیوٹری روٹری پریس پر ایک گھنٹہ میں ایک لاکھ تک نسخے چھاپے جاسکتے ہیں اور بیک وقت کئی رنگوں میں چھپائی ممکن ہے اور کاغذ ہی نہیں کپڑے، پلاسٹک، چمڑے اور دھاتوں، نیز دھاتی شیشہ یا پلاسٹک کی بوتلوں وغیرہ مختلف چیزوں پر بھی چھپائی کی جاتی ہے۔

بے فیض معلومات کا ہیجان

کیمرے، فلم، صدابندی، متحرک تصاویر کے امتزاج سے ایک نیا انقلاب آیا جسے ابتدا میں انفرمیشن ٹیکنولوجی رِوولیوشن Information Technology Revolution یا صرف IT Revolution معلوماتی تکنیکیاتی انقلاب۔ کا نام دیا گیا اور کہا گیا کہ صنعتی انقلاب کے بعد یہ دوسرا سب سے بڑا انقلاب ہے یہ کمپیوٹر یا مصنوعی شعور (Artificial Intelligence) کا انقلاب ہے سیلیکون نامی ایک دھات کی ذرا سی چپ کے اوپر ہزاروں صفحات میں آنے والی معلومات جمع کر دی جاتی ہیں اور ان معلومات کو اس کے پڑھنے والے خاص کمپیوٹروں پر پڑھا جا سکتا ہے ان میں حسب منشاء کمی بیشی اور ترمیم و تنسیخ ہو سکتی ہے۔

کمپیوٹر نے ڈاک کے نظام کو تہہ و بالا کر دیا تار برقی کا انقلابی سلسلہ معدوم ہو چکا ہے ای۔ میل کے ذریعہ چند ثانیوں میں دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک اطلاع پہنچ جاتی ہے اس کی وجہ سے خطوط نویسی اب غیر ترقی یافتہ دور کی بات بن چکی ہے آج کی نسلوں کے دل میں غالب اور کیٹس کی خطوط نویسی کی بس اتنی ہی عزت رہ گئی جتنی سو سال پہلے سائیکل پر سفر کرنیوالے کی نظر میں بیل گاڑی کی ہوتی تھی ای۔ میل کی زبان مخففات پر مبنی ہے اور سو سال نہیں گزریں گے اگر یہ تبدیلی اس طرح برقرار رہی تو شیکسپیئر اور برنارڈ شا کے ڈرامے، ڈیم ہیزلٹ چیسٹرٹن، برٹرنڈ رسل، نُعام چومسکی، ورجینیا وولف، دل دیوراں اور سارترے کے مقالے، جین آسٹن، کنگسلے ایمس، باربرا کارٹلینڈ، ڈینیل ڈیفو اور تھومس ہارڈی کی داستانیں کارل سیگن اور آئزک ایسموف کے سائنسی حکایاتی نظریات، نیوٹن، ایڈیسن اور آئنسٹائن کے طبیعیاتی فارمولے پڑھنے اور سمجھنے والے اسی طرح ناپید ہو جائیں گے جیسے چار ہزار سال پرانی سمیری اکادی کہانی جلجامش کے

پڑھنے اور سمجھنے والے کچھ مدت پہلے ناپید تھے صرف اس لیے کہ آج جو نئی کمپیوٹری زبان بن رہی ہے اور اس میں جو نئے الفاظ تخلیق کئے جا رہے ہیں ان کا مقصد ادب عالیہ یا علوم عالیہ قسم کی تخلیقات نہیں تفریحی زبان میں ہنگامی پیغام رسانی ہے۔ یہ بچگانہ زبان عام طور سے سکول کالج کے بچے بچیاں بنا رہے ہیں اور استعمال کر رہے ہیں اور یہ عموماً والدین اور دوسرے بڑوں سے رازداری کی خاطر استعمال کی جاتی ہے۔ ای میل میں صرف الفاظ منتقل نہیں ہوتے، بلکہ قلمی دستاویزیں تصویریں فلمیں سب کچھ بھیجی جا سکتی ہیں اور یہی نہیں اس کے تحت ایک نظام کے ماتحت کریڈٹ کارڈ کے ذریعہ نقد رقمیں بھی منتقل کی جا سکتی ہیں اگرچہ نقدی کی مادی حیثیت معدوم ہو چکی ہے اور رقوم اور نقدی فقط ہندسوں کا نام رہ گیا ہے دھاتی سکوں یا کاغذی نوٹوں یا مادی حسی رقوم کا نہیں مستقبل کا حیاتی مورخ آج کے اقتصادی نظام کو کیسے سمجھے گا اور کیا بتائے گا یہ ایک مستقل سوال ہے۔

ذیلی طور پر عہد جدید کے کھلنڈرے لڑکے لڑکیاں مستقبل کی تہذیب کے لیے آئندہ سو سال میں عام ہو جانے والی جو زبان بنا رہے ہیں اس کا موازنہ اس زبان سازی سے کیا جائے گا جو عہد جاہلیت کے عرب شعراء نے سو سال میں بنائی تھی مگر عرب کی اس زبان کے مقابلہ میں اس نئی لسانی کیفیت کو ترقی ہی باور کروایا جائے گا۔

کمپیوٹر میں معنوی خلاء بسیط

نئے ارتقاء کے تحت کمپیوٹر کے نظام میں اس قدر بڑا خلائے بسیط دیکھا گیا ہے کہ اس کے اندر ساری دنیا کے موجودہ علوم کا ذخیرہ ہو سکتا ہے اور بہت کچھ کیا جا چکا ہے اس خلاء میں اربوں صفحات کی کتابوں، مقالوں، دستاویزوں کا ذخیرہ موجود ہے جسے وہاں بھی پڑھا جا سکتا ہے اس میں سے کئی کئی جلدوں پر مشتمل کتابوں کو اپنے کمپیوٹر پر بھی اتارا جا سکتا ہے اور جی چاہے تو چھاپ کر ان کی کاغذی نقل بھی بنائی جا سکتی ہے گوگل پر اربوں کھربوں کی تعداد میں اچھی اور بری تصویریں اور صدا بے صدا فلمیں ان کی تحریری تشریحیں بھی پائی جاتی ہیں ان ذخیروں سے علمی استفادہ بھی ممکن ہے اور تفریح

وقت گزاری بھی ہو سکتی ہے اور نہایت مہذب تضیع اوقات کا انتظام بھی پایا جاتا ہے۔

فن تعمیر میں بھی ایک انقلاب آیا ہے اگر چہ وہی ایک میدان ہے جہاں قدیم آثار ابھی نئی ترقی کا منہ چڑاتے دیکھے جاسکتے ہیں تہذیبوں کے بیان میں اس پر بھی بات آگے آئے گی البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ جدید فن تعمیر سطح ارض پر پھیلنے کے بجائے فضا میں بلند ہونے سے عبارت بھی ہے اور عمارت بھی فلک بوس عمارتوں کو اب فٹوں اور میٹروں کے بجائے میلوں میں ناپنے کا رجحان پیدا ہو چکا ہے سعودی مملکت میں ایک میل بلند عمارت مائل ٹاور Mile Tower برج میل۔ کا برہنہ پا برہنہ بدن چرواہوں کا خواب حقیقت بننے والا ہے دبئی کا برج خلیفہ زمین کے سینہ پر کھڑی تمام بلند سے بلند عمارتوں کو حقارت کی اسی نظر سے دیکھ رہا ہے جس سے قوم نوح کے دولتمند چودھری معاشرہ کے غرباء۔ اَلْاَرْذَلُوْن۔ کو دیکھا کرتے تھے۔ یہ تو انتہائیں ہیں لیکن نیو یارک، شکاگو، ڈیلس، بوسٹن، ٹورانٹو، ٹوکیو، شنگھائی، کوالالمپور، دہلی، بمبئی، حیدرآباد، کراچی، لاہور، ماسکو، کونسا شہر ہے جہاں سو پچاس منزلہ عمارتیں موجود نہیں یا نہیں بن رہی ہیں اور اپنے دامن میں زمین پر ویرانی کا گمبھیر احساس پیدا کر رہی ہیں۔

یہ سب نئی تہذیب کی دین ہے جو اپنے مزاج، اپنی اساس اور اپنی نہاد میں خالص مغربی ہے باقی دنیا میں لوگ جو اسے استعمال کر رہے ہیں ان کی ذاتی خوش گمانیوں کے باوجود حقیقتاً کسی کی بھی حیثیت خود مہذب قوموں کی نہیں فقط صارفین کی ہے جو محض خریدار یا دوگامہ سربازار ہیں یا اس تہذیب اس کے آثار اور اس کے بانیوں کے انتہائی درجہ میں عملی یا ذہنی غلام اور چھوٹے درجہ میں نقال ہیں۔

مادی علم آدم کی وسعت

ان تمام مظاہر تہذیب میں بہت کچھ ہے مگر علم بجائے خود نہیں ہے یہ سب ان مادی عنصری علوم کے ظاہری کرشمے ہیں جن کی پشت سے روحانی علوم کی نگرانی کو بالکل ختم کر دیا گیا ہے۔ یہ وہی مقام ہے۔ خود تیل والے تمام عرب ملکوں میں بھی جہاں زندگی کے سنگین ترین مرحلہ پر قوم نوح،

عاد و ثمود اور قوم نمرود نے خود کو پایا تھا تہذیب پر فخر کا زمانہ لد چکا ہے اور تہذیب کے فقر کا دور سامنے ہے۔

علوم اور معلومات کی جو تفصیل اوپر پیش کی گئی ہے وہ عمرانی اصول سے ایک نہایت خطرناک صورت حال کی نشان دہی کرتی ہے عناصر اساسی مادی علوم کی فطرت میں توسیع و تفصیل پائی جاتی ہے ان علوم کی کوئی انتہا نہیں ہے اور نہ ان کی حد بندی کی جا سکتی ہے یہ کائنات جو نظر آ رہی ہے انہی عناصر سے مرتب ہوئی ہے اور اس کائنات کی حدود سے انسان آج تک لاعلم ہے نہ جانے یہ کتنی بسیط، وسیع و عریض، کتنی رفیع اور کتنی عمیق ہے انسان کے دائرہ علم میں یہ بھی نہیں کہ اس کائنات کے پرے کیا ہے اور خود اس وسعت کی حدود کیا ہیں اس کائنات سے آگے کونسی اور کیسی کائنات ہے ایک ہے یا طبق بر طبق، پہلو بہ پہلو لاتعداد ہیں، چنانچہ یہ لامتناہی کائناتیں عنصری علوم کے دائرہ توسیع کو بھی وہاں تک لے جاتی ہیں جہاں تک یہ کائناتیں پھیلی ہوئی ہیں اس وجہ سے عنصری علوم خود محدود نہیں ہیں اور نہ انسانی سطح پر کوئی قانون ہے جو ان پر کوئی روک لگا سکے ان علوم میں تحقیق و تجزیہ پر کسی اندرونی نظام سے روک لگا دی جائے تو وہ ان علوم کی فطرت اور مزاج کے خلاف ہوگا البتہ کوئی بیرونی نظام قانون ان کے ان علوم میں انسانی دسترس کی حد بندی کر سکتا ہے کیونکہ وہ تحدید ان علوم کی نہیں بلکہ انسانی ذہن کی ہوگی جس سے ان علوم کی فطرت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

انسان پر کسی بیرونی قانون سے یہ روک لگائی جا سکتی ہے کہ وہ سورج کی عمر سے بحث نہ کرے کیونکہ اس کے معلوم ہونے یا نہ ہونے سے ایک عام آدمی ہی نہیں بڑے فلکیاتی کی زندگی اور ذہنی کیفیت یا علمی حیثیت پر کوئی مثبت یا منفی اثر مرتب نہ ہوگا، لیکن سورج بہر حال ایک مادی وجود ہے اور ابدی نہیں ہے اس لیے کبھی بنا بھی ہوگا اور فانی ہے تو کبھی ختم بھی ہو جائے گا جب وہ کہکشاں میں بن رہا تھا تو انسان کا وجود نہیں تھا اور جب وہ ختم ہوگا اس وقت آج کا کوئی انسان موجود نہیں ہوگا اس کی مثال یوں ہے کہ ہوائی سفر کے دوران ایک جہاز شہر شکاگو کے اوپر سے پرواز کر رہا ہے اور اس میں کھڑکی سے لگا بیٹھا ایک شخص شہر کی سڑکوں پر دوڑتی گاڑیاں اور مکانات کی چھتیں دیکھ رہا ہے اس وقت کا یہ تحقیق کرنا کس قدر معقول سمجھا جائے گا کہ شہر کے دیوان ایوینیو پر

واقع اس اقراء بک سٹور میں اس وقت کون بیٹھا ہے وہ دکان کتنا عرصہ پہلے کھولی گئی تھی اور اس سے پہلے اس دکان میں کون شخص کیا کاروبار کرتا تھا۔ یہ سارا انگل کا وہ کھیل ہوگا جو اس مسافر کے لیے چنداں سود مند نہیں ہے کیونکہ شکاگو اس مسافر کی منزل نہیں اور تھوڑی ہی دیر میں ہوائی جہاز اس شہر سے دور کسی بیابان سے گزر رہا ہوگا اور اگر شکاگو ہی اس مسافر کی منزل ہے تو بھی متذکرہ معلومات سے اس شخص کو ادنیٰ فائدہ نہ ہوگا اور ان معلومات کے نہ ہونے سے اس کا کچھ نقصان نہ ہوگا کیونکہ شکاگو شہر میں لاکھوں دکانیں ہیں اور ان میں کاروبار کرنیوالے لوگ اور ادارے وقتاً فوقتاً بدلتے رہتے ہیں تو ان سب کے بارے میں اس قسم کی معلومات جمع کرنا یا تو انسانی صلاحیت کا احمقانہ ضیاع ہوگا یا اس صلاحیت کے فقدان کی دلیل۔

تمدن پر مادی علوم کا اثر

ابن خلدون کو اس کیفیت کا اندازہ تھا اسی لیے وہ تمدنی ترقی کو پسندیدگی کی سند نہیں دیتے تھے ان کا کہنا تھا کہ تہذیبی ارتقا کے دور میں بکثرت علوم پیدا ہوتے ہیں ظاہر ہے یہ تمام مادی، طبیعیاتی عنصری علوم ہوتے ہیں اور ان کی کثرت ہی تمدن کا تعارف ہوتی ہے مگر وہ کہتے ہیں کہ مادی علوم کی یہ کثرت مذہب کے لیے مضر ہوتی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ان علوم کی حقیقت اور ان کی پیدا کی ہوئی معاشرتی حالت کو واضح کیا جائے اور جو لوگ ان علوم ہی کو حقیقت ماننے کی غلطی کرتے ہیں ان کی آنکھوں سے پردہ اٹھایا جائے خلدونی نقطۂ نظر سے مادہ پسند اہل دانش کو یہ غلط گمان ہو جاتا ہے کہ تمام حسی یا ماورائے حس احوال اور ادراکات کے اسباب وعلل کو قیاسات، ظن و تخمین اور عقلی دلائل سے سمجھا جا سکتا ہے اسی گمانی دلیل سے وہ مذہبی اور روحانی امور پر بھی نظر کرتے ہیں اور یا تو ان کی غلط تعبیر کرتے ہیں یا سمجھ میں نہ آنے کی وجہ سے ان کا بالکل انکار کر دیتے ہیں یہ انکار شرک یا الحاد کا راستہ کھولتا ہے اور پھر تمدن کے ساتھ وہ سب کچھ ہو جاتا ہے جو قوم نوح، عاد و ثمود، قوم نمرود، اصحاب الایکہ، وادی سندھ کی قوم، قوم لوط وغیرہ کے ساتھ ہوا تھا۔

خلدونی تشریح دو باتیں واضح کرتی ہے اول یہ کہ تہذیب مادی علوم میں بڑے طوفانی ارتقاء

کا سیلاب کھولتی ہے، جس کے نتیجہ میں تمدن وجود میں آتا ہے بڑے شہر بنتے ہیں ان میں آسائشیں مہیا کی جاتی ہیں اور صحرائی جفاکشی کی جگہ شہری عیش و عشرت لے لیتی ہے تمدن کے ساتھ مادی علوم میں مجنونانہ پیش رفت ہوتی ہے اور جہاں ایک طرف ایجادات اور اختراعات کا طوفان آتا ہے وہاں ایسی ایسی باتیں علم کے نام پر جمع کردی جاتی ہیں جو انسانی تخیل کی داد تو ہوتی ہیں مگر علم سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا جتنے بڑے شہر تعمیر ہوتے ہیں اتنا ہی مادی علوم میں پھیلاؤ بڑھتا ہے اور بے شمار غیر عقلی باتیں علوم اور تحقیق اور فلسفہ کے نام پر رائج ہوتی ہیں جن کو سچ سمجھا جانے لگتا ہے۔

دوسرا نکتہ جس کا ذکر ابن خلدون نے کیا ہے یہ کہ یہ علوم مذہب سے بیگانگی پیدا کرتے ہیں دوسرے لفظوں میں مادی علوم کے سیلاب میں لائے ہوئے خس و خاشاک روحانی علوم اور قانون کا جُوا تہذیب کے کاندھوں سے اتار پھینکتے ہیں اور نتیجتاً تمدن میں معاشرتی گمرہی کا کوڑا کرکٹ پھیلا دیتے ہیں اس حالت میں معاشرہ ایک مصیبت میں مبتلا ہوجاتا ہے قانون کے روحانی سرپرست کی حیثیت سے مذہب انسان کی فطری ضرورت ہے تاکہ معاشرہ سیدھی راہ پر بڑھتا رہے لیکن جب مادی علوم مذہب کو رد کر دیتے ہیں تو اس فطری ضرورت کی تکمیل کے لیے انسان مجبوراً ایک مفروضہ روحانی نظام تخلیق کرتا ہے جو اس کی مادی اختراعی صلاحیت ہی کا ایک مظہر ہوتا ہے وہ خود دیوتا گھڑتا ہے جو اس کی مادیت پسندی کی دلیل ہوتا ہے خود روحانیت سے اس کا کوئی علاقہ نہیں ہوتا ان بتوں کے ساتھ ایک قسم کا مادہ اساس پروہتی نظام تشکیل دیتا ہے جس کا مقصد زندگی کو کسی قانون بالا کے تابع رکھنا ہوتا ہے ماضی میں اسی مقام پر مشرکانہ مذہب اور اس مختلف مادی ضرورتوں کے دیوتاؤں کے ساتھ ان دیوتاؤں کے مقربین پروہتوں اور پادریوں کا نظام قائم ہوتا رہا ہے جو قوموں کے سیاسی نظام کو طاقت بہم پہنچاتا رہتا ہے۔

جمہوریت میں ماضی کی بازگشت

جدید تہذیب میں اس ضرورت کو سیاسی سطح پر جمہوری نظام سے پورا کیا جاتا ہے جو اسی قدیم پروہتی نظام کی تبدیل شدہ اور نسبتاً بہتر شکل ہے یہ نظام عاد و ثمود کے اشراف اور چودھریوں کی

سرداری اور پروہتوں کی پیشوائی کی بدلی ہوئی امتزاجی شکل ہے جہاں جمہوریت نہیں ہے اور انفرادی قبائلی اور موروثی استبدادی نظام پایا جاتا ہے وہاں دراصل فرعون اور نمرود کے مذہبی سیاسی افکار کی پیروی کی جاتی ہے جس میں حاکم افراد خود کو خدائی کے مرتبہ پر فائز کر کے پورے معاشرے سے اندھی اطاعت کا مطالبہ کرتے ہیں یہ استبدادی نظام سیاسی اور معاشرتی شرک کے مزاج پر قائم ہوتا ہے اور تنخواہ دار پروہت نما پیشواؤں اور خود ساختہ اہل دانش کی اعانت سے موثر رہتا ہے اس نظام میں مذہب خواہ توحیدی ہو یا مشرکانہ محض ایک آلۂ کار ہوتا ہے مقصد نہیں۔

اس کے مقابل جمہوری سیاسی نظام کو مذہب کا عنوان نہیں دیا گیا البتہ یہ نظام بھی معاشرہ کی انہی مادی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے جو اگلے زمانوں میں فرعونوں اور نمرودوں کے ساتھ مل کر طبقۂ اشرافیہ اور امراء نیز معبدوں کے پیشوا کرتے تھے لیکن جمہوری نظام مذہب سے ایک گونہ بے اعتنائی پر مبنی ہے اسی لیے پیشہ ور پروہتوں کو اس نظام سے خارج کر دیا گیا اور ان کی جگہ پیشہ ور سیاست دانوں نے لے لی جو ماضی کے پیشہ ور پروہتوں کی طرح قانون سازی کرتے ہیں اور قوانین کو مذہبی تقدس کے بجائے عوامی تقدس کا سایہ مہیا کرتے ہیں یہ نظام سیاسی اور معاشرتی امور میں مذہب کو اخلاقیات کی مد میں بھی قبول نہیں کرتا کیونکہ یہ انسانی عقل کی پے بہ پے بدلتی ہوئی کیفیتوں اور تلون مزاجی کو کتاب قانون کا درجہ دیتا ہے اس مقصد کے لیے مروجہ مذہب اس کی تائید کرنے پر مجبور ہوتا ہے کوئی موثر تہذیبی کردار ادا کرنے کے قابل نہیں رہتا جمہوری نظام سیاست اور احتکاری نظام معیشت میں مذہب کی اس حالت کا سبب یہ ہوا کہ اس رواں تہذیب نے روایتی مذہبی نظام ہی میں مشرکانہ عقائد اور رسوم کی گنجائش پیدا کر لی اور اس نئے مادی مذہب کے ایجاد کردہ پیشوائی طریقہ سے تعلیماتی، تمدنی، سیاسی اور معاشرتی رویوں میں روحانی سرپرستی کا خلا پر کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس بحث سے قبل کہ عمرانی نقطۂ نظر سے مذہب، تہذیب اور ثقافت کیا ہے اور اس موضوع پر خود اسلامی فکری نہج کیا ہے یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ عصر حاضر کے مروجہ سیاسی نظام میں بھی کچھ

انتظامی اور فکری خوبیاں اسی طرح موجود ہیں جیسے عہد جاہلیت کے مکہ میں قصی ابن کلاب کے رائج کردہ سیاسی نظام میں تھیں جن میں سے کچھ کو رسول اللہؐ نے عارضی یا مستقل طور پر باقی رکھنے میں قباحت محسوس نہیں کی تھی مثلاً کعبۃ اللہ کا محکمہ سدانہ یا کلید برداری کا منصب قیامت تک کے لیے قریش کے بنی شیبہ کے پاس رہنے دیا جیسا کہ نظام قصی میں تھا یا غزوہ بدر میں اسلامی علم برداری کا منصب حضرت مصعبؓ ابن عمیر کو عطا کیا جو قریش کے قبیلہ بنی عبدالدار سے تعلق رکھتے تھے جس کے پاس نظام قصی کے ماتحت ریاست مکہ میں شعبہ لواء کی ذمہ داری تھی البتہ یہ اقدامات چند ظاہری معاملات تک محدود تھے اور ان کا تعلق اسلام کے اساسی سیاسی اور عمرانی اصولوں سے نہ تھا اور نہ یہ اس فکر و نظام پر موثر تھے رسول اللہؐ کے پیش نظر مظاہر نہیں اصول تھے کیونکہ امتداد زمانہ کے ساتھ مظاہر کی نوعیت اور کیفیت میں لازماً تبدیلی آتی ہے لیکن اصول محکم ہوں تو ان کی بنیاد پر بدلے ہوئے حالات میں نئے مظاہر کو بھی تہذیبی نظام کے دائرہ میں رکھا جا سکتا ہے۔

حسن و قبح پر اسلامی نظر

چنانچہ اسلام مروجہ سیاسی یا معاشرتی نظاموں کی ایسی خوبیوں کو اختیار کرنے سے نہیں گھبراتا جن میں شرک کی آمیزش نہ ہو لیکن ان امکانی خوبیوں کو اپنے اساسی اصول کو متاثر کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

اس زاویہ نظر سے جمہوری نظام کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں عوام الناس کو مرکزی حیثیت دی گئی ہے اور انہیں مقتدر اعلیٰ تسلیم کیا جاتا ہے یہ نقطۂ نظر اگرچہ اسلامی اصول سیاست سے میل نہیں کھاتا تاہم اسلام میں بنی آدم کی تکرمت اور عزت و وقار کا اصول تو موجود ہے وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (الاسراء ۱۷: ۷۰) = اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت مند بنایا ہے اس عزت کا اظہار انسان کے حقوق سے ہوا اولاد آدم کو حقوق اللہ اور حقوق العباد کی سند ملی حقوق اللہ کا تعلق انسان کی ذات سے ہے کہ چاہے ان حقوق کو ادا کرے یا نہ کرے دنیا میں کوئی پکڑ نہیں آخرت پر ایمان ہو تو وہاں پکڑ ہو جائے گی حقوق العباد کا تعلق بندوں سے ہے جو ایک فرد کے پیدا ہوتے ہی متعین ہو

جاتے ہیں مسلمان دوسروں سے اسلام کے بارے میں بات کرتے ہیں تو پُر زور آواز میں ان اسلامی حقوق پر تقریریں کر کے اپنی بے عملی اور بدعملی پر پردہ ڈالتے ہیں کیونکہ ان حقوق پر عمل ایمان ان کے عقیدہ کا جزو نہیں ہے مسلمانوں کے کسی ملک میں بھی ان حقوق انسانی کو عزت نہیں دی جاتی دوسری طرف دو مہیب اور وحشیانہ عالمی جنگوں کے بعد مغربی جمہوری نظام میں ایک سیاسی نعرہ کے طور پر انسانی حقوق کا ذکر ہوا انسان کو تحریر و تقریر کا حق دیا گیا اپنے ملک کے کسی بھی حصہ میں بلا روک ٹوک آنے جانے قیام کرنے کام کرنے کی مکمل آزادی دی گئی دین و مذہب پر اپنی مرضی کے مطابق عمل کی آزادی کی ضمانت دی گئی بلکہ عمل نہ کرنے کی آزادی بھی دی گئی اپنی حکومت کے نمائندوں کا انتخاب وہ خود کرتے ہیں ایشیائی جمہوریتوں میں تو یہ ظاہری آزادی ایک الیکشن کے ساتھ ہی داخل دفتر ہو جاتی ہے لیکن مغربی جمہوریتوں میں سال کے بارہ مہینے اپنی حکومت اور اپنے سیاسی نمائندوں کے ساتھ تائیدی یا تنقیدی ربط قائم رکھنے کی اجازت بھی ہے اور سہولت بھی اور یہ ربط و تعلق برقرار بھی رہتا ہے۔

بحث اس سے نہیں کہ یہ آزادیاں اور سہولتیں اور حقوق اسلام کے مطابق ہیں یا اس کے مغایر نکتہ یہ ہے کہ اپنی قباحتوں اور نقائص کے ساتھ اس نظام میں کچھ ایسی خوبیاں ہیں جن کو امکانی اسلامی معاشروں میں بعینہٖ یا اصلاح و ترمیم کے بعد قبول کیا جا سکتا ہے ہر حالت میں اسلام کا اصرار اپنے اصول و کلیت پر رہتا ہے اس کا ایک بڑا مظاہرہ تہذیب کے عنوان سے دیکھنے میں آتا ہے جیسا کہ خلدونی عمرانیات کے بیان میں سامنے آچکا ہے اس فرق کو باقی رکھنے کے لیے اسلام دو عمرانی اصطلاحوں میں بات کرتا ہے

امت اور ملت کی شرح

انسانی اجتماعیت کے سیاسی ظہور کے طور پر نیز امت اور عمرانی ظہور کے طور پر ملت کے وجود کو تفصیلی گفتگو درکار ہے

اسلامی ذخیرۂ اصطلاحات میں کچھ اہم الفاظ مترادفات یا قریب المعنی گردانے جاتے ہیں

امت قوم کے لیے بولا جاتا ہے لیکن اگر کسی سابقے اور لاحقے کے بغیر استعمال کیا جائے تو اس سے صرف مسلمانوں کی عالمی برادری مراد ہوتی ہے دین اور شریعت دونوں ہی کے لفظی معنی راستے اور طریق کے ہیں اور یہی معنی طریقت کے بھی ہیں اگرچہ اصطلاح میں طریقت کو دین یا شریعت کا مترادف نہیں مانا جاتا لیکن دین اور شریعت دونوں باہم قریب المعنی ہیں ان دونوں کی بھی یہی خصوصیت ہے کہ سابقہ اور لاحقہ کے بغیر استعمال کیے جائیں تو ان سے دین اسلام اور شریعت اسلامی ہی مراد ہوتی ہے طریقت روحانی اصلاح و تربیت کے نظام اور سلوک کی تمرینات کا نام ہے اور اس سے صرف اسلامی تصوف مراد ہوتا ہے یہودی قبالاہ عیسائی مسٹسزم اور رہبانیت، ہندو بھگتی، سادھنا اور جوگ کو تصوف یا طریقت نہیں کہا جاتا کچھ ظاہری اتفاقات کے باوجود ان میں باہم بھی اور طریقت سے بھی ایک گونہ مغائرت پائی جاتی ہے اور مقصد و نتائج میں بین فرق ہوتا ہے۔

دین اور شریعت کا ایک ہم معنی یا مترادف لفظ ملت ہے امت کی طرح ملت بھی قرآنی اصطلاح ہے امت کا لفظ قرآن حکیم میں ۶۹ مقامات پر آیا ہے جہاں اس کے ہمہ جہتی تاریخی پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے خاص مسلمانوں کے بارے میں امتکم = تمہاری امت کی اصطلاح دوبار وارد ہوتی ہے قرآن حکیم میں لفظ ملت تنہا یا ضمائر کے ساتھ ۱۵ بار وارد ہوا ہے لیکن ان تمام آیات میں سب سے اہم سورۃ البقرہ کی آیت ۱۲۰ ہے وَلَن تَرْضَىٰ عَنكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ = اور ہرگز راضی نہ ہوں گے آپ سے یہود اور نصاریٰ تا آنکہ آپ ان کی ملت کا اتباع کریں اس لفظ کا اصطلاحی مفہوم طے کرنے میں یہ آیت کلیدی اہمیت رکھتی ہے اس آیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لفظ نہایت وسیع المعنی ہے چنانچہ اس لفظ کے قرآنی مفہوم کی گہرائی کو پہنچنے کے لیے اسی آیت کی تفاسیر سے مدد لی گئی ہے۔

مفسرین کی تصریحات

علماء اور مفسرین نے عموماً ملت سے دین ہی مراد لیا ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور ان کے اتباع میں امام طبری، امام رازی، امام سیوطی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا محمد شفیع نے ملت کو

دین بتایا ہے مولانا عبدالماجد دریابادی (تفسیر ماجدی) نے ملت کا انگریزی معنی دین یا ایمان (فیتھ Faith) اور عبداللہ یوسف علی (دی ھولی قرآن) نے انگریزی ترجمہ مذہب (رلی جن Religion) کیا ہے مارماڈیوک محمد پکتھال (دی گلوریس قرآن) نے ملت کا انگریزی ترجمہ عقیدہ (کریڈ Creed) کیا ہے کچھ مفسرین نے ملت کو شریعت کہا ہے ان میں امام قرطبی، امام اندلسی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی اور مولانا محمد ادریس کاندھلوی شامل ہیں۔ یہ لفظ دین مذہب فرقہ، نظریہ وغیرہ کے مفاہیم کا احاطہ کرتا ہے مولانا محمد ادریس کاندھلوی (معارف القرآن/ادریسی ۱:۲۷۶) نے منسوخ ملتیں یعنی شریعتیں کہا ہے امام ابوحیان اندلسی (البحر المحیط ۱:۵۳۸) نے ملت کی تفسیر قبلہ بھی کی ہے امام محمد الانصاری قرطبی (احکام القرآن ۲:۹۳) نے کہا کہ ملت وشریعت وہ ہے جس کی دعوت اللہ اپنے بندوں کو دیتا ہے اور دین اس (شریعت وملت) کے اوامر پر بندوں کے عمل کا نام ہے قاضی ثناء اللہ پانی پتی (تفسیر مظہری ۱:۱۶۱) نے کہا کہ ملت وہ طریقہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے واسطے اپنے انبیاء کی زبانی مقرر کیا ہے امام بغوی اور امام فخر الدین رازی نے اس کا ایک مطلب طریقہ یا طور طریق بھی لکھا ہے امام عبداللہ نسفی (مدارک التنزیل ۱:۲۰۲) نے ملت کا مفہوم "رضامندیاں" طے کیا ہے امام محمود آلوسی بغدادی (روح المعانی ۱:۳۷۱) نے امام راغب اصفہانی کے حوالہ سے کہا کہ ملت اسم ہے جو کسی سمت میں طبیعت کے میلان کو ظاہر کرتا ہے جیسا کہ اصول شرائع کی طرف رسولؐ اللہ کا اور دیگر انبیاء کا طبعی میلان تھا نیز یہ کہ دین قیم ہی ملت ابراہیم (الانعام ۶:۱۶۱) ہے اور ملت کا اطلاق فروع دین پر ہوتا ہے حکیم الملت مولانا حامد الانصاری غازی (اسلام کا نظام حکومت ۳۷۰) نے امام ابن کثیر (البدایہ والنھایہ ۵:۱۴۱) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ غزوہ تبوک کے موقعہ پر ایک خطبہ میں رسولؐ اللہ نے فرمایا خیر الملل ملة ابراھیم = دنیا کی ملتوں میں بہترین ملت ابراہیمؑ ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی (بیان القرآن ۳۴) نے ملت کا لفظی ترجمہ تو مذہب کیا ہے البتہ تفسیر میں لکھا ہے کہ جسے یہود ونصاریٰ اپنا مذہب (بمعنی ملت) کہتے ہیں وہ کچھ تو منسوخ ہو

جانے سے اور کچھ تحریف سے اب محض چند خیالات کا مجموعہ رہ گیا ہے مولانا شبیر احمد عثمانی (تفسیر عثمانی ۱:۱۳۰) نے تفسیر میں ملت کے لغوی ترجمہ کے بجائے مرادی معنی میں لفظ ضد استعمال کیا ہے یعنی یہود و نصاریٰ کی ملت دراصل ان کی ضد اور ہٹ ہے اپنے طور طریقوں پر جنہیں وہ دین باور کرتے ہیں مصری عالم شیخ محمد متولی شعراوی (تفسیر قرآن، البقرہ ۲:۱۲۰) نے کہا ملت کا مطلب دین ہے اور اسے ملت اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کی طرف طبیعت کا میل ہوتا ہے خواہ وہ باطل ہی کیوں نہ ہو یہود و نصاریٰ نے اپنی اپنی ملتوں میں تحریفات کی ہیں اس واسطے ہدایت سے خالی ہو گئی ہیں مولانا محمد آصف قاسمی (بصیرت قرآن ۱ :۱۲۰) نے ملت کا مطلب دین، طریقہ، مذہب لکھا ہے اور تفسیر کی ہے یہود و نصاریٰ کے طریقے۔

امام ابن جریر طبری (جامع البیان ۳:۸۹) اس سلسلہ میں تین نکات پیش کرتے ہیں اول۔ یہودی اور نصرانی ملت ابراہیم پر نہیں ہیں ثانی اللہ نے کہا کہ ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے نہ نصرانی اور ملت ابراہیم الحنیفیہ المسلمہ ہے ثالث ملت ابراہیم اسلام ہے اور یہود و نصاریٰ ایک مختلف ملت ہیں آگے چل کر البقرہ ۲: ۱۳۵ کی تفسیر میں کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ کو حکم دیا کہ یہود و نصاریٰ سے اور اپنے اصحاب سے کہو کہ آؤ ہم سب ملت ابراہیم پر جمع ہو جائیں امام اندلسی (البحر المحیط ۱:۵۳۸) نے یہود و نصاریٰ اور مشرکین قریش کو ''ایک ملت'' قرار دیا ہے۔

اَھواء ھُم کی تشریحات

ان تفاسیر سے اس قدر واضح ہو جاتا ہے کہ علماء نے ملت کی اصطلاح کو عموماً بنیادی مرادات اسلام کے لیے استعمال کیا ہے اس کے معنی پر علماء میں اتفاق رائے بھی ہے اور تاویل کا اختلاف بھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اصطلاح میں لچک ہے اور اس کے مفہوم میں مزید امکانات تلاش کیئے جا سکتے ہیں مگر کوئی نتیجہ اخذ کرنے سے پہلے سورۃ البقرہ کی آیت ۱۲۰ کے دوسرے اہم فقرہ پر ائمہ تفسیر کی تشریحات کا ایک جائزہ لینا مناسب ہے وہ فقرہ یہود و نصاریٰ کے دین کے مقابلہ میں ان کی خواہشات پر توجہ کی تاکید کرتا ہے مفسرین نے وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَھْوَآءَ ھُمْ (اگر آپ نے ان (یہود و نصاریٰ) کی خواہشات کی پیروی کی ۔۔۔) میں اھواءھم کی جو تشریحات کی ہیں وہ ملت

کے وسیع تر معنی متعین کرنے میں مدد دیتی ہیں۔

امام رازی (مفاتیح الغیب ۴: ۲۹) کہتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ چاہتے ہیں ان کے طور طریق (ان کی ھوئی جمع اھواء۔ الموافقۃ لھم فیما ھم علیہ) کی موافقت کی جائے اور مسلمان ان کی مرضی کا اتباع کریں (وما یدعون الی اتباعہ ماھو بھدی انما ھو ھوی) ان کی دعوت ہدایت کے اتباع کی نہیں بلکہ اپنی ناجائز نفسانی خواہشات کی پیروی کے لیے ہے اور ان کے اقوال حرص و ہوس اور بدعت پر مبنی ہیں امام رازی مزید شرح کرتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ کا منشا یہ نہیں کہ مسلمان ان کی کتاب (اور ان کے دین) کی پیروی کریں (کیونکہ دین میں تو وہ بہت کچھ تحریف کر چکے ہیں) بلکہ منشا یہ ہے کہ رسول اللہ اور تمام مسلمان وہ سب کچھ کریں جو وہ لوگ کرتے ہیں' یعنی ان کی مرضیات اور خواہشات کے تابع رہیں اس شرح سے دوسرا مطلب یہ نکلتا ہے مسلمان ان کے طرز زندگی اور ان کے کلچر پر حرف گیری بھی نہ کریں امام عبداللہ بیضاوی (انوار التنزیل ۱: ۲۹۳) نے اھواءھم کا ترجمہ ان کی ناقص رائیں (آراءھم الزائفہ) کیا ہے اور کہا ہے کہ ھوئی وہ رائے ہے جو شہوات کا اتباع کرتی ہے (والھوی رأی یتبع الشھوۃ = شہوت کا اتباع کرنے والی رائے کو ھوئی کہتے ہیں) امام عبداللہ النسفی (مدارک التنزیل ۱: ۲۰۲) نے ان کی رضامندیاں ترجمہ کرتے ہوئے وضاحت کی کہ ان کے اقوال خواہشات اور بدعات پر مبنی ہیں امام ابوحیان اندلسی (البحر المحیط ۱: ۵۳۸۔۵۳۹) نے بھی اھواءھم سے وہ خواہشات اور ضلالات (گمراہیاں) مراد لی ہیں جو شہوات اور طبیعت کے میلان میں نشو و نما پاتی ہیں اور اسی لیے ان لوگوں کو اصحاب البدعہ اور ارباب الاھواء۔ بدعتی اور خواہشات کو پالنے والے کہا گیا ہے امام محمود آلوسی بغدادی (روح المعانی ۱: ۳۷۱۔۳۷۲) نے اھواءھم سے مراد آراء ھم الزائغۃ المنحرفۃ عن الحق لیا ہے یعنی ان کی کج رائی، ٹیڑھے میڑھے خیالات اور حق سے روگردانی جو نفسانی شہوت کے اتباع کا نتیجہ ہے انہوں نے ایک نکتہ یہ بھی بیان کیا ہے کہ آیت میں جمع کا صیغہ اھواءھم استعمال کیا گیا ہے جس سے ان کی رایوں اور طریقوں میں پایا جانے والا کثیر اختلاف ظاہر ہوتا ہے مولانا محمد ادریس کاندھلوی

(معارف القرآن/ادریسی ا:۲۷۶) نے ہوائے نفس اور نفسانی خواہشات کہا ہے مولانا اشرف علی تھانوی (بیان القرآن ۳۴) اور مولانا مفتی محمد شفیع (معارف القرآن ۱۔۳۰۶) نے اھواء ھم کا مطلب لیا ہے غلط خیالات جن کو وہ اپنا مذہب سمجھتے ہیں شیخ محمد متولی الشعراوی (تفسیر قرآن البقرہ ۲: ۱۲۰) نے کہا ملت یہود اور ملت نصاریٰ دراصل بشری خواہشات (اھواء) ہیں جنہیں نفس قبول کر لیتا ہے گرچہ وہ باطل نیز حق سے دور ہوں اس لیے وہ شہوات سے بھرا ہوا ٹیڑھا راستہ ہے مولانا محمد آصف قاسمی (بصیرت قرآن ا: ۱۳۰) نے بھی ھواء کے معنی خواہشات اور تمنائیں بیان کیے ہیں

عبداللہ یوسف علی (دی ہولی قرآن)، مارماڈیوک محمد پکتھال (دی گلوریس قرآن) اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی (تفسیر ماجدی ا: ۷۷) نے اس کا انگریزی ترجمہ ڈزائرس (Desires خواہشات) کیا ہے۔

اپنی تفسیر میں مولانا محمد ادریس کاندھلوی اس نکتہ کو اور بھی صاف کر دیتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ کی دعوت اپنے دین کے لیے تو ہے ہی نہیں کیونکہ وہ دونوں فی الحقیقت اپنی کتاب پر تو ایمان رکھتے ہی نہیں۔ یعنی اس میں تحریف کرتے ہیں مطلب یہ کہ ایمان رکھتے تو آسمانی کتاب میں ردو بدل کیوں کرتے تو جو کچھ ان کی دعوت ہے وہ اپنے دین کی بجائے اپنی مرضی اور اپنے طرز زندگی کی ہے۔ چنانچہ ثابت ہوا کہ یہ طرز زندگی ان کے نظریات اور اس کا فلسفہ ان کا کلچر ہے اور اسی کلچر سے ان کی ملت ظاہر ہوتی ہے۔ جو ملت ابراہیم سے مختلف ہے۔

کلچر کی لغوی جڑیں

یہ تیرہ مفسرین گزشتہ ۸۰۰ سال کی عالمی علمی روایات کے بزرگ ترین نمائندے ہیں انہوں نے اھواء سے خواہشات، تمنائیں، گمراہیاں، مرضیاں، ہوائے نفس، نفسانی خواہشات، رائیں، کج رائی، ٹیڑھے میڑھے خیالات، بدعات، حق سے انحراف اور اتباع شہوات مراد لیا ہے جن کا تعلق دین، مذہب، شریعت سے ثابت نہیں ہوتا، بلکہ مادی اور معاشرتی عادات ان کی تعبیر ہیں ان

تمام عادتوں کو ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو انگریزی لفظ کلچر کہا جائے گا جس کا کوئی مکمل یک لفظی مترادف عربی فارسی اور اردو میں نہیں پایا جاتا اگرچہ خود کاشتہ کی ترکیب سے لفظ کلچر کی تعریف طے ہو سکتی ہے اس کی وضاحت آگے آرہی ہے۔

لفظ تہذیب کا مصدر ہذب ہے جس کا مطلب شاخ تراشی کرنا، پاکیزہ کرنا، درست کرنا (مولانا عبدالحفیظ بلیاوی المنجد اردو ۱۰۱۵) لہٰذا مہذب کا مطلب پاکیزہ اخلاق والا، عیوب سے پاک، مخلص ہوتا ہے انگریزی میں اس مقصد کے لیے سولزیشن (civilization) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے مگر اس کا لفظی مطلب تہذیب کے بجائے تمدن ہوتا ہے اور تمدن کے لیے پاکیزہ اخلاق والا، عیوب سے پاک اور مخلص ہونا ضروری نہیں اس لیے انگریزی میں تہذیب کے واسطے دوسرا لفظ کلچر (Culture) بھی استعمال کیا جاتا ہے لاطینی اصل کے اس لفظ کے لغوی معنی کاشتکاری اور زرعی پیداوار ہیں اور مرادی معنی کسی سمت عادت کا جھکاؤ اور میلان ہے انگریزی زبان میں اس لفظ کا استعمال بے شمار ایسی عادتوں کے رواج پر بھی محمول ہے جن کا تعلق تہذیب سے نہیں ہوتا مثلاً وہ جنہیں فنون لطیفہ کہا جاتا ہے یعنی ناچ گانا، راگ رنگ، موسیقی، سوانگ بھرنا، ڈرامے کھیلنا، شادی بیاہ، ولادت موت خوشی غمی کی دنیادارانہ رسمیں اور رواج، ننگ لباسی یا کم لباسی، شراب کے جلسے اور دیگر تفریحی پارٹیاں اور محفلیں، ادب اور شاعری اور ان کی بزمیں، سیاسی اور اقتصادی نظام وغیرہ سب کلچر کے ذیل میں آتے ہیں اور یہ یا ایسی عادتیں غیر مہذب معاشروں میں بھی پائی جاتی ہیں انگریزی کی لغت میریئم ویبسٹر ڈکشنری (Merriam.Webster Dictionary) کے مطابق کلچر نام ہے "کسی معاشرہ، گروہ، مقام یا زمانہ کے عقائد، رواجوں، فنون کا کسی خاص معاشرہ کے اپنے عقیدوں، طرز زندگی اور فنون وغیرہ کا"۔

کلچر کو اردو میں ثقافت کہا جانے لگا عربی لفظ ثقافت کا مصدر ثقف ہے جس کا مطلب ذہانت، ہوشیاری، مہارت، دانشوری، شائستگی آنا ہے اسکے مشتقات کے مطالب میں نیزوں کو سیدھا کرنا، پٹا کھیلنا، ہتھیاروں سے مقابلہ کرنا، تیغ بازی، تعلیم و تربیت حاصل کرنا بھی آتا ہے (مولانا

وحیدالزمان قاسمی کیرانوی، القاموس الوحید ۲۱۹) یہ شرحیں بھی تہذیب کے مفہوم کو نہیں پہنچتیں چنانچہ تہذیب کے فہم کے لیے قانون ربانی کی مدد لیے بغیر چارہ نہیں کیونکہ ماضی میں اسی قانون کی رو سے ان معاشروں کو تباہ یا معدوم کر دیا گیا جو تہذیب کے عنوان سے تہذیب کے تقاضے پورے کرنے کے اہل نہیں رہے تھے۔

چنانچہ کلچر (Culture) کا جو عام لفظی اردو یا عربی ترجمہ ثقافت کیا جاتا ہے وہ سطحی مطلب ہے جو قدیم لاطینی فلسفیانہ اصطلاح سے ماخوذ ہے مگر یہاں جن عادات کا تذکرہ آیا ہے ان کا احاطہ نہیں کرتا کلچر کا مصدر لاطینی لفظ کلٹس (Cultus) ہے جس کا مطلب رعایت و مسئولیت، محنت، زراعت وغیرہ ہے اس سے انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں میں تین الفاظ مشتق ہوئے ہیں کلٹ (Cult)، کلٹی ویٹ اور کلٹی ویشن (Cultivate and Cultivation) اور کلچر (Culture) کا مطلب طائفہ اور دین میں پیدا ہونے والا نیا فرقہ ہے یا جماعت معجبین یعنی خود پسند گروہ ہے اور اسی لیے اس لفظ (Cult) کا ایک مطلب بدعت بتایا گیا ہے لفظ کلٹیویٹ زراعت، کاشتکاری، فلاحت، حرث، تنمیہ اور تبدیلی گویا کسی اصل سے کوئی نئی بات یعنی بدعت پیدا کرنے، اختراع کرنے اور کسی کیفیت کو برقرار رکھنے یا اس میں اضافے کے مفاہیم ادا کرتا ہے کلٹیویٹ فعل ہے اس سے کلٹی ویشن اسم بنایا گیا ہے۔

لاطینی اور عربی اصطلاحیں

قدیم رومی خطیب سسرو (Cicero مقتول ۴۳ قبل مسیح) نے اس زراعتی استعارہ کا فلسفیانہ استعمال کرتے ہوئے کلچورا انیمائی (Cultura animi) روح کی بڑھوتری یا تنمیہ کی اصطلاح وضع کی یہاں سے کلچر کا مطلب روح یا ذہن کی بالیدگی مقرر ہوا، باوجودیکہ اس تعریف کے ذیل میں آنے والے یا متصورہ افعال کا روح سے اصلاً کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا، اٹھارویں صدی میں فرانسیسی فلسفی ژان ژاکس روسو (Jean Jacques Rousseau۔۱۷۱۲۔۱۷۷۸ء) کی تحریروں کے زیر اثر کلچر کی اصطلاح تہذیب یا مدنیت (Civilization) سے مختلف اور آزاد مفہوم

میں استعمال ہونے لگی فلسفیانہ سطح پر اس سے انسانی ذات کی حقیقت کا اظہار مراد لیا گیا جب کہ عام سطح پر معاشرتی رسوم ورواج کا نام کلچر ٹھہرا یہ مدنیت سے مختلف سطح ہے کیونکہ شادی بیاہ کی رسمیں اور تقریبات، ولادت اور موت کے موقعوں کے رواج دیہاتیوں اور بنجاروں میں بھی ہوتے ہیں اور ان رسوم ورواج کو ان قبائل کا کلچر ہی قرار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ کلچر میں ناچ گانا، گیت سنگیت، فنون لطیفہ وغیرہ سب شامل ہو گیا جو ذیلی طور پر تمدن کا ایک حصہ بن جاتے ہیں مگر بجائے خود تمدن نہیں ہوتے۔

فی زمانہ کلچر کی یہ دونوں تعریفیں بیک وقت مستعمل ہیں اور معتبر سمجھی جاتی ہیں تعلیمیہ میں فلسفیانہ سطح پر اس لفظ سے وہی روح کی بالیدگی اور انسانی ذات کی حقیقت کا اظہار مراد لیا جاتا ہے جب کہ عوامی سطح پر یہ تعریف بجائے خود نا قابل فہم ہے اور راگ رنگ، ناچ گانا، شعروادب، مصوری ونقاشی، آرائش اور آسائش کے طریقوں، مذہبی تقریبات اور تفریحات یا معاشرتی، سیاسی اور معاشی رسم ورواج پر کلچر کا اطلاق کیا جاتا ہے، قطع نظر اس کے کہ ان صورتوں میں سرو کی وضاحت کا حق ادا ہوا کہ نہیں یا کسی کو روح میں بالیدگی کا تجربہ یا احساس ہوا کہ نہیں

سرو سے صدیوں پہلے حضرت ابراہیمؑ کے طرز معاشرت کے لیے ملت کی اصطلاح استعمال کی گئی تھی امام ابوحیان اندلسی (بحر المحیط ۱: ۵۲۸) اور امام محمود آلوسی بغدادی (روح المعانی ۱: ۳۷۱) نے روایت نقل کی ہے کہ تمام اقوام کفر ملت واحد ہیں تو اس سے مراد یہی کلچر تھا یعنی کافر اقوام کے اعتقادات، ور معبودوں میں فرق ہو سکتا ہے مگر طرز زندگی سب کا وہی ایک ہے یعنی اللہ کی کی ربوبیت و وحدت کا انکار، رسول اور انبیاء کا انکار یا ان کی تعلیمات سے غفلت، بدعات و خرافات، شرک اور ضلالت اور خود ساختہ اور خود کاشتہ رسوم ورواج اور نظریات پر جان توڑ اصرار، نفسانی خواہشات کی اندھی پیروی، اختلاف کے باوجود دیوتاؤں اور مورتوں کی عبادتوں کے طریقے وغیرہ اس کے برعکس ملت ابراہیم کا امتیاز یہ تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے مخلص متبعین کی معاشرتی بودوباش اور رہن سہن کو مکمل طور پر اللہ کے دیے ہوئے دین وشریعت کے تابع رکھتے ہوئے اللہ کی وحدانیت پر اس طرز زندگی کی عمارت اٹھائی گئی تھی اور اسی پر ان کا اصرار بھی تھ

اس سے مختلف ملت کو امام ابن جریر طبری (جامع البیان ۳:۸۹) نے بدعت کہا ہے یعنی یہ کہ ان ابراہیمی اصولوں سے جزوی انحراف جب مسلمانوں میں پیدا ہوتا ہے تو اگر چہ اس معاشرتی کیفیت پر کفر کا اطلاق نہیں ہوتا مگر اس کے نتیجہ میں ایک گروہ سواد اعظم اور جماعت سے کٹ کر ایک نیا فرقہ بن جاتا ہے جو ملت ابراہیم کے تقاضے پورے نہیں کرتا اس لیے اس کے عمل بے عملی یا بدعملی کو بدعت کہا جاتا ہے۔

ملت ابراہیم کی تشکیل و ماہیت

حضرت ابراہیمؑ سے پہلے آنے والے ممتاز انبیاء مثلاً حضرت نوح، حضرت ہودؑ اور حضرت صالح علیہم السلام کی تعلیم توحید کے اقرار اور شرک و معصیت کو فروغ دینے والی مادی ترقیات کے مکمل رد پر مبنی تھی ان انبیاء کو بڑی دشواریاں پیش آئیں اور ان کی قوموں کا لاعلاج تمرد ان کی تہذیبوں اور مادی ترقیات کے ساتھ خود ان قوموں کے خاتمہ کی وجہ سے کوئی مستقل نظام معاشرت مرتب نہ ہو سکا، حضرت ابراہیم پہلے شخص تھے جنہوں نے خود اپنی اور پھر بڑے صاحبزادہ حضرت اسمٰعیل اور اُم اسمٰعیل حضرت ہاجرہ کی ہجرتوں کے بعد انسانوں کے لیے دین و شریعت پر مبنی معاشرتی نظام مرتب کیا تھا اور انسانی معاشروں میں اس طرز کی بقا کا ایک عمرانی نظام مرتب کیا تھا اس ملت کا پہلا نمونہ انہوں نے اپنی اولاد کو بنایا اس معاملہ میں انہوں نے اپنی اولاد میں کوئی فرق روا نہیں رکھا اور سارے بیٹوں کو ایک ہی تعلیم دی مگر تاریخ سے ظاہر ہوا ہے کہ اس ملت کا بہترین قابل عمل نمونہ انہوں نے اپنے سب سے بڑے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو بنایا تھا اس کی دلیل بائبل میں موجود ہے۔

توراۃ میں حضرت اسمٰعیل کی دو خصوصیات بتائی گئیں ہیں ایک یہ کہ ''اس کا ہاتھ سب کے خلاف اور سب کے ہاتھ اس کے خلاف ہوں گے'' اور دوسرے یہ کہ ''وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بسا رہے گا'' (بائبل، تکوین ۱۶:۱۲) پہلا بیان ثابت کرتا ہے کہ حق کی حمایت اور دین حنیف کی تائید و تبلیغ کا ذمہ دار حضرت اسمٰعیل کو بنایا گیا تھا یہاں تک کہ ساری دنیا ان کے مخالف ہو

جائے اور وہ خود تاعمر اور ان کے بعد آنے والی ان کی نسلیں اس ربانی عمرانی نظام کے مخالفین اور دشمنوں کے خلاف جہاد میں مشغول رہیں۔ تمام انبیاء کی تاریخ میں یہی قدر مشترک ہے بائبل کے دوسرے فقرہ سے مراد ظاہر ہے کہ حضرت اسمٰعیل اپنے سب بھائیوں کے سامنے بطور نمونہ موجود رہیں گے اس تشریح کی دلیل یہ ہے کہ بائبل کے سفر تکوین کے باب ۴۹ کے مطابق حضرت یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں کو ملک کنعان کے مختلف علاقوں میں پھیلا دیا تھا اور ان میں سے کسی کے بارے میں یہ نہیں کہا تھا وہ اپنے بھائیوں کے سامنے بسا رہے گا کیونکہ بائبل میں یہ شرف پہلے ہی آل اسرائیل کے دادا حضرت اسمٰعیلؑ کے لیے خاص کیا جا چکا تھا قرآن حکیم میں یہ شرف ملت ابراہیمی کی تعریف کے طور پر بیان ہوا ہے اِذۡ حَضَرَ یَعۡقُوۡبَ الۡمَوۡتُ ، اِذۡ قَالَ لِبَنِیۡهِ مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِیۡ : قَالُوۡا نَعۡبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبۡرٰهٖمَ وَ اِسۡمٰعِيۡلَ وَ اِسۡحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا : وَّنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ ۝ (البقرہ ۲:۱۳۳)= جب یعقوبؑ کا آخری وقت آیا تو انہوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ میرے بعد تم کس کی پرستش کرو گے؟ انہوں نے بالاتفاق جواب دیا کہ ہم عبادت کریں گے آپ کے اللہ کی اور آپ کے آباء ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق کے اللہ کی جو اکیلا معبود ہے اور ہم اسی کے حکم بردار ہیں۔

حضرت اسمٰعیل کا اختصاص

توراۃ میں یہ مکالمہ تو بیان نہیں ہوا البتہ تمام بیٹوں کی موجودگی میں حضرت یوسفؑ کو مخاطب کرتے ہوئے حضرت یعقوبؑ کا بس یہ قول گزرا ہے کہ ''میں تو مرتا ہوں لیکن خدا تمہارے ساتھ ہوگا'' (بائبل، تکوین ۴۸: ۲۱) سورۃ البقرہ کی متذکرہ بالا آیت مبارکہ میں حضرت اسمٰعیل کی بزرگی اور اختصاص کا ایک لطیف اشارہ موجود ہے جس کی تصدیق بعد کے واقعات سے ہوتی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ نے اس ملت کا مرکز بھی آل سارہؑ کی قیام گاہ کنعان کے شہر حبرون (الخلیل) میں اپنے دار الہجرت اور فلسطین وار دن میں بنی قطورا کی بستیوں کے بجائے مکہ کی وادی

غیر ذی زرع میں حضرت اسمٰعیل کی قیام گاہ کو بنایا تھا اور اس مقصد کے لیے تنہا ان کو ساتھ لے کر انہوں نے حضرت آدم علیہ السلام کی قائم کردہ بنیادوں پر بیت اللہ کی تعمیر نو کی تھی ایسا کوئی مرکز انہوں نے کنعان، فلسطین اور اردن کے کسی شہر میں نہیں بنایا تھا اس اہم اور محنت طلب کام کے لیے انہوں نے آل سارۃ اور بنی قطور میں سے اپنے کسی بیٹے کو مدد کے لیے نہیں بلایا تھا پھر جب وہ اپنے بڑے صاحبزادہ حضرت اسمٰعیل کے ساتھ کعبہ کی دیواریں اٹھا رہے تھے تو ساتھ ساتھ اپنے بیٹے اور اولاد اور متبعین کے لیے دعائیں کرتے رہے اے ہمارے پالنہار ہم سے قبول فرمایئے بلاشبہ آپ خوب سننے والے اور خوب جاننے والے ہیں اے ہمارے پروردگار ہمیں اپنا مطیع و فرمانبردار (مسلمین) بنایئے اور ہماری ذریت میں سے ایک فرمانبردار ملت (جماعت/معاشرت) اٹھایئے اور ہمیں مناسک حج کے احکام بھی بتا دیجئے اور ہمارے حال پر مہربانی سے توجہ کیجئے، بے شک آپ ہی توجہ فرمانے والے (توبہ قبول کرنے والے) ہیں اے ہمارے رب اس جماعت (ملت /معاشرہ) میں ان کے اندر سے ایک رسول بھیجئے جو انہیں آپ کی آیات پڑھ پڑھ کے سنائے انہیں (آسمانی) کتاب (قوانین) کی تعلیم دے اور حکمت (زندگی کا سلیقہ) دے ان کو (بدعات و خرافات اور شرک و کفر سے) پاک کردے (البقرہ ۲۔۱۲۷۔۱۲۸) ان آیات سے بھی یہ ظاہر ہے کہ ملت ابراہیم کے امام حضرت اسمٰعیل تھے اور یہی امامت حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وصحبہٖ وسلم کی ذات اقدس میں بالآخر اپنے کمال کو پہنچی تھی۔

اس آیت میں حکمت سے مراد وہ شعور ہے جو زندگی کو اللہ کے احکام کے تابع کرتا ہے اور مثبت و مفید طرز زندگی بنانے میں انسان کو مدد دیتا ہے اسی وجہ سے علماء نے ملت ابراہیم کو دین و شریعت کا ہم معنی قرار دیا ہے، یعنی ان کا کلچر دین و شریعت کا تقاضا تھا، جیسا کہ قرآن حکیم میں کہا گیا دِيۡنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبۡرٰهِيۡمَ (الانعام ۶ ۱۶۱) = محکم بنیادوں پر قائم دین ہی ملت ابراہیم ہے۔ چنانچہ اس سے افعال طرب اور آلات طرب اور فنون لطیفہ مراد نہیں تھے جیسا کہ لاطینی مفکر سسرو کی پیروی میں یہود ونصاریٰ اور ان سے متاثر ہونے والی دیگر، مغربی اور مشرقی اقوام نے باور کیا

کلچر کی دو قسمیں

ڈارون اور جان لبوک (۱۹۱۳،۱۸۳۴ء) کی طرح دین اور شریعت کو کلچر کہنا تو صریح بے ادبی ہے لیکن عمرانی اعتبار سے ملت کی اصطلاح مثبت اور منفی دونوں معاشرتی کیفیتوں پر حاوی ہے یعنی ایک ملت کفر کی ہے اور ایک ملت ایمان کی ایمانی ملت وہی ہے جو دین وشریعت سے باہر نہ ہو اسی کو قرآن حکیم میں ملت ابراہیم الحنیفیہ کہا گیا ہے اور دین کے عمرانی تقاضوں سے صریح روگردانی کرنے والوں کو ملت کفر = انکاری ملت اور نکاری معاشرہ قرار دیا گیا۔

اس تشریح سے دو مقدمے مرتب ہوتے ہیں تہذیب اور ثقافت بہ معنی کلچر دو صورتوں میں انسانی زندگی میں نمودار ہوتے ہیں ایک تہذیب اور کلچر کافرانہ ہوتا ہے اور دوسرا کلچر اور تہذیب مومنانہ۔ کافرانہ کلچر اور تہذیب کی کوئی اساس نہیں ہوتی انسان کی خواہشات اور نفسانی ترجیحات اور پسند سے مادیت آثار زندگی کا جو طرز متعین ہوتا ہے اسی کو کافرانہ تہذیب اور کافرانہ کلچر کہا گیا ہے اس کے برخلاف مومنانہ تہذیب اور ابراہیمی ملت کی بنیادیں دین وشریعت کے اصول وضوابط پر استوار ہوتی ہیں۔

دین اور شریعت دونوں کے لغوی معنی راستے کے ہیں مگر اصطلاح میں یہ دونوں ہی قوانین اور ضوابط کے مجموعہ کا نام ہیں اسلام کے پانچ ارکان مقرر کئے گئے ہیں ان پانچ ستونوں پر پہلے معاشرہ کی اور پھر تہذیب کی عمارت اٹھائی جاتی ہے۔ پانچوں ارکان کا معاشرتی اظہار قوانین اور ضوابط میں ہوتا ہے توحید ایک رکن اور ستون ہے اس کے ذیل میں قانون یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے کوئی شریک کرتا ہو تو اس کو حسن اخلاق سے سمجھایا جائے اور حسن بیان سے اس غلطی کے ازالہ پر آمادہ کیا جائے توحید کے عملی اظہار کا انتظام مساجد کی تعمیر ان میں پنج وقتہ نمازوں کا اہتمام وہاں پاکی اور وضو کے لیے پانی کا انتظام اس حقیقت کے علمی اثبات کے لیے مدرسوں کا قیام اور ان کا انصرام واہتمام وغیرہ سے متعلق تمام امور معاشرتی قوانین سے تعلق رکھتے

ہیں اسی طرح صلاۃ، زکوٰۃ، صوم اور حج کے قوانین اور طریقے ہیں حلال وحرام کا صرف اعلان کافی نہیں بلکہ ان پر عمل کو یقینی بنانے کے امور بھی قوانین وضوابط کے ذریعہ ہی ممکن ہیں ان قوانین کے نفاذ کے لیے وہ نظام قائم کرنا جس میں حلال اشیاء کی فراہمی کی ضمانت دی جائے بلکہ ایسے افراد بھی بڑی تعداد میں معاشرہ میں موجود رہیں جو پوچھنے والوں کو حرام مکرہ تحریمی، مکروہ تنزیہی، مباح، مستحب اور حلال کا فرق بھی بتاسکیں اور اس فرق کے مطابق اشیاء کی درجہ بندی بھی کرسکیں پھر اس درجہ بندی کے مطابق ضروری ہوتو مطلوبہ اشیاء کی درآمد اور رسد کا انتظام کریں۔

ان امور کے اساسی قوانین تو قرآن وسنت کی نصوص میں آ گئے ذیلی قوانین ائمہ فقہا نے مرتب کردیئے قوانین کی شرح اور موقع اطلاق کی وضاحت مفتی حضرات حسب ضرورت اور حسب موقع کردیتے ہیں اور یہ سب مل کر عام آدمی کو اس کی کم علمی یا بے علمی کے باوجود ایک مثبت اور افادی معاشرتی نظام سے اس طرح مربوط کردیتے ہیں کہ فساد کو راہ نہیں ملتی اور بدعات کا سد باب ہوتا رہتا ہے۔

ان سب کا مقصد کیا ہے؟ ظاہر ہے روزمرہ زندگی کا ایک قرینہ ہی مقصود ہے شریعت کا مقصد یہ ہے کہ ولادت سے تدفین تک کے تمام چھوٹے بڑے معاملات کی تشکیل کو انسان ساختہ رسوم ورواج کے حوالہ کرنے کے بجائے اصول وکلیات دین کے ماتحت اس سلیقہ سے منظم کردیا جائے کہ ہر عمل اللہ کی خوشنودی کا باعث بن جائے اور انسانوں کے لیے بھی مفید ونافع اور باعث راحت ہو یہ کلچر کی مثبت اور افادی شکل ہے یہی ملت ابراہیمی ہے۔ اس کے برعکس جہاں اساسی اور جزوی قانون کو فقط انسانی عقل کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے وہاں بالآخر معاشرتی اور تہذیبی فساد پھیل جاتا ہے اور کبھی بدعات پر کبھی شرک پر اور کبھی ذات باری تعالیٰ کے سفیہانہ انکار پر منتج ہوتا ہے یہ کلچر کی منفی اور سلبی صورت ہوتی ہے۔

اسلام اور سلامتی کی ضمانت

تہذیب کا اسلامی اساسی اصول خود اسلام ہے جس کی عمرانی مراد یہ ہے کہ مسلمان وہ ہے

جس کے ہاتھ اور زبان کے ضرر سے مسلمان محفوظ ہوں (عن حضرت عبداللہ ابن عمرو رضی اللہ عنہما، صحیح بخاری، کتاب الایمان ۱: ۴۸) اس قانون میں ترجیح مسلمان کو دی گئی ہے کیونکہ مسلمان بیک وقت ایک دینی اور ایک تہذیبی اکائی یعنی ایک ملت بناتے ہیں البتہ دیگر احادیث کی روشنی میں یہ قانون عام انسانوں پر بھی منطبق ہوتا ہے اس اصول سے ایسا انسان مراد ہے جس سے کوئی معصیت اور گناہ سرزد نہ ہو اور دوسرے لوگ اس کی ایذا سے محفوظ ہوں قاضی ثناء اللہ پانی پتی (تفسیر مظہری ۱: ۱۷۱) نے اس کی وضاحت میں لکھا ہے کہ اسلام حقیقی سے ایسا ہی اسلام مراد ہے اور یہ درجہ بعد اطمینان نفس کے نصیب ہوتا ہے اس اطمینان کی بہترین صورت باہم تہنیت ہے جسے بطور تہذیبی قانون کے قرآن حکیم میں نافذ کیا گیا ہے۔ پہلے کہا گیا کہ وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ (الانعام ۶: ۵۴) = (اے رسولؐ) اور جب آپ کے پاس ہماری آیات اور ایمان رکھنے والے آئیں تو ان سے کہیے تم پر سلامتی ہو اس کے بعد قرآن حکیم میں دوسری جگہ حکم دیا گیا کہ وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا (النساء ۴: ۸۶) اور جب کوئی تم کو سلام کرے تو تم اس سے زیادہ اچھے الفاظ میں سلام کرو، یا ویسے ہی الفاظ کہہ دو یہی نہیں بلکہ غیر مہذب لوگوں کی کٹ حجتی کا جواب بھی اسی تہنیت سے دینے کی تعلیم ہے: وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (الفرقان ۲۵: ۶۳) اور جب جاہلین جھک بحث کریں تو وہ (مسلمان) کہتے ہیں سلامتی ہو کسی مخاطب کو امن و تحفظ کی ضمانت اور اس سے زیادہ اطمینان دلانے والی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔

انسانوں کے مکمل اطمینان کی ضمانت اسلام کا مکمل جملۂ تہنیت ہے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ = تم پر سلامتی ہو اللہ کی رحمت ہو اور اس کی برکتیں نازل ہوں اس تہنیت کا مکمل جواب ہے وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ = اور تم پر بھی سلامتی ہو اللہ کی رحمت ہو اور اس کی برکتیں نازل ہوں۔ یہ دو اعلان ہیں کہ جو دو شخص باہم ملاقات کر رہے ہیں یا وہ شخص جو کسی مجلس میں شامل ہو رہا ہے وہ کسی بھی دوسری گفتگو سے پہلے ایک دوسرے کو اور پوری مجلس کو پختہ یقین دلا رہے ہیں کہ

دونوں ملاقاتی یا مجلس ایک دوسرے کی طرف سے پوری طرح امن وسلامتی میں ہیں اور ہر متکلم اپنے مخاطب پر اللہ کی رحمت اور برکتوں کی دعاء کے ساتھ آغاز کلام کر رہا ہے اس تہنیت کے بعد ظاہر ہے جو گفتگو ہوگی اس میں فساد کا امکان ہی ختم ہو گیا اور اجتماعی مفاد کی ضمانت حاصل ہوگی حضرت عبداللہ ابن سلام سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا ایُّھَا النَّاسُ اَفْشُو السَّلَام (ترمذی) = اے لوگو سلام کو پھیلاؤ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ بن العاص سے بھی مختلف روایات ہیں کہ رسول اللہ نے حکم دیا ہے افشو السلام بینکم = آپس میں سلام کو پھیلاؤ (عن عبداللہ ابن عمروؓ صحیح بخاری کتاب الایمان ۱:۵۸-۵۹) اور صحیح مسلم کی ایک اور حدیث کا منشاء ہے کہ سلام کرو خواہ سامنے والا شناسا ہو یا اجنبی بخاری و مسلم میں حضرت ابو سعید خدریؓ سے ایک روایت کا مفہوم ہے کہ باہم سلام کرنا آدمی پر بازار کا حق ہے فقہی اصول یہ ہے کہ سلام کرنا سنت ہے اور اس کا جواب دینا واجب یعنی کسی نے سلام نہ کیا تو ترک سنت ہوا لیکن سلام سن کر جواب نہ دیا تو ترک واجب کی وجہ سے گنہ گار ہوا۔

تو تہذیب کا اصل مقصد تمام انسانوں کا امن اور ان کی سلامتی اور معاشرہ میں انفرادی اور اجتماعی حالت میں نزول برکات کی ضمانت ہے اسی لیے ناچ گانا، موسیقی ہڑبونگ، لباس اور کھانوں کی قسمیں شادی بیاہ اور دیگر مواقع کی مسرفانہ یا مشرکانہ رسم و رواج اور خود کاشتہ اعتقادات تہذیب کے زمرہ میں نہیں آتے۔ البتہ ان میں سے بعض باتیں اگر انفرادی اور اجتماعی دل آزاری یا ایذا کا سبب نہ بنیں اور مشرکانہ عناصر سے پاک ہوں تو ہنگامی طور پر انہیں گوارہ کیا جا سکتا ہے جیسے ایک بار عید کے موقعہ پر انصار کی بچیاں ام المومنین حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں کچھ نشیدیں گا رہی تھیں تو رسول اللہ نے انہیں روکا نہیں تھا اگرچہ ان کے گانے میں دلچسپی بھی نہیں لی تھی یا ہجرت کے موقع پر رسول اللہ کی مدینہ تشریف آوری پر انصار کی بچیاں بے ساختہ فی البدیہ استقبالیہ نشید گانے لگیں:

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَیْنَا مِن ثَنِیَّاتِ الْوَدَاع   وَجَبَ الشُّکْرُ عَلَیْنَا مَا دَعَا لِلّٰهِ دَاع
اَیُّھَا الْمَبْعُوثُ فِیْنَا جِئْتَ بِالْاَمْرِ الْمُطَاع   جِئْتَ شَرَّفْتَ الْمَدِیْنَه مَرْحَبًا یَا خَیْرَ دَاع

(ترجمہ) ثنیات الوداع کی پہاڑیوں سے پورا چاند ہم پر طلوع ہوا ہے ☆ ہم پر اس وقت تک اس کا شکر واجب ہے جب تک دعا کرنے والے دعا کرتے رہیں گے ☆ اے وہ جسے اللہ نے ہماری طرف بھیجا ہے قابل اتباع تعلیم کے ساتھ ☆ آپ نے مدینہ کو عزت بخشی اے سب سے اچھے داعی آپ کا خیر مقدم ہے۔

اس وقت اوس و خزرج کی معصوم کمسن بچیوں نے اچانک یثرب کا نام بدل کر المدینہ۔ مدینۃ النبیؐ: نبی کا شہر۔ رکھ دیا اس موقعہ پر بھی ان بچیوں کو اس طرح کے اظہار مسرت سے نہیں روکا گیا۔

تہذیب کی پہلی تہذیبی شرط

اس کے برعکس معاشرہ اگر دوسروں کو ایذا پہنچانے پر استوار ہو تو وہ بے تہذیبی ہے اور اسے بے تہذیب قوم کے ساتھ تباہ یا معدوم کر دیا جاتا ہے چنانچہ تہذیب کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ انسانوں کو ایذا پہنچانے پر قائم نہ ہو بلکہ عوام الناس کے لیے مفید و نافع ہو بالکل یہی اسلام کی عمرانی تعریف ہے اور یہی ملت اسلامیہ ہے یعنی وہ طریقہ جس پر اسلام کے پیروؤں کا میل اور جھکاؤ ہوتا ہے دوسری بات یہ کہ دوسرے انسانوں کو ایذا پہنچانے کا تعلق معصیت سے ہے اور معصیت کفر کی علامات میں سے ہے اور کفر سے تہذیب کا تعلق نہیں ہوتا یعنی انسان میں کافرانہ خصائل جس قدر قوی ہوں گے وہ اتنا ہی ظالم اور موذی یعنی غیر مہذب ہوگا اور اسلامی خصائل جس قدر قوی ہوں گے انسان اتنا ہی رحم دل اور مخلوقات کو نفع پہنچانے والا اور مہذب ثابت ہوگا اسلامی خصائل کی مثال یہ ہے کہ امیر المومنین حضرت عمرؓ کو مسلم و ذمی انسانوں ہی کا نہیں بلکہ فرات کے کنارے بیٹھی ہوئی بکری کی پیاس بجھانے اور بھوک مٹانے کا فکر بھی تھا انہی خوش خصائل کی بناء پر انبیاء کی دو پہچانیں بتائی گئی ہیں ایک یہ کہ وہ معصیت سے پاک ہوتے تھے اور دوسرے یہ کہ اپنی امت کے لیے شفیق اور رحم دل ہوتے تھے یعنی انبیاء ہی اصل میں تہذیبوں کے بانی ہوتے تھے ان کی باغی قومیں نہیں جیسا کہ تاریخ میں عموماً باور کیا جاتا ہے قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے کہا کہ حقیقی اسلام تک

رسائی کا درجہ اطمینان نفس کے بعد نصیب ہوتا ہے یعنی انسان معصیت سے پاک ہو اور مخلوقات کے لیے نافع ہو تو اس کا نفسیاتی نتیجہ خود اس شخص کا اطمینان قلب ہوتا ہے یہ درجہ عام مسلمان بھی حاصل کر سکتا ہے کیونکہ اس مقام تک پہنچنے کے لیے قلب میں ایمان باللہ شرط ہے۔ بے ایمانی کی کیفیت کے ساتھ یہ مقام حاصل نہیں ہوتا۔

بعض مذہب کی بہت بزرگ اور محترم شخصیات کے انتقال کے بعد ان کی نجی زندگیوں کے بارے میں جو مضامین سامنے آتے رہتے ہیں وہ اس لحاظ سے نہ صرف حیرت انگیز ہیں بلکہ ایک مؤمن کے لیے باعث تشویش و افسوس بھی ہیں کہ ان لوگوں کی ساری زندگیاں اندھیروں میں محبوس، جنت و جہنم، تقدیر و حساب کے بارے میں شبہات اور دل کی بے طمینانی کی نذر ہو گئیں یہاں دیگر مذاہب پر کوئی تبصرہ مقصود نہیں بلکہ اس امر کا اظہار ہے کہ دل کا اطمینان حاصل کرنا بہت آسان بھی ہے اور بہت دشوار بھی اس کا حصول یا اس کا فقدان دونوں ہر شخص کے اپنے عمل کا نتیجہ ہوتا ہے، اور وہی عمل اس فرد کی حد تک تہذیب کی تعریف کہلاتا ہے اور تہذیب فقط توحید الٰہی کا معاشرتی اور عمرانی ظہور ہوتی ہے۔

تہذیب کی اسلامی اصطلاح

سادہ الفاظ میں تہذیب سے مراد معاشرہ کی صلاح ہے کیونکہ فلاح کا راست تعلق صلاح سے ہے قاضی ثناء اللہ پانی پتی (تفسیر مظہری ۱:۱۷۳) نے اس موضوع کی مزید وضاحت کی ہے کہ صلاح فساد کی ضد ہے اور بگاڑ اور فساد معاصی سے پیدا ہوتا ہے خواہ معاصی قلب سے متعلق ہوں یا اعضا سے اس لحاظ سے صلاح عصمت سے حاصل ہوگی اور جس قدر عصمت میں کمی ہوگی صلاح میں بھی نقصان ہوگا۔ مَن سَفِهَ نَفْسَهُ (البقرہ ۲: ۱۳۰) سے مراد یہ کہ کوئی بے عقل اور بے وقوف ہی صلاح و فلاح سے سرتابی کرے گا اس آیت میں ملت ابراہیم سے روگردانی کرنے والے شخص کو بے وقوف کہا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تہذیب کی اسلامی اصطلاح ملت ہے یعنی احکام شریعت کا مرتب کیا ہوا وہ معاشرتی نظام جس کی طرف تعمیر کعبہ کے وقت حضرت ابراہیم نے

دعا کرتے ہوئے اس سے پہلی آیت میں اشارہ کیا تھا کہ اے اللہ (اولادِ اسمٰعیل میں) ایک رسول بھیج جو انہیں تیری آیات سنائے انہیں کتاب کا علم اور حکمت سکھائے اور یُزَکِّیْھِمْ = انہیں پاک کرے (البقرہ۲:۱۲۹) کتاب اللہ کے علم وحکمت کا اظہار (تفسیر مظہری ۱:۱۷۲) معارف احکام، سنت نبوی اور فقہ میں ہوتا ہے اور ان سب کا لب لباب معاشرتی زندگی کی تہذیب ہے یُزَکِّیْھِمْ کا لفظ بجائے خود تہذیب کی طرف اشارہ کرتا ہے کیونکہ تہذیب کا مصدر جیسا کہ پہلے بیان ہوا پاک کرنا ہے۔

ایک حدیث (عن ابوذر غفاریؓ، صحیح بخاری، کتاب الایمان ۱:۶۱ کتاب الآداب ۳:۳۹۹) میں پاکبازی کی تعلیم کا ذکر آتا ہے کہ ایک بار حضرت ابوذر غفاریؓ نے کسی بات پر ناراض ہو کر اپنے ایک غلام کو ماں کے نام کی غیرت دلائی رسول اللہؐ کو اس کا علم ہوا تو آپ نے حضرت ابوذرؓ کو منع فرمایا اور ایسے عمل کو جاہلیت قرار دیا اس حدیث کا واضح مطلب یہ ہے کہ گالی دینا اور سب وشتم جاہلیت کی بات ہے اور تہذیب سے خارج ہے اور اسلام یا تہذیب یا ملت حنیف سے اس کا کچھ تعلق نہیں ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور حدیث میں حضرت عبداللہ ابن عمروؓ کا بیان ہے (صحیح بخاری، کتاب الایمان ۱:۶۲) کہ رسول اللہؐ نے منافق کی چار پہچانیں بتائی ہیں امانت دی جائے تو خیانت کرے جھوٹ بولے، وعدہ خلافی کرے اور عہد کرے تو دھوکہ دے اور لڑے تو گالیوں پر اتر آئے جس فرد یا جس قوم میں یہ باتیں پائی جائیں اسے مہذب نہیں کہا جا سکتا اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ منافقین کا گروہ معاشرتی طور پر غیر مہذب اور ملت ابراہیم سے خارج تھا دوسرے معنی ہیں اس گروہ کا تعلق تہذیب اور صلاح وفلاح کی نفی کرنے والی ملت کفر سے تھا۔

دو ملتوں کا بیان

اس سمت میں مزید رہنمائی متذکرہ ایک اہم حدیث نبوی سے ملتی ہے لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ ھَوَاہُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِہٖ (مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن/ادریسی ۱:۵۶) = تم میں سے کوئی مومن ہو ہی نہیں سکتا جب تک اس کی طبعی خواہش میری لائی ہوئی

شریعت کے تابع نہ ہو جائے یہ حدیث تہذیب کا سنگ کلید ہے چونکہ تہذیب کا تمام تر انحصار اور اوامر ونواہی، حلال وحرام، جائز وناجائز مناسب وغیر مناسب مفید ومضر کے علم پر ہے اور یہ عرفان شریعت سے پیدا ہوتا ہے اس لئے ثابت یہ ہوا کہ کوئی قوم مہذب ہو ہی نہیں سکتی جب تک کہ اس کے مادی علوم روحانی علوم کے تابع نہ ہو جائیں پھر جو قوم ان صفات کو حاصل کرلے گی وہ حنیفاً (البقرہ ۲: ۱۳۵) کے لقب سے متصف ہوگی یعنی ایسی ملت ایسی تہذیب جو باطل سے علیحدہ ہو جائے۔

ایسی تہذیب معاصی اور جرائم پر گرفت کرے گی غلطیوں کی نشان دہی اور اصلاح کرے گی مجرموں کو سزا دے گی مظلوم کی دادرسی کرے گی اور اس کا حق واپس دلوائے گی ظلم کا ہاتھ توڑ دے گی پھر خواہ ظالم کتنا ہی بڑا اور اونچے درجہ کا آدمی ہو شاہ ولی اللہ دہلوی (حجۃ اللہ البالغہ / رحمۃ اللہ الواسعہ ۱: ۴۶۴۔۴۶۵: ۲۱۴) نے یہی تمام کام خلیفہ کی ذمہ داریوں میں شمار کیے ہیں اس باب میں خلیفہ اول حضرت ابوبکر الصدیقؓ نے اپنے افتتاحی سرکاری خطبہ میں تہذیب کے ایک اصول کا اعلان کیا تھا۔

''تمہارا کمزور میرے نزدیک قوی ہے جب تک کہ میں اس کا شکوہ دور نہ کردوں اور تمہارا قوی میرے نزدیک کمزور ہے یہاں تک کہ میں اس سے (دوسرے کا) حق واپس نہ لے لوں۔۔۔'' (ابن کثیر، البدایہ والنہایہ ۳: ۵۷۸/۵۷۹/مولانا سعید احمد اکبر آبادی صدیق اکبر ۸۷۔۸۸) صدیق اکبر کا یہ خطبہ قرآن حکیم کی اس آیت کی تفسیر ہے کہ وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدہ ۵ : ۲) = اور نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے کی اعانت کرو اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی اعانت مت کرو۔

صدیق اکبرؓ کے اس سرکاری اعلان کا موازنہ ایک اور ملت اور اُس کی تہذیب اور قانون ملی سے کیا جاسکتا ہے کسی ملک میں محکمۂ انصاف کے سربراہ پر طویل مدت تک ہمکار عورتوں کو جنسی طور پر ہراساں کرنے کا الزام لگایا گیا ایک دن اچانک اس نے ملازمت چھوڑ دی یعنی اسے ہدایت کی گئی کہ خاموشی سے استعفیٰ دے کر الزامات کی زد سے باہر چلا جائے اس کے عوض مبینہ طور پر حکومت کی جانب سے اسے سالانہ تنخواہ سے دوگنی کئی لاکھ کی رقم دے کر سبکدوش کر دیا گیا اپنے

منصب سے یوں اس شخص کی سبکدوشی یقیناً اس ملک کے مروجہ قانون کے مطابق تھی مگر اس قانون کی اخلاقی اور تہذیبی حیثیت سے قطع نظر جواب طلب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ دفتر انصاف کی جن ہمکار عورتوں نے جنسی زیادتی یا ہراسانی کا شکوہ کیا تھا ان کی اشک شوئی اور ان کے انسانی حقوق کا کچھ ذکر تک نہ ہوا اور ملزم معاشرہ سے انعام لے کر باعزت چلا گیا۔

صدیق اکبر حضرت ابوبکرؓ کی حکومت راشدہ میں معاملہ مختلف ہوتا ان کی پہلی سرکاری تقریر یہ سیاسی اصول طے کرتی ہے کہ تہذیب کا پہلا تقاضا عدل ہے اور اگر عدل کو قانوناً نافذ کرنے کی صلاحیت معاشرہ میں باقی نہ رہے تو اسے تہذیب کے بجائے عدم تہذیب کی علامت سمجھا جائے گا پھر چاہے اپنے بارے میں اس کی رائے کچھ بھی ہو۔

تہذیب تیرے دین کا قصہ ہے یا نہیں ملت ترے وجود کا حصہ ہے یا نہیں

کتابیات

القرآن الحکیم: البقرہ ۲ النساء ۴ الانعام ۶ المائدہ ۵ الفرقان ۲۵

بائبل، تکوین ۱۱: ۹

امام بخاریؒ ابوعبداللہ محمد ابن اسمٰعیل (۸۱۰۔۸۷۰ء) الجامع الصحیح/تفہیم البخاری دارالاشاعت کراچی

امام مسلمؒ، ابوالحسین ابن حجاج قشیری (۸۲۱۔۸۷۵ء) الجامع الصحیح ادارہ اسلامیات لاہور ۲۰۰۷ء

امام ترمذیؒ، ابوعیسیٰ محمد (۲۰۸۔۲۷۸ھ/۸۲۳۔۸۹۲ء) جامع ترمذی دارالاشاعت کراچی

امام طبری، محمد ابن جریر، جامع البیان موسسہ الرسالہ بیروت ۲۰۰۰ء

امام بغوی، حسین ابن مسعود معالم التنزیل، دار طیبہ الریاض ۱۹۹۷ء

امام رازی فخرالدین محمد ابن عمر مفاتیح الغیب/التفسیر الکبیر دارالکتب العلمیہ بیروت ۲۰۰۴ء

امام قرطبی محمد ابن احمد الانصاری الجامع لاحکام القرآن دار عالم الکتب الریاض ۲۰۰۳ء

امام بیضاوی، عبداللہ ابن عمر انوار التنزیل دار الفکر بیروت / مکتبہ رحمانیہ لاہور

امام ابوحیان اندلسی۔ البحر المحیط دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۹۹۳ء

قاضی ثناء اللہ پانی پتی تفسیر مظہری دار الاشاعت کراچی ۱۹۹۹ء

مولانا اشرف علی تھانوی بیان القرآن ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان ۱۴۲۶ھ

مولانا شبیر احمد عثمانی (تفسیر عثمانی دار الاشاعت کراچی ۲۰۰۷ء

مولانا محمد ادریس کاندھلوی معارف القرآن / ادریسی مکتبہ معارف شہداد پور سندھ ۱۴۲۲ھ

مولانا مفتی محمد شفیع (معارف القرآن ادارۃ المعارف کراچی ۲۰۰۴ء

مولانا عبد الماجد دریابادی تفسیر ماجدی اکیڈمی آف اسلامک ریسرچ اینڈ پبلیکیشنز لکھنو ۲۰۰۷ء

شعراوی شیخ متولی تفسیر القرآن انٹرنیٹ ایڈیشن

مولانا محمد آصف قاسمی بصیرت القرآن مکتبہ بصیرت قرآن کراچی

عبداللہ یوسف علی دی مینننگ آف دی ہولی قرآن امانہ پبلیکیشنز بیلٹو یل میری لینڈ امریکہ

Yusuf Ali, Abdullah. The Meaning of the Holy Quran Amana Publications. Beltsville MD US.

پکتھال مارماڈیوک محمد گلوریس قرآن انٹرنیٹ ایڈیشن

امام راغب اصفہانی۔ الذریعہ الی مکارم الشریعہ ۱۳۲۲ھ خیرہ مصر

شاہ ولی اللہ دہلوی (حجۃ اللہ البالغہ / رحمۃ اللہ الواسعہ ۱:۲۶۴

غازی مولانا حامد الانصاری اسلام کا نظام حکومت ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۴۳ء

پروفیسر حنفی، شمیم جاوید نامہ، اقبال اور عصر حاضر کا خرابہ ششماہی اقبال ریویو حیدر آباد

اپریل ۲۰۰۸ء

مولانا عبدالحفیظ بلیاوی، المنجد اردو خزینہ علم و ادب لاہور

میریم ویبسٹر ڈکشنری

جیرارڈ او نیل دی ھائی فرنٹیر۔ھیومن کالونیزان سپیس = بعید سرحد :

خلاء میں انسانی نو آبادیاں۔

Gerard K O' Neill, The High Frontier Human Colonies in Space

William Morrow & Co. New York. 1977

روزنامہ ٹورانٹو سٹار Toronto Star

ڈاکٹر نورینہ تحریم بابر

اردو میں تاریخ نگاری کی روایت اور رشید اختر ندوی

تحقیق و توضیح

تاریخ جہان دانش کا اسرار و رموز میں لپٹا ہوا وہ عنوان ہے جس کی تعریف، تعبیر اور توضیح نہ صرف اس کے معنی و مفہوم میں اضافہ کرتی ہے بلکہ اس کے دائرہ اثر میں بھی برابر توسیع کرتی رہتی ہے۔ یوں تاریخ ماضی کے احوال و آثار، وقائع و حادثات، ان کے اثرات و نتائج، انسانی تجربات اور ان کے مآل کے مطالعات کا احاطہ کرتی دکھائی دیتی ہے۔ ایک اچھا تحقیق نگار ماضی کے حال کے ساتھ رشتے اور مستقبل کے لیے اس کی معنویت کا گہرا شعور رکھتا ہے اور اپنے اس شعور کو مطالعۂ ماضی کی بنیاد بناتا ہے۔

اسلامی تاریخ نگاری اپنے دائرہ کار، حدود اور حلقۂ اثر و نفوذ کے اعتبار سے اپنی معنویت کا جداگانہ تعین کرتی ہے۔ یوں تو تاریخ، دراصل تاریخ ہی ہے اور یہی اس کے معنی کی عمومیت بھی ہے۔ تاریخ ماضی، حال اور مستقبل کی تکون کا سب سے بامعنی حصہ خیال کی جانی چاہیے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں ہمارے سمجھنے اور اس سمجھ کو اپنے علم کی بنیاد بنانے کا سب سے زیادہ امکان پایا جاتا ہے۔ اسی لئے یہ کہنا درست ہے کہ تاریخ علم کے بنیادی مصادر میں سے ایک ہے۔ بظاہر اس کا تعلق ماضی سے ہے لیکن اپنے اثرات، پیدا کردہ دانش اور اخذ کردہ بصیرت کے اعتبار سے اس کا رشتہ حال اور مستقبل سے بڑا گہرا ہے۔ عمومی طور پر تاریخ سے مراد گزرے وقتوں کے وہ احوال و واقعات و حوادث ہیں جنہوں نے اقوام و افراد پر اثر انداز ہو کر ان کے ارتقاء کے رُخ اور مزاج کو متعین کیا۔ تاریخ واقعات و

حوادث کے ظاہر کو بہ تفصیل بیان کرتی ہے اور ساتھ ہی واقعات و حوادث کے باطن کو دریافت کرنے کی سعی بھی کرتی ہے۔ تاریخ ہے کیا؟ ڈاکٹر مبارک علی نے وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

"تاریخ کے ہر طالب علم کے لئے یہ سوال انتہائی اہمیت کا حامل رہا ہے کہ تاریخ کیا ہے؟ ہیگل کے نزدیک انسانی تاریخ عقل و شعور کی تاریخ ہے اور اس لئے سوائے انسانی تاریخ کے اور کوئی تاریخ نہیں۔۔۔۔ انسانی تاریخ فکر و عمل کی تاریخ اور انسانی عمل کی تاریخ ہے اس لئے تاریخ کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ صرف یہ نہ دیکھا جائے کہ لوگوں نے کیا کیا بلکہ یہ کہ انہوں نے کیا سوچا؟ ایک زمانہ تک تاریخ کو صرف ماضی کی سیاست سمجھا جاتا تھا۔ سر جان سیلے (Sir John Seeley) نے اس کی تعریف کرتے ہوئے اسے ماضی کی سیاست (Past Politics) کہا تھا۔ ہیگل کے نزدیک بھی تاریخ میں سیاست وہ اہم پہلو ہے کہ جس کے گرد معاشرت و معاش چکر لگاتی ہے۔ مگر اب تاریخ سیاست سے نکل کر معاشیات، عمرانیات، ثقافت، فن، آرٹ بلکہ فنی و سائنسی علوم تک پہنچ گئی ہے۔ کارل مارکس نے تاریخ کے نظریہ میں ایک انقلابی تصور پیش کیا کہ تاریخ میں سیاست مرکزی نقطہ نہیں، بلکہ یہ مرکزی نقطہ معاش ہے۔ معاشی، سیاسی، مذہبی اور فنی تاریخیں ایک دوسرے کے متوازن نہیں چلتیں بلکہ یہ معاش سے متاثر ہو کر اس کے نتیجے میں بنتی بگڑتی ہے" (۱)

سب سے زیادہ قابل توجہ امر یہ ہے کہ ہمیں تاریخ کی طرف کیا چیز متوجہ کرتی ہے، تو اس کا سادہ مگر با معنی جواب یہ ہے کہ ہمیں تاریخ کی طرف ہمارے مستقبل کے امکانات متوجہ کرتے ہیں۔ یوں یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اقوام یا افراد کے لئے تاریخ ازمنہ ثلاثہ کا وہ تسلسل ہے جو کہیں بھی منقطع ہوئے بغیر اپنی تاثیر یا تجربہ، رکاوٹ کے بغیر ایک نسل سے دوسری نسل تک، علیٰ ہذا ایک عہد سے دوسرے عہد تک منتقل کرتا ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی صراحت کرتے ہیں کہ:

"تاریخ کی سب سے بڑی افادیت اس وجہ سے بڑھ جاتی ہے کہ یہ معاشرے کی یادداشتوں کو مجموعی طور پر محفوظ کرتی ہے۔ ایک فرد کی یادداشت کمزور ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی معاشرہ بھی ایک واقعے کو جلد بھول جاتا ہے، اگر ان واقعات کو تاریخ کے ذریعے محفوظ نہیں کیا جائے تو معاشرہ ان کے تجربات کو چاہے وہ اچھے ہوں یا بُرے جلد ہی بھلا دیتا ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان معاشروں میں جہاں جدید تاریخ تشکیل نہیں دی گئی ور جہاں عوام کو جاہل رکھا گیا ہے وہاں سیاسی طور پر وہی اشخاص بار بار اقتدار میں آتے ہیں کہ جو ماضی میں جرائم کے مرتکب ہو چکے ہوتے ہیں..... صرف تاریخ کے ذریعے اس عمل کو روکا جا سکتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تاریخ کے مطالعے سے معاشرہ کو خود آگہی کا احساس ہوتا ہے" (۲)

کیا تاریخ امرِ واقعہ کا نام ہے؟ یہ سوال تاریخ کے ہر طالب علم کے پیش نظر رہتا ہے اور غالباً یہی وہ سوال ہے جس کا نہایت واضح اور متعین جواب، دستیاب نہیں ہوتا۔ ول ڈیورنٹ (Will Durant) کا یہ خیال کہ اکثر تاریخ قیاس آرائی پر مبنی ہے اور باقی ماندہ کی بنیاد تعصب پر ہے(۳) مکمل سچائی کا احاطہ نہیں کرتا۔ مکمل سچائی کی جو تصویر بھی ہو متعدد وجوہ کی بنا پر، اس تصویر کے بعض حصے غیر واضح، یا اندازہ و قیاس پر مبنی ایک تخیّل کی کارفرمائی کا عنصر یا نتیجہ ہو سکتے ہیں۔ جہاں تک تعصب کا تعلق ہے اس کا معاملہ بجائے خود تاریخ سے نہیں، تاریخ نگار یا مؤرخ کے ساتھ ہے۔ عموی طور پر مؤرخ غیر جانب دار نہیں ہوتے یا نہیں ہو سکتے۔ گزرے ادوار کا مطالعہ پہلے شوق اور ذوق اور رجحان طبع کے ساتھ مشروط تھا، اب یہ ایک منظم سائنس یعنی علم کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ بطور علم تاریخ، جس قدر منظم اور مرتب ہوگی، مؤرخ کی موضوعیت اسی تناسب سے معروضیت میں ڈھلتی جائے گی۔ یہ توقع کرنا کہ کوئی صاحب علم کسی قسم کے تصورات، تاثرات یا بعض تعصّبات نہ رکھتا ہو، موزوں اور مناسب بات نہیں ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ جب وہ اپنے شعبۂ علم میں تحقیق کر رہا ہو تو اسے تاریخی تحقیق اور معروضی تجزیہ نگاری کے جملہ تقاضوں کو ضرور پیش نظر

رکھنا چاہیے۔ یہ ممکن ہے کہ ایک فنکار یا تحقیق کار آپ کے معیار یا ذوق پر پورا نہ اُترے۔ یہ دو طرفہ استحقاق ہے جس کا دونوں طرف سے احترام ہونا چاہیے۔ لیکن یہ بالکل لازم نہیں کہ ایک محقق یا اس کی تحقیق آپ کی توقعات پر پوری اُترے، یا خود محقق کے قیاس کے عین مطابق ہو۔ اسی لئے ایک اچھے محقق کو حیران کن نتائج کے لئے ذہنی طور پر تیار رہنا چاہیے۔ تاریخ کا علم انسان کے طرزِ عمل اور اس کے نتائج کا علم بھی ہے۔ یہ قیاس کرنا کہ انسان پر وارد ہونے والے واقعات و حوادث محض اتفاق سے، یا محض غیب کی بے جا مداخلت سے ظہور پذیر ہوتے ہیں درست نہیں، بلکہ یہ افراد و اقوام کا ارادہ اور عمل ہے جو اس پر وارد سلسلۂ حوادث کو جنم دیتا ہے۔ اس سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اگر ماضی کے حوادث کا ذمہ دار ماضی کا انسان ہی ہے تو پھر اس کے تجربے کی افادیت یا اپنے عہد میں اس کے مرتبے کا تعین کس طور کیا جائے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ گزرے دور کے انسان کے تجربات کی افادیت اور اپنے عہد میں اس کے مقام، مرتبے کا تعین ان کامیابیوں سے کیا جائے گا یعنی جو اس نے حاصل کیں، یوں اس بات کو اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ صرف یہ نہیں کہ کیا اور کس طرح سے ہوا، تاریخ یہ بھی ہے کہ کب اور کیا پایا، یا حاصل کیا گیا اور اس کی کیا قیمت ادا کی گئی۔

تاریخ چاہے کتنی ہی قدیم کیوں نہ ہو ایک طرح سے ہمارے اپنے عہد کے ساتھ متصل ہوتی ہے۔ اگر ہم سلسلۂ روز و شب کو زمان کی منقسم صورتوں میں قیاس کریں گے تو تاریخ اور ہمارے مابین اجنبیت اور مغائرت قائم رہے گی لیکن اگر ہم روز و شب کے نقش گر حادثات سلسلے کو زمانِ مسلسل قیاس کریں اور یہ شعور پیدا کر لیں کہ زمان کی کڑیاں آپس میں متصل اور ان کا عمل مسلسل ہے تو پھر ہمیں عہدِ رفتہ اور لمحۂ موجود کے رشتے کا اندازہ یا احساس ضرور ہو جائے گا۔ دراصل اس احساس کی اہمیت فقط یہ ہے کہ ہم تاریخ کا مطالعہ، یا ادراک تاریخ کا بامعنی حصہ بن کر کرتے ہیں تو ہمارا تجزیہ زیادہ قابلِ فہم، کثیر الجہت اور بامعنی نظر آتا ہے۔ اگر تاریخ انسان کا علم ہے تو انسان تو ہم بھی ہیں، اگر تاریخ انسان کے ماحول کے اثرات کا مطالعہ ہے تو ماحول تو ہم پر بھی اثر انداز ہے۔ دراصل

یہی وہ احساس ہے جو علم تاریخ کو ماضی کی دھند سے نکال کر حال کی تیز اور روشن دھوپ میں لے آتا ہے۔ تاریخ ایک حد درجہ افادی اور بے حد منظم علم ہے۔ ڈاکٹر صادق علی گل لکھتے ہیں:

"تاریخ واحد علم ہے جو ماضی کے تمام جذبات، واقعات، مشاہدات اور مواد کے خزانوں کو اپنے دامنِ بیکراں میں محفوظ کیے ہوئے ہے۔ یہی وہ علم ہے جو انسانی تہذیب وتمدن اور فلسفہ وادب کے محلات کو سجائے ہوئے ہے۔ اگر دنیا سے تاریخ کا وجود ختم ہو جائے تو پوری دنیا کے علوم وفنون تاریکی میں دفن ہو جائیں۔ انسان کے تمام تجربات خاک میں مل جائیں۔ ماضی کی یادداشتیں ذہنوں سے کھو جائیں تو ہم خود کو کھوکھلا اور بے جان پائیں گے۔ ہماری زندگی اور تہذیب وتمدن خلا میں معلق ہو کر رہ جائے گی۔ اس لئے معاشرے، اداروں اور مختلف نظاموں کے لئے تاریخ کا ہونا ازحد ضروری ہے کیونکہ تاریخی شعور و تجربات کے بغیر ہم کوئی نیا دستور، قانون، روایات اور اقدار تشکیل نہیں دے سکتے۔ مطالعۂ تاریخ اپنے اندر ہر عہد کے سیاسی، معاشی، مذہبی اور فلسفیانہ افکار ونظریات رکھتا ہے جو ہمیں بتاتے ہیں کہ یہ نظریات کس ماحول اور معاشرے میں پروان چڑھے، کن طبقات کی نمائندگی کرتے تھے اور کن کی ضروریات پوری کرتے تھے اور معاشرے میں یہ کس قسم کی مذہبی سیاسی اور معاشرتی تبدیلیاں اور انقلاب لائے" (۴)

تاریخ بطور علم ہمارا وہ ماضی ہے جو ہمارے حال اور ہمارے مستقبل پر اپنے گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ تاریخ کا منظم مطالعہ ہمیں واقعات وحوادث کے حقیقی محرکات کے معروضی تجزیے اور علت ومعلول کے باہمی رشتے سے آگاہ کرتا ہے۔ دراصل یہی وہ مقام ہے جہاں تاریخ کا علم ہمارے مستقبل کی شکل وصورت پر روشنی ڈالتا نظر آتا ہے۔ تاریخی تجزیے اور تجربے کی بنیاد پر مستقبل کی صورت گری کرنے کی کوشش، اساسی طور پر تخلیقی ہونی چاہیے کہ تاریخی عمل یا تاریخ کی حرکت یکساں، بعض عوامل کی اسیر، اور پہلے سے طے شدہ تقدیر کی پابند نہیں ہے۔ یہ تخلیقی عمل ہے جو ماضی کو حال اور مستقبل کے ساتھ ایک وحدت میں مرتب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سارے

عمل میں بنیادی عامل انسانی ارادہ اور عمل ہے۔ تاریخ دراصل اسی انسانی ارادے اور انسانی عمل کے وقوع اور نتائج کی رزم گاہ خیال کی جانی چاہیے۔

بطور علم تاریخ کی متعدد اقسام ہیں۔ اقسام سے مراد تاریخ کا دائرۂ عمل اور احاطۂ کار ہے یعنی تاریخ کی قسم بیان کرنے سے ہم جان جاتے ہیں کہ اب ہمارے سامنے ہمارے ماضی کے ان گنت بند دروازوں میں سے کون سا دروازہ کھلنے جارہا ہے۔ تاریخ کی ان نمایاں اقسام میں ایک قسم سوانحی تاریخ ہے۔ اس میں ماضی کی اہم، مقتدر، مشہور اور واقعات و حوادث کا باعث بننے والی نامور شخصیات کے حالاتِ زندگی کے حوالے سے تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ دنیا کی تاریخ، عمومی طور پر فرد اور افراد کے حالات ہی کی تفصیل ہے لیکن صرف وہ حالات جن کا وقوع اپنے اندر دیگر ان گنت حوادث کو جنم دینے کی قوت رکھتا ہو۔ اگر یہ بات درست ہے کہ تاریخ دراصل طاقت ور شخصیات کے اعمال و افعال ہی کا نام ہے تو پھر سوانحی تاریخ بنیادی قسم شمار کی جاسکتی ہے وہ لوگ، جو یادرہ جاتے ہیں، دیگر لوگوں سے محض اس وجہ سے الگ، اہم اور ممتاز ہوتے ہیں کہ دوسروں نے جو صرف شاید سوچا ہی ہو، انھوں نے آگے بڑھ کر کر دکھایا، کچھ ایسے کارنامے یا کارہائے نمایاں کر گزرے جنھوں نے بعد میں افراد و اقوام کے لیے مثالی حیثیت اختیار کرلی۔ بانیانِ مذاہب ہوں یا سلطنتوں کو جنم دینے والے فاتحین، سائنس دان ہوں یا نظریات و تصورات کو مربوط انداز میں پیش کرنے والے دانشور، یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو دراصل اپنے ارادے اور اس کے نتیجے میں تخلیق ہونے والے عمل کے ہمہ گیر اور ہمہ جہت نتائج کی بناء پر تاریخ کا اہم حصہ بن جاتے ہیں۔ دراصل ایسے ہی لوگوں کا تذکرہ تاریخ کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔

سوانحی تاریخ میں عمومی پسندیدگی اور وسیع دلچسپی کے ان گنت سامان ہوتے ہیں اور خواص و عوام دونوں کو اپنی سطح اور اپنی افتادِ طبع کے مطابق مواد مل جاتا ہے۔ تاریخ کی یہ قسم رشید اختر ندوی کی پسندیدہ قسم خیال کی جاسکتی ہے۔ انھوں نے بالعموم تاریخ کے نہاں خانوں کی طرف افراد و شخصیات کے توسط سے نظر اٹھائی ہے۔ آغاز سیرتؐ سے ہوتا ہے۔ محمد رسول اللہؐ طبع اوّل اور محمد

سرورِ دو عالمؐ طبع دوم سیرت پر ایک منفرد کاوش خیال کی جاسکتی ہے۔ پھر عمر بن عبدالعزیز، صلاح الدین ایوبی، حیدر علی، اورنگ زیب اور ذوالفقار علی بھٹو کی سیاسی و سوانحی حیات سب اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ سوانحی تاریخ سے رشید اختر ندوی کی حد درجہ دلچسپی ان کے رجحان طبع کی طرف ہی اشارہ نہیں کرتی بلکہ ان کے اُن مقاصد کی طرف بھی متوجہ کرتی ہے جو وہ تاریخ کے بیان سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

تاریخ کی دوسری نمایاں قسم سیاسی تاریخ کہی جاسکتی ہے۔ اس میں اقوام و ملل کے اجتماعی فکر و عمل کے نتائج اور ان کے نوعِ انساں پر اثرات کی سرگزشت رقم کی جاتی ہے۔ لیکن سیاسی تاریخ کے بیان میں نقطۂ نظر بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ کیا یہ نقطۂ نظر، مقتدر قوتوں کا ہے یا عامۃ الناس کا؟ عموماً طور پر سیاسی تاریخ میں مقتدر قوتوں کے زاویہ نگاہ کو مرکزی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے اور عامۃ الناس کے احساسات و خیالات کا ذکر محض حاشیے میں ہی آپاتا ہے۔ تاریخ کے ضمن میں یہ نکتہ سامنے ضرور رہنا چاہیے کہ یہ ہوتی ہی خاص لوگوں، خاص واقعات، خاص تصورات، خاص حوادث کا تذکرہ ہے۔ یہ عام یا عامۃ الناس اگر تاریخ کے حاشیے میں بھی جگہ پاجائیں تو اسے غنیمت خیال کرنا چاہیے۔ رشید اختر ندوی نے اسی طرح کے ایک عام آدمی کی سوانح تحریر کی ہے جو اپنے ارادے اور عمل کی وجہ سے خاص آدمی بن گیا تھا۔ یہ حیدر علی کی سوانح ہے۔ معاشی تاریخ بھی ایک اہم قسم خیال کی جاسکتی ہے۔

تاریخی عوامل کی معاشی تعبیر کے ضمن میں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ رشید اختر ندوی کے لیے تاریخ کا معاشی اسلوب اپنے اندر کشش رکھتا تھا۔ اسلام میں مرکزی حکومت کا تصور اور اس کی معاشی اور اقتصادی ذمہ داریاں' کا اساسی منہاج تاریخ کا یہی اسلوب ہے۔ رشید اختر ندوی نہایت ایمانداری سے خیال کرتے تھے کہ عامۃ الناس کے جملہ معاشی و اقتصادی معاملات و مسائل کے حل کی مکمل ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ رشید اختر ندوی سرمایہ داری، جاگیرداری اور دولت کے ارتکاز کو اسلامی نظم سیاست و ریاست کے منافی خیال کرتے تھے۔ حد

سے بڑھی ہوئی ملکیت و زمین کو رشید اختر ندوی ایک فلاحی زرعی ریاست کے مفاد کے منافی سمجھتے تھے۔ ان کی تالیف 'اسلام میں مرکزی حکومت کا تصور اور اس کی معاشی اور اقتصادی ذمہ داریاں' کا بیشتر حصہ اسی موضوع کی وضاحت کے لئے وقف ہے۔

تاریخ کی ایک اور قابلِ ذکر قسم جنگی تاریخ کہلاتی ہے۔ جنگ و جدل دراصل تاریخ کا ایک مستقل عنصر ہے۔ یہی وہ عنصر ہے جس سے ایک پرانا نظم تمام ہوتا ہے اور ایک نئی ترتیب سامنے آتی ہے۔ قدیم و جدید ادوار میں جنگوں کے جواز اور وجوہات میں کوئی بہت بڑا فرق رونما نہیں ہوا، خطۂ ارضی اور اجتماعی وسائل پر قبضہ، ایندھن کے منابع پر قبضہ، حصولِ زر، حصولِ خوراک اور یہ سب کچھ عموماً کسی دیگر عنوان یا علیحدہ الزام کی صورت میں کیا جاتا ہے۔ جارح طاقتیں جب بھی مقابل فریق کو جنگ میں اُلجھاتی ہیں تو حقیقی وجہ کو پس منظر میں رکھ کر، کسی دیگر امر کو وجہ حرب قرار دیتی ہیں، جیسے کہ کوئی ارفع نظریاتی جواز، عدل و انصاف، اور زندگی کے بارے میں کسی ارفع تصور کی اشاعت و ترویج۔ لیکن امر واقعہ کے طور پر وہی وقوع پذیر ہوتا ہے جس کے لئے کاوش کی گئی ہو، بڑی جنگوں کے نتائج بھی وسیع اور کثیر الجہت ہوتے ہیں۔ یقینی طور پر جنگیں اس حقیقت کا برملا اظہار ہوتی ہیں کہ طاقت ور کی آرزو اور ارادہ ہی مستقبل کا صورت گر ہوتا ہے اور اخلاقی جواز بھی۔

ایک نقطۂ نظر یہ بھی ہے کہ ''امن'' نام کی کوئی کیفیت، جیسا کہ لغوی طور پر جو کچھ مراد اس لفظ سے لی جاتی ہے، وجود نہیں رکھتی۔ جس کیفیت یا جس قسم کی صورتِ حال کو 'امن' سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ دراصل دو صورتوں میں پیدا ہوتی ہے۔ اوّل دو متحارب طاقتوں کے مابین طاقت کا وہ توازن جو دونوں کو جارحیت سے روکے رکھتا ہے۔ دوم کسی ایک فریق کی واضح اور فیصلہ کن برتری جس کو دیگر فریق جانتے اور مانتے ہوں۔

رشید اختر ندوی کے تاریخی شعور سے تاریخ کی اس قسم کی حشر سامانیوں کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ رشید اختر ندوی کی معروف تالیف 'مسلمان اندلس میں' اس کی عمدہ مثال ہے۔ اپنی اس تاریخی تالیف میں رشید اختر ندوی نے اندلس میں مسلمانوں کی عمل کاری اور رزم آرائی کو موضوع

بنایا ہے۔ تاریخ کی مذکورہ بالا چند اقسام کے مجموعی تناظر میں، اگر انسانی معاشروں یا قدیم ادوار کا مطالعہ اس عقلی ترقی کے پیمانے سے کیا جائے جو کسی قابل ذکر ثقافت کے قیام کا باعث بنی ہو، اسے ذہنی تاریخ کا مطالعہ کہا جاسکتا ہے۔ کسی عہد کے اجتماعی ذہنی رویوّں اور ان کے مادی اثرات اور مظاہر کا مطالعہ اسی ذیل میں آتا ہے۔ رشید اختر ندوی کی تواریخ، مغربی پاکستان کی تاریخ جلد اوّل، ارض پاکستان کی تاریخ، اور ارضِ پاکستان کا قدیم رسم الخط، اگرچہ جغرافیے اور آثار کی تاریخ ہے لیکن اس کا مجموعی پھیلاؤ ہمیں ارض پاکستان کی اس ذہنی تاریخ سے آشنا کرتا ہے جو اس خطہ ارض کی خاص انفرادیت شمار کی جاسکتی ہے۔ تاریخی تحقیق کو دستاویزی تحقیق بھی کہا جاتا ہے۔

اس طریقۂ تحقیق میں تین طرح کے مصادر سے اعتنا کیا جاتا ہے۔ اوّل غیر مادی مصادر جن کا تعلق تاریخ سے ہے اور جن کا وجود عامۃ الناس کے رسم و رواج، روایات، معاشرتی ضوابط، اعتقادات، اوہام اور اخلاقی رویے وغیرہ سے ہوتا ہے۔ ان جملہ آثار کو مؤرخ منطق و دلیل سے سمجھنے اور تجزیہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ دوم مادّی مصادر یعنی وہ مادی آثار جو گزرے ادوار کے انسانوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں ان آثار کی تعمیر صدیوں پہلے ہوئی لیکن یہ ابھی تک باقی ہیں اور علم کا ایک ٹھوس ذریعہ بھی۔ ان میں چٹانوں پر کندہ تحریریں، مجسمے، دیواری مجسمہ کاری، عمارات، برتن، ہتھیار، سکے استعمال کی اشیاء وغیرہ شامل ہیں۔

سوم تحریری یا دستاویزی مصادر۔ اگر مادی مصادر کی جانچ پرکھ اور درجہ بندی اور استناد کا تعین آثار قدیمہ کے ماہرین کرتے ہیں تو تحریری مسوّدات کو پڑھنے، سمجھنے، ان کا زمانہ تحریر متعین کرنے اور اسی ذیل میں مختلف ادوار کے کاغذ کی شناخت، زیر استعمال روشنائی کی پہچان اور زمانی تعین، کسی زبان میں طریقۂ تحریر کی ارتقائی صورتوں سے واقفیت، سب دستاویزی تحقیق میں آتا ہے۔ تاریخ کو محفوظ کرنے کی سب سے وسیع اور جامع تر صورت تحریری مسودات ہیں۔ گویا یہ اسی قدر قدیم ہوسکتے ہیں جس قدر تحریر کا علم۔ ان دستاویزات کی مزید دو قسمیں قیاس کی جاسکتی ہیں۔ پہلے غیر سرکاری یا شخصی دستاویزات، اور دوسرے سرکاری دستاویزات۔ رشید اختر ندوی نے اپنے طریقۂ

تحقیق میں ان سب مصادر سے فائدہ اٹھایا ہے۔ان کے اسلوب تحقیق میں جن مصادر کو بنیاد بنایا گیا ہے وہ عمومی طور پر مستند اور مطبوعہ آثار ہیں۔رشید اختر ندوی چونکہ سوانحی تاریخ، جنگی تاریخ اور سماجی و معاشی تحقیق کو عنوان بناتے ہیں اس لیے ان کا رجحان مستند اور مطبوعہ مواد کی طرف نظر آتا ہے۔یقینی طور پر رشید اختر ندوی ایک ماہر آثاریات نہ تھے لیکن تاریخ نویسی کے جملہ تقاضوں سے باخبر ضرور تھے۔

'جہانِ دانش' میں رشید اختر ندوی کا سب سے معتبر حوالہ اور قابلِ ذکر تحقیقی، تصنیفی کام ان کی تاریخ نویسی ہے۔تاریخ سے ان کی دلچسپی اپنے اندر کئی جہات رکھتی ہے۔ایک جہت خالصتاً ذاتی اور جذباتی ہے۔یہ ان کی والدہ محترمہ کی ان کی ذات سے وابستہ توقعات کے حوالے سے ہے جو رشید اختر ندوی کو ندوۃ العلما جیسے مدرسے سے تعلیم حاصل کرنے بھیجتی ہیں اور جن کی آرزو رہی کہ ان کا فاضل فرزند ایک عالم دین بنے۔رشید اختر ندوی ندوۃ العلما میں تعلیم تو مکمل نہ کر پائے لیکن وہاں سے ندوی کی نسبت لے کر نکلے اور پھر مستقل طور پر ندوی بن گئے۔یہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا ماحول اور تعلیم ،ور ڈاکٹر ذاکر حسین کی ہمہ پہلو تربیت ہے جس نے رشید اختر ندوی کو علم تاریخ، فلسفۂ تاریخ اور اطلاق تحقیق سے روشناس کرایا۔یہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت کا اعجاز ہی تو ہے کہ انہوں نے نوجوان رشید اختر کے ذہن میں حال اور مستقبل کے ماضی کے ساتھ رشتے کو صحیح تناظر میں سمجھنے کا شعور پختہ کیا۔وہ تاریخ نویسی کی طرف اس وقت آئے جب وہ اظہار کے متنوع اسالیب سے واقف و آگاہ ہو چکے تھے اور انہیں مقبول رومانی ناول نگاری کرتے ہوئے چند سال بیت چکے تھے۔

رشید اختر ندوی کے تصور تاریخ کو سمجھنے کے لیے ،برصغیر میں بطور مسلمان ان کی شناخت کے اجزا کو سمجھنا نہایت ضروری ہے۔وہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں پیدا ہوئے اور ان کے جوان ہونے تک دنیا دو عظیم جنگیں اور ان کے اثرات دیکھ چکی تھیں۔نہ صرف یہ، بلکہ غلام ہندوستان میں ہر سطح پر بیداری اور آزادی کی تحریکیں پروان چڑھ رہی تھیں۔ملک دو قوموں کی بنیاد

پر تقسیم ہو رہا تھا۔ بطور مسلمان سیالکوٹ کے گاؤں آلو مہار شریف میں پیدا ہونے والے، گوجرانوالہ، لکھنو و دہلی میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے والے رشید اختر ندوی کا تعلق قومیت کے ایک نئے انداز، جدا تصور اور منفرد ترتیب کے ساتھ منسلک تھا۔

قومیت کا یہی تصور برِ صغیر کے مسلمانوں کی سب سے بڑی سیاسی طاقت اور فیصلہ کن عامل بننے والا تھا اور اس طرف اشارہ اور توجہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ رشید اختر ندوی کے تاریخی شعور کا اس تصورِ قومیت سے گہرا تعلق بھی ہے۔

اس تصورِ قومیت کی بنیاد پر تشکیل پانے والی کامل تنظیم اور پھر اس تنظیم میں اتحاد عزائم و مقاصد رشید اختر ندوی کے شعور تاریخ کے اساسی اجزاء ہیں۔ نہ صرف تاریخ بلکہ تخلیقی ادب کی بنیاد بھی رشید اختر ندوی کے ہاں یہی شعور ہے۔ ان کے جملہ رومانی ناول کہ جن پر انہیں زندگی بھر فخر رہا، اسی کشمکش کی تصویریں ہیں جو نا موافق حالات کے ٹکراؤ سے پیدا ہوتی ہیں۔ رومانی ناول نویسی کے چند سال بعد ہی رشید اختر ندوی نے تاریخ نویسی کی طرف توجہ کر لی تھی اور قریباً چھ سال تک وہ یہ دونوں کام ساتھ ساتھ کرتے رہے۔ ان کے ذہنی ارتقاء کے مطالعے میں یہ چھ سال بھی ۱۹۴۵ء سے لے کر ۱۹۵۱ء تک بے حد اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ ایک اندرونی محاربے سے بھی دو چار ہیں۔ بالآخر "جھوٹی کہانیوں" اور اسلامی تاریخ کے معرکے میں، تاریخ جیت جاتی ہے۔ اپنے اندر کے ناول نویس کو مارنے کی بجائے رشید اختر ندوی اسے تاریخی کرداروں پر ناول لکھنے پر آمادہ کر لیتے ہیں اور پھر ان کے جملہ تاریخی ناول ان کے تاریخی مطمحِ نظر کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اس عہد کا تقاضا بھی تھا اور سماجی سطح پر ہندوستان کی مسلم کیمونٹی کے تصورِ قومیت کی تقویت سے متصل و منسلک بھی کہ رشید اختر ندوی تاریخ کو اپنے نظریئے کے مطابق پیش کریں اور تجزیہ کریں۔

یہ سب کچھ رشید اختر ندوی پر بھی اثر انداز ہوا تھا۔ ندوہ کے طلبہ کا کسی سیاسی تحریک یا آزادی ملک کے لئے برپا کی گئی کسی عملی جدو جہد کا حصہ بننا ممکن نہیں تھا۔ لیکن اجتماعی شعور میں برپا طلاطم سے ندوہ کا نظم و ضبط بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ رئیس احمد جعفری ندوی، ندوہ میں رشید اختر کے

ہم جماعت تھے، دونوں دوست بھی تھے اور کم و بیش آگے پیچھے ندوہ تشریف لائے تھے۔ رئیس احمد جعفری ندوی کے حالات میں محمد اسحاق بھٹی لکھتے ہیں کہ:

''۱۹۳۰ء میں ندوہ کے طلباء میں ایک احتجاجی تحریک شروع ہوئی اور ہڑتال تک نوبت پہنچی۔ جس کے نتیجے میں رئیس صاحب کو ندوہ سے نکال دیا گیا اور وہ دہلی جا کر جامعہ ملیہ میں داخل ہو گئے'' (۵)

قیاس چاہتا ہے کہ رشید اختر ندوی بھی اسی دوران اور اسی حوالے سے، جامعہ ملیہ دہلی چلے آئے۔ ہاں البتہ دونوں دوستوں کو ندوہ سے نسبت ہمیشہ عزیز رہی۔ رئیس احمد جعفری کو بھی اور رشید اختر کو بھی۔ دونوں پھر ساری عمر ندوی ہی رہے۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی اور اس کے بعد کا عہد آزادی کی تحریکوں کے عروج کا زمانہ ہے۔ یہ جملہ عوامل جن کا ذکر ہوا، رشید اختر کے تاریخی شعور کا حصہ بنے۔ اس ضمن میں اساسی بات یہ ہے کہ رشید اختر ندوی کے نزدیک تاریخ عقیدے اور دینی تسکین کے جذبے کے تابع ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنے اس احساس اور تاریخ کے بارے میں اپنے اس تصور یا شعور کو کبھی چھپایا نہیں۔ بطور مؤرخ رشید اختر ندوی اس حقیقت سے واقف و آگاہ تھے کہ مؤرخ کا جذبات سے عاری ہونا، رجحان یا عقیدے کی قید سے آزاد ہونا یا ایسا کرنے کا دعویٰ کرنا درست اور موزوں بات نہیں۔

رشید اختر ندوی مؤرخ کے منصب کے بارے میں کسی ابہام کا شکار نہیں تھے اور نہ ہی وہ تاریخ کو عصرِ حاضر کے تناظر سے علیحدہ ہو کر دیکھنے کو موزوں خیال کرتے تھے۔ برصغیر کے مسلمانوں کے لئے اسلامی تاریخ یا مسلمانوں کی تاریخ اپنے اندر نہایت گہرے مطالب اور بے حد بلیغ اشارے رکھتی ہے۔ دراصل برصغیر کے مسلمانوں کے لئے ان کی تاریخ ان کے حسب اور نسب کا متبادل ہے۔ شعوری طور پر رشید اختر ندوی نے یہ کوشش کی کہ وہ تاریخ کو ایک ارفع مقصد کے لئے مرتب کریں اور وہ ارفع مقصد اس کے سوا کچھ بھی نہیں تھا کہ یہاں کے مسلمانوں کو ان کی شناخت (قومیت) کے حوالے سے اعتماد دیا جائے۔ ان کے عزم کو بلند کیا جائے اور مسلمانوں کی

تاریخ میں سے سیرت و کردار کے ارفع نمونے ان کے سامنے پیش کر کے ترغیب دی جائے کہ وہ بھی اپنی زندگیوں کو منظم کرنے کے لئے سیرت و کردار کے ان نمونوں کو مثال بنا کر سامنے رکھیں۔ یہ بیسویں صدی کی تیسری دھائی کی اہم ترین ضرورت تھی اور جیسے جیسے وقت آگے بڑھتا گیا یہ ضرورت بھی دوچند ہوتی گئی۔اور بالآخر یہی تاریخ یہاں کے مسلمانوں کے حال کی سب سے بڑی تقویت اور مستقبل کا سب سے اہم حوالہ بن گئی۔ یہ وہ دور ہے کہ جب برصغیر نے مسلمانوں کی تاریخ کے ادب کا وقیع ذخیرہ جمع کر لیا۔رشید اختر ندوی نے اس ذخیرے میں اپنا حصہ ضرور ڈالا اور اس حصے کی اہمیت وافادیت سے انکار ممکن نہیں۔

نوجوان رشید اختر ندوی ایک تاریخ نویس کے طور پر روایتی طرز، اسلوب اور انداز تاریخ نویسی کے قائل نہیں تھے۔وہ جانتے تھے اور اچھی طرح سے سمجھتے تھے کہ تاریخ ماضی کی بے جا پرستش کا نام نہیں۔تاریخ میں واقعات وحالات کی اہمیت مسلم،لیکن اصل اہمیت اور معنویت اس بصیرت اور فراست کی ہے جوان واقعات وحالات کے نتائج کے طور پر سامنے آئی اور آئندہ زندگی کا بامعنی اثاثہ بنی۔اپنے شعور تاریخ کا تجزیہ وہ خود کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"میں تاریخ کے پرانے انداز کا قائل نہیں ہوں، میں واقعات وحالات کے تسلسل کو ضروری نہیں سمجھتا۔ان کی نوعیت اور کیفیت میرے نزدیک زیادہ اہم ہے" (۲)

نوعیت اور کیفیت سے غالباً یہی مراد ہے کہ وہ واقعات وحالات اپنے اندر معنی آفرینی کے کس قدر پہلو پنہاں رکھتے ہیں۔کچھ یہی زاویہ نظر ہے جس سے رشید اختر ندوی نے مسلمانوں کی جملہ سیاسی، سماجی اور تہذیبی تاریخ کو عنوان بنایا ہے۔رشید اختر ندوی نے مسلمانوں کی تاریخ پر سات مربوط منصوبے مکمل کیے۔ان میں پہلا 'طلوع اسلام' کے زیر عنوان چار جلدوں پر مشتمل اسلامی تاریخ کا منصوبہ ہے۔یہ کتب 'تاریخ تاج کمپنی' کے زیر اہتمام ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۹ء تک شائع ہوئیں۔دوسرا منصوبہ اندلس میں مسلمانوں کی تاریخ پر مشتمل تھا یہ ایک ضخیم جلد کی صورت ۱۹۵۰ء میں 'مسلمان اندلس میں' کے زیر عنوان منظر عام آیا۔ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور

کے زیر اہتمام 'تہذیب وتمدن اسلامی' کے زیر عنوان تین جلدوں پر مشتمل مسلمانوں کی تہذیبی ترقیات کا مجموعہ بالترتیب ۱۹۵۱ء، ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۵۵ء میں 'مسلمان حکمران' کے زیر عنوان اسلامی اصول حکمرانی اور نظم ونسق پر ایک مربوط ومنظم کتاب مرتب کی۔ 'خلافت راشدہ اور جمہوری قدریں' کے زیر عنوان ایک ضخیم تاریخ ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی۔ اسلام میں مرکزی حکومت کا تصور اور اس کی معاشی واقتصادی ذمہ داریاں ۱۹۷۵ء میں منظر عام پر آئی۔

رشید اختر ندوی نے ارض پاکستان کے مورخ کے طور پر کل چار تحقیقی منصوبے مکمل کیے۔ 'مغربی پاکستان کی تاریخ' جلد اوّل مرکزی اردو بورڈ لاہور کے زیر اہتمام ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی۔ دوسری جلد 'ارض پاکستان کی تاریخ' کے زیر عنوان ۱۹۸۷ء میں شائع ہوئی۔ اس سلسلے کی تیسری تالیف 'شمالی پاکستان' ہے جو ۱۹۹۰ء میں منظر عام پر آئی۔ 'پاکستان کا قدیم رسم الخط اور زبان' قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت کے زیر اہتمام رشید اختر ندوی کی وفات کے بعد ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی۔ اور یہ ارض پاکستان کی تواریخ کے سلسلے کی آخری تالیف ہے۔ (۶)

رشید اختر ندوی کی تاریخ نگاری کا ایک پہلو ان کی تاریخی سوانح نگاری ہے۔ انہوں نے مجموعی طور پر چھ تاریخی شخصیات کی مستند سوانح تالیف کیں۔ اس سلسلے کی پہلی سوانح 'اورنگ زیب' کے زیر عنوان ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی۔ ۱۹۵۳ء میں 'صلاح الدین ایوبی' اور ۱۹۵۷ء میں 'عمر بن عبدالعزیز' کی سوانح منظر عام پر آئیں۔ ۱۹۵۹ء میں رشید اختر ندوی نے سیرت کے موضوع پر 'محمدؐ رسول اللہ' کے عنوان سے ایک ضخیم جلد شائع کی۔ سیرت کی یہی کتاب بعض ترامیم کے ساتھ 'محمدؐ سرور دو عالمؐ' کے عنوان سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی۔ سیرت کی اس کتاب پر بعض اعتراضات کیے گئے، جن کو رشید اختر ندوی نے دور کر دیا تھا۔ میسور کے عظیم حکمران اور سلطان ٹیپو شہید کے والد حیدر علی کی سوانح ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی۔ رشید اختر ندوی کی مرتب کردہ آخری سوانح معاصر تاریخ کی ایک نادر شخصیت ذوالفقار علی بھٹو پر تھی۔ یہ سوانح دو ضخیم جلدوں کی صورت میں 'ذوالفقار علی بھٹو کی سیاسی سوانح حیات' حصہ اوّل اور حصہ دوم کے زیر عنوان بالترتیب ۱۹۷۴ء، ۱۹۷۵ء میں شائع

ہوئی ہیں۔(۸)

بطور مؤرخ رشید اختر ندوی امر واقعہ اور عقیدے کے فرق کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ تو ممکن نہیں کہ کسی مؤرخ کا کوئی عقیدہ نہ ہو، یا سیاسی رجحان نہ ہو، لیکن وہ جانتے تھے کہ مؤرخ کے عقیدے اور سیاسی رجحان کو تفسیر تاریخ پر اثر انداز نہیں ہونا چاہیے۔ انہوں نے اپنے اسلوب تاریخ نویسی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''میں نے عام مسلمان مؤرخوں کی طرح کسی خاص عقیدے یا کسی خاص سیاسی زاویے کی پابندی نہیں کی اور نہ یہ میرا مسلک ہے۔ میں ایک عام گنہگار مسلمان ہوں۔ مسلمان ماں باپ کے گھر پیدا ہوا، اسلامی درسگاہوں میں تعلیم پائی۔ مسلمان معلموں سے اسلامی تاریخ پڑھی اور زیادہ تر مسلمانوں کی لکھی ہوئی تاریخی کتابیں دیکھیں۔ مگر میری یہ تالیف ایک اس شخص کی تالیف ہوگی جو محاسن کے بیان کو کافی نہیں سمجھتا۔ جو غلطیوں، کوتاہیوں اور برائیوں کا ذکر بھی اسی ذوق کے ساتھ کرتا ہے جس شوق سے محاسن کو گنواتا ہے۔ اس لئے کہ میرے نزدیک جہاں محاسن کا ذکر ضروری ہے وہاں کوتاہیوں اور لغزشوں کی داستان بھی قابل بیان ہے۔ یہ دونوں چیزیں قومی تعمیر کے لئے ایک جیسی اہمیت رکھتی ہیں۔ مسلمان قوم بہت گرتی جا رہی ہے، کبھی وہ وقت تھا جب مسلمان سب سے اونچے تھے اور وہ وقت بھی آیا جب مسلمان اپنے لئے ہی باعث شرم بن گئے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ وقت بہت بعد میں آیا لیکن میرے نزدیک یہ وقت خلافتِ راشدہ کے خاتمہ کے بعد ہی شروع ہو گیا'' (۹)

محاسن کے ساتھ معائب کے بیان یعنی خوبیوں کے ساتھ خامیوں، اچھائیوں کے ساتھ ساتھ برائیوں کی طرف اشارہ ہی تاریخی معروضیت کو جنم دیتا ہے۔ تاریخ میں، دراصل، سب کچھ ہوتا ہے۔ روشن بھی اور تاریک بھی۔ بس یہ تاریخ نویس کے تصور یا شعور پر منحصر ہے کہ وہ تاریخ کے اجزاء سے کس طرح کی تصویر بنا کر دکھا دیتا ہے۔

بطور مسلمان مؤرخ، رشید اختر ندوی اپنے مطمحِ نظر کو بھی نہیں چھپاتے، وہ برملا کہتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو اپنی تاریخ کے جبر کا غلام بنانے کی بجائے ان کی تاریخ کو ان کے لئے تقویت کا عنوان بنانا چاہتے تھے۔ انہوں نے شعوری طور پر کوشش کی کہ اس انحراف کو تلاش کیا جائے جہاں سے مسلمانوں کے ہمہ جہت زوال کا آغاز ہوا اور دنیا کو انسانی آزادی، مساوات اور اخوت کا درس دینے والے مسلمان خود ملوکیت اور شخصی بادشاہت کی علامت بن گئے۔ رشید اختر ندوی کا تجزیہ یہ ہے کہ ہماری تاریخ میں یہ انحراف امیر معاویہؓ نے کیا تھا۔ رشید اختر ندوی لکھتے ہیں کہ:

''جناب امیر معاویہؓ نے ریل کی پٹری کا کانٹا کچھ ایسا بدلا کہ اسلامی گاڑی سمت مخالف کی طرف بھاگنے لگی۔ ملوکیت اسلام کے بالکل متضاد چیز تھی۔ جناب امیر معاویہؓ کے طرزِ عمل سے مسلمانوں میں ملوکیت آگئی اور مسلمان اپنی دنیوی سربلندیوں کے باوجود وہ نہ رہے جیسے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے'' (۱۰)

اسلامی تاریخ کے حوالے سے یہ رشید اختر ندوی کا نہایت سوچا سمجھا موقف اور استدلال ہے۔ وہ اسلام اور ملوکیت کو دو متضاد انتہاؤں پر دیکھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اس ملوکیت نے اسلام کے روشن جمہوری چہرے پر گرد ڈال دی تھی اور پھر صدیوں تک مسلمان تاریخ میں اپنا وہ کردار ادا نہ کرسکے جو وہ کرسکتے تھے۔ اسی ضمن میں رشید اختر ندوی اپنی معاصر سیاسی تحریک اشتراکیت کو بھی ایک ردِ عمل خیال کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ دنیا کا ایک بڑا حصہ مسلمانوں کی اندرونی زندگی سے گھبرا کر کمیونزم کی طرف مائل ہو رہا ہے۔

مسلمانوں کی تاریخ کی اس تعبیر پر بحث کی جاسکتی ہے لیکن اس سے رشید اختر ندوی کی اس وابستگی، والہانہ پن اور اعتماد کا اظہار ضرور ہو جاتا ہے جو انہیں اسلام سے بطور ایک سیاسی اور تہذیبی نظام کے تھی۔ وہ اسلام میں ملوکیت کی مداخلت کو جملہ سیاسی و عمرانی خرابیوں کا ذمہ دار خیال کرتے تھے۔ لکھتے ہیں کہ:

''اگر اسلام میں ملوکیت نہ آتی تو آج کمیونزم عالمِ وجود میں نہ آتا اور دنیا کا ایک بڑا حصہ

مسلمانوں کی اندرونی زندگی سے گھبرا کر کمیونزم کے دامن میں پناہ نہ لیتا۔۔۔ میں یہ بات اچھی طرح واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اسلام کو دنیا کے امراض کا سب سے عمدہ اور بہتر نسخہ ماننے کے باوجود کمیونزم کے بانیوں میں کمیونزم کے جراثیم کیوں پیدا ہوئے۔ میرے نزدیک اس جرم کے مرتکب وہ مسلمان ہیں جنہوں نے اسلام کے دامن میں ملوکیت کا بُت چھپا لیا اور اسے اس طرح پوجنے لگے جس طرح دوسری قومیں پوجتی چلی آئی ہیں" (۱۱)

اس انداز نظر سے رشید اختر ندوی کے اسلامی تاریخ نویسی کے رجحانات کا اندازہ اچھی طرح سے لگایا جا سکتا ہے۔ بطور مؤرخ رشید اختر ندوی اپنے طرز فکر کا برملا اظہار کرتے ہیں وہ خود کو تاریخ کا ایک جانب دار طالب علم قرار دیتے ہیں۔ بطور تاریخ نویس اپنے منصب کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"۔۔۔ میں یقیناً تاریخ کا ایک جانب دار طالب علم ہوں اور صرف ان ہی تاریخی شخصیات پر قلم اُٹھاتا ہوں جن سے مجھے عقیدت ہوتی ہے اور جو میرے منتہائے نظر کی سو فیصد ترجمان ہوتی ہیں۔ میں نے اورنگ زیب کی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ صلاح الدینؒ ایوبی اور حیدر علی کی سوانح حیات صرف اس لئے لکھیں کہ وہ میری آئیڈیل شخصیتیں ہیں اور میں نے ان کی سیرت کو عوام کے سامنے لا کر عوام کو دعوت دی ہے کہ وہ بھی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، صلاح الدینؒ، اورنگ زیبؒ اور حیدر علی کے کرداری سانچے میں خود کو ڈھالیں۔ حتیٰ کہ میں نے جناب عمر بن عبدالعزیزؒ پر قلم اُٹھانے سے پہلے محمد سرور دو عالمؐ، تہذیب و تمدن اسلامی، مسلمان حکمران، مسلمان اندلس میں اور خلافت راشدہ اور جمہوری قدریں کے عنوان سے تاریخ کی پانچ معیاری کتابیں بھی کسی تاریخی تحقیقی جذبہ و شوق کی وجہ سے نہیں لکھی تھیں۔ میں نے بلاشبہ ان کی تصنیف کے وقت بڑی محنت و مشقت کی حد درجہ تاریخی جستجو کو استعمال میں لایا اور پورے مشرق وسطیٰ کے کتاب خانوں کو چھان ڈالا۔ مگر میں نے یہ پانچوں معیاری تاریخی کتابیں محض اپنے عقیدے، محض اپنی دینی تسکین، محض اپنی

محبوب شخصیتوں سے بے پناہ عقیدت اور عشق کی حد تک محبت کی بنا پر تصنیف کی تھیں۔ یوں بھی جدید و قدیم دور کے مؤرخین میں سے کسی ایسے مؤرخ کا نام پیش نہیں کیا جا سکتا ہے جس نے تاریخ کو موضوع بناتے وقت اپنی دینی یا ذہنی تسکین کا سامان مہیا نہیں کیا ہے"(۱۲)

دینی اور ذہنی تسکین سے مراد غالباً یہ ہے کہ کسی ارفع مقصد، اعلیٰ نصب العین کی خاطر اپنی کمیونٹی کی اجتماعی یادداشت میں مثبت، امید افزا اور بامراد واقعات کو تازہ کیا جائے اور جیسا کہ پہلے ذکر ہوا کہ سیرت و کردار کے مثالی نمونے ان کے سامنے پیش کیے جائیں۔ اس مقصد کے لئے اسلامی تاریخ اور برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ رشید اختر ندوی کی دلچسپی کے میدان ہیں۔ اسلامی تاریخ میں عرب مؤرخین کی اولیت اور کاوش کو بنیادی مصادر کی حیثیت حاصل ہے۔ رشید اختر ندوی اسلامی تاریخ کے تناظر میں، عرب مؤرخین کے کردار کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں۔

"۔۔۔ یہ دعویٰ کوئی غلط دعویٰ نہیں ہے کہ عرب مؤرخین اس صفحہ عالم کے پہلے مؤرخین قرار دیئے گئے ہیں۔ وہ فنِ تاریخ کے بانی ہیں۔ یہ صرف وہ ہیں جنہوں نے باقاعدہ تاریخ نویسی کا آغاز پہلے پہل کیا تھا اور معیاری تاریخ نویسی کی طرح ڈالی تھی۔ ورنہ اس سے پہلے رومی ساسانی حتیٰ کہ یونانی تہذیب و تمدن پر کوئی مرحلہ ایسا نہیں آیا تھا جبکہ اس کے علماء نے تاریخ نویسی کو ایک فن کے طور پر اختیار کیا ہو اور کوئی ایسی کتاب تصنیف کی ہو جسے ہم علم تاریخ کی بنا قرار دے سکیں اور کہہ سکیں کہ یہ کتاب تاریخ کی پہلی یا دوسری کتاب ہے یہ صرف عرب مؤرخین ہیں جن کی تصانیف فنِ تاریخ کی اساس ہیں اور جن کی کتابوں کو تاریخ کی پہلی دوسری یا تیسری کتاب ٹھہرایا جا سکتا ہے اور یہ کہنا بھی حقیقت کا اعتراف کرنا ہے کہ ان عرب مؤرخین میں سے پہلے، دوسرے، تیسرے، چوتھے، پانچویں حتیٰ کہ چھٹے اور اس کے مابعد کے سارے مؤرخین نے تاریخ نویسی کا کام اس لئے کیا تھا کہ وہ حضور سرورِ دو عالمؐ اور اسلام سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے اور ان کی دلی خواہش تھی کہ حضور اکرمؐ کی سیرتِ پاک اور اسلام کی جدوجہد کو آنے والی نسلوں کے حوالے کر جائیں۔

اہلِ علم سے یہ بات بھی پوشیدہ نہیں ہے کہ علم تاریخ کے پہلے بانی جناب امام مالکؒ اور ابن اسحاق ہیں۔ اول الذکر کی تصنیف 'موطا' گو تاریخ میں نہیں حدیث میں شامل کی گئی ہے مگر اس کتاب کی دونوں حیثیتیں مسلّم ہیں۔ امام مالکؒ اور ابن اسحاقؒ دونوں ہم عصر تھے یہ دونوں پہلے عرب مؤرخین ٹھہرائے جاسکتے ہیں۔ دوسرے مؤرخ ابن ہشام اور ابن سعد ہیں جن کا پایہ استناد امام مالکؒ سے ملتا جلتا ہے۔ (۱۳)

مسلمانوں کی تاریخ سے رشید اختر ندوی کا یہ معنوی تعلق بڑا گہرا ہے۔ جناب رسالت مآبؐ کی ذات پاک سے وابستگی کو رشید اختر ندوی اپنے لئے تقویت کا سامان خیال کرتے ہیں۔ سیرت پر ان کی تالیف محمد سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی عمدہ مثال ہے۔ اگرچہ اس تالیف پر اس کے بعض مصادر کے حوالے سے رشید اختر ندوی کے استناد سے اختلاف کیا گیا لیکن رشید اختر ندوی نے اسے بحث ونزاع کا عنوان بنانے کی بجائے فوری طور پر مجوزہ ترمیم وتصحیح کر لی۔ وہ اپنے ارفع مقصد سے نگاہ نہیں ہٹاتے، نہ ہی اس تعلق کو نگاہوں سے اوجھل ہونے دیتے ہیں جو ایک مسلمان کو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مبارک سے ہے۔ یہی رویہ بطور مؤرخ رشید اختر ندوی کے طرز فکر اور منہاج عمل کا تعین کرتا ہے۔

حواشی/حوالے

۱ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور فلسفہ تاریخ (لاہور: تاریخ پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء) ص ۱۹

۲ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور ریاست (لاہور: تاریخ پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء) ص ۹

۳ Will Durant, The Lesson of History (California ،۱۹۶۸ء)

۴ صادق علی گل، ڈاکٹر، فن تاریخ نویسی، ہوم سے ٹائن بی تک (لاہور: پبلشرز ایمپوریم، اشاعت سوم، اپریل ۲۰۰۲ء) ص ۲۴

۵ محمد اسحاق بھٹی، بزم ارجمنداں (لاہور: مکتبہ قدوسیہ، ۲۰۰۶ء) ص ۳۶۹

۶ رشید اختر ندوی، طلوع اسلام، حصہ اوّل (لاہور: تاج کمپنی لمیٹڈ، طبع اوّل، ۱۹۴۵ء) ص ۵۔۶

۷ ان جملہ کتب تاریخ کی بالترتیب اشاعت کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۸ رشید اختر ندوی

۔۔۔طلوع اسلام، حصہ اوّل (لاہور: تاج کمپنی لمیٹڈ، باراوّل، ۱۹۴۵ء)

۔۔۔۔طلوع اسلام، حصہ دوم (لاہور: تاج کمپنی لمیٹڈ، باراوّل، مئی، ۱۹۴۵ء)

۔۔۔طلوع اسلام، تیسرا حصہ (لاہور: تاج کمپنی لمیٹڈ، باراوّل ، ۱۹۴۶ء)

۔۔۔طلوع اسلام، حصہ چہارم (لاہور: تاج کمپنی لمیٹڈ، باراوّل، جولائی، ۱۹۴۹ء)

۔۔۔طلوع اسلام، حصہ چہارم (لاہور: تاج کمپنی لمیٹڈ، باراوّل، جولائی ، ۱۹۴۹ء)

۔۔۔مسلمان اندلس میں (لاہور: احسن برادرز، طبع اوّل، ۱۹۵۰ء)

۔۔۔ (اسلام آباد: ادارہ معارف ملی، اشاعت اوّل، ۱۹۶۶ء)

۔۔۔تہذیب و تمدن اسلامی ، حصہ اوّل (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، طبع اوّل، ۱۹۵۱ء)

۔۔۔تہذیب و تمدن اسلامی ، حصہ دوم (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، طبع اوّل ، ۱۹۵۲ء)

۔۔۔تہذیب و تمدن اسلامی ، حصہ سوم (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، اشاعت اوّل ، ۱۹۵۳ء)

۔۔۔مسلمان حکمران (لاہور: احسن برادرز، طبع اوّل، ۱۹۵۵ء)

۔۔۔خلافتِ راشدہ اور جمہوری قدریں (لاہور: ادارہ معارف ملی، اشاعت اوّل، ۱۹۶۶ء)

۔۔۔اسلام میں مرکزی حکومت کا تصور اور اس کی معاشی و اقتصادی ذمہ داریاں، (اسلام آباد: ادارہ معارف ملی، طبع اوّل، ۱۹۷۵ء)

رشید اختر ندوی،

۔۔۔ مغربی پاکستان کی تاریخ جلد اوّل (لاہور: مرکزی اردو بورڈ، اشاعت اوّل، نومبر، ۱۹۶۵ء)

۔۔۔ارض پاکستان کی تاریخ، جلد اوّل، جلد دوم (اسلام آباد: ادارہ معارف ملی، مارچ ، ۱۹۸۷ء)

۔۔۔شمالی پاکستان (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء)

۔۔۔پاکستان کا قدیم رسم الخط اور زبان (اسلام آباد: قومی ادارہ برائے تحقیق و تاریخ و ثقافت، طبع اوّل، ۱۹۹۵ء)

۸ رشید اختر ندوی کی سوانح نگاری کی بالترتیب اشاعت کی تفصیل حسب ذیل ہے:

رشید اختر ندوی،

۔۔۔اورنگ زیب (لاہور: احسن برادرز، طبع اوّل، ۱۹۵۲ء)

۔۔۔صلاح الدین ایوبی (لاہور: احسن برادرز، بار اوّل، ۱۹۵۳ء)

۔۔۔عمر بن عبدالعزیز (لاہور: احسن برادرز، طبع اوّل، جولائی، ۱۹۵۷ء)

۔۔۔محمد رسول اللہؐ (لاہور: قومی کتب خانہ ، بار اوّل، ۱۹۵۹ء)

۔۔۔محمد سرورِ دو عالمؐ (لاہور: ادارہ معارف ملی، طبع دوم، یکم نومبر، ۱۹۶۵ء)

۔۔۔حیدر علی (لاہور: قومی کتب خانہ، بار اوّل، جنوری ، ۱۹۶۶ء)

۔۔۔ذوالفقار علی بھٹو، سیاسی سوانح حیات، حصہ اوّل (اسلام آباد: ادارہ معارف ملی، ۱۵، دسمبر، ۱۹۷۳ء)

۔۔۔۔ذوالفقار علی بھٹو، سیاسی سوانح حیات، حصہ اوّل (اسلام آباد: ادارہ معارف ملی، ۲۵ مارچ، ۱۹۷۵ء)

۹ رشید اختر ندوی، طلوع اسلام، حصہ اوّل، ص ۶

۱۰ رشید اختر ندوی، طلوع اسلام، حصہ اوّل، ص ۷۔۶

۱۱ رشید اختر ندوی، طلوع اسلام، حصہ اوّل، ص ۷

۱۲ رشید اختر ندوی، ذوالفقار علی بھٹو کی سیاسی سوانح حیات، پہلا حصہ (اسلام آباد: ادارہ معارف ملی، طبع اوّل، دسمبر ۱۹۷۴ء) ص ۵۔۶

۱۳ رشید اختر ندوی، ذوالفقار علی بھٹو کی سیاسی سوانح حیات، پہلا حصہ، ص ۶۔۷

ڈاکٹر محمد شہاب الدین۔علی گڑھ (انڈیا)

حج کے سفرناموں میں حجاز کی سماجی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے نقوش

اردو میں حج نامہ نگاری کی تاریخ ۱۸۴۸ء سے شروع ہوتی ہے، جب سید شاہ عطا حسین فانی گیاوی نے ''دید مغرب المعروف بہ ہدایت المسافرین'' (قلمی) کے نام سے اپنا حج نامہ تحریر کیا۔ البتہ اردو کا اوّلین مطبوعہ حج نامہ ۱۸۷۱ء میں ''ماہ مغرب المعروف بہ کعبہ نما'' کے نام سے میرٹھ سے طبع ہو کر سامنے آیا، جس کے مصنف حاجی منصب علی خان تھے ''دید مغرب'' سے حج نامہ نگاری کا شروع ہونے والا سلسلہ اس قدر فروغ پایا کہ تا حال اردو میں لکھے جانے والے حج ناموں کی تعداد چار سو سے متجاوز ہو چکی ہے۔

حج ناموں کے مصنفین نے ارضِ حجاز کو نہایت عقیدت ومحبت سے دیکھنے اور یہاں کے ہر منظر کو جزو حج نامہ بنا لینے کی کوشش کی ہے، چنانچہ جہاں انھوں نے خشکی اور سمندری سفر کے احوال، قرنطینۂ کامران کے حالات ومشکلات، حجاز کے صحرائی سفر کی صعوبات، کعبہ، مکہ مکرمہ، مقاماتِ حج، مدینۂ منورہ اور دیگر مقامات کے حالات وواقعات کو اپنے داخلی تاثرات وکیفیات کے ساتھ حج ناموں میں پیش کیا ہے، وہیں انھوں نے حجاز کی جغرافیائی صورتِ حال، تاریخ اور سیاسی منظرنامے کے ساتھ ساتھ وہاں کی سماجی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی کی تصویر کشی پر بھی خوب توجہ کی ہے۔ حج ناموں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید عہد کے حج نامہ نگاروں کے مقابلے میں ابتدائی اور درمیانی عہد کے مصنفین حج نامہ کے یہاں یہ رجحان بہت زیادہ نمایاں ہے۔

حج ناموں میں حجاز کی سماجی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے نقوش تلاش کیے جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بدوؤں کی قتل وغارت گری، ان کے رویّوں اور خصوصیات کی تصویر کشی کی کوشش

بہت نمایاں ہے۔ اسی کے ساتھ مصنفین حج نامہ نے اہلِ حجاز کے لباس، طرزِ زندگی، مکانات کی تعمیر، شادی بیاہ کے احوال، کثرت طلاق، قہوہ خانوں اور حمام کے تذکروں کو اپنے حج ناموں میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مذکورہ زندگی کی تصویر کشی کے تحت انھوں نے اہلِ حجاز کے یہاں عید کی رسوم اور اس کی تہذیبی حیثیت، رمضان کے تبدیل شدہ معمولات، لڑکوں کے ختنے اور بردہ فروشی کے رواج کا ذکر بھی کیا ہے۔ بعض حج ناموں میں ترکی عہد میں قبروں پر قبوں کی موجودگی، وہاں انجام دی جانے والی بدعات، مکہ و مدینہ میں محفل میلاد کے انعقاد اور جدہ میں شراب کی دوکانوں کی موجودگی کے تذکرے بھی نظر آتے ہیں۔ آئندہ سطور میں حجاز کی سماجی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے نقوش اور حقائق کے مطالعے کی کوشش کی جارہی ہے۔

بدّوؤں کی قتل وغارت گری

اُنیسویں صدی کے نصف آخر سے بیسویں صدی کے وسط تک لکھے جانیوالے حج ناموں میں بدّوؤں کے ذہن و مزاج، رویوں، کردار، خصوصیات اور ان کی ابتر سماجی حالت کے تذکرے نمایاں شکل میں نظر آتے ہیں۔ بدوؤں کے حالات اس کثرت سے حج ناموں میں لکھے گئے ہیں کہ اس عہد کا شاید ہی کوئی حج نامہ ان کے تذکرے سے خالی ہو۔ ان حج ناموں میں ان کی تصویر کا غالب حصہ منفی ہے۔ دراصل، اُنیسویں صدی کے نصف آخر سے بیسویں صدی کے ربع اوّل تک کے تقریباً پچھتر سالہ عرصے میں حجاج کو حجاز کے ایک بڑے مسئلے سے سابقہ پیش آتا رہا ہے۔ وہ مسئلہ تھا لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کا۔ اس عہد کے حج نامہ نگاروں نے بدوؤں کی قتل وغارت گری کے تذکرے اپنے حج ناموں میں بہ کثرت تحریر کیے ہیں، جن سے اس عہد کے سفر کی جغرافیائی مشکلات کے علاوہ ان کی جان و مال کے غیر محفوظ ہونے کی مشکلات بھی سامنے آتی ہیں۔ ابتدائی حج نامہ نگاروں میں سے مرزا عرفان علی بیگ نے اپنے حج نامے ''سفرنامۂ حجاز'' (مطبوعہ: ۱۸۹۵ء) میں اس صورت حال پر روشنی ڈالی ہے، وہ حجاج کے قتل کے ایک دردناک واقعے کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"۔۔۔ابھی جو قافلہ مدینہ منورہ سے قبل از حج لوٹا ہے اس میں بہت سے ہندوستانی گم ہیں۔بعضوں کے قتل کی تو چشم دید حکایتیں میں نے خود سنی ہیں۔ایک بڑھیا کو روتا دیکھ کر میرے آنسو نکل پڑے۔جب اس نے ذکر کیا کہ صرف دو آنے پیسے اس کے شوہر کے پاس تھے، جو کمر میں ڈالے پیشاب کو اترا تھا، مگر پھر نہیں لوٹا۔"(۱)

اردو کے اولین مطبوعہ سفرنامے کے خالق حاجی منصب علی خان نے بھی "ماہِ مغرب" (مطبوعہ:۱۸۷۱ء) میں بدوؤں کے ذریعہ قتل کی واردات انجام دینے کا حال رقم کیا ہے۔انھوں نے لکھا کہ بیرون شہر مکہ ایک تالاب ہے، جہاں نہاتے وقت ہذو حجاج کے رکھے ہوئے کپڑے اٹھالے جاتے ہیں، اور اگر ان کا تعاقب کیا جائے، تو وہ سنگ سار کر دیتے ہیں۔ابتدائی حج نامہ نگاروں میں سے ایک مولوی دلاور علی وکیل نے بھی "سیاحت الحرمین بہ زیارت الثقلین" (سفر:۱۸۹۳ء) میں مکہ اور منیٰ کے درمیان بدوؤں کے حملے میں بہت سے لوگوں کے مارے جانے کا ذکر کیا ہے۔(۲) حجاز میں جان و مال کے غیر محفوظ ہونے کا مسئلہ اور بھی قدیم ترین حج ناموں سے ملتا ہے۔آج سے سوا دو سو سال قبل تحریر کیے گئے ایک مراکشی عالم شیخ عبدالسلام الدرعی کے "سفرنامۂ حج" میں بھی جس کا اردو ترجمہ موجود ہے، مقامات حج تک کے غیر محفوظ ہونے کا ذکر موجود ہے۔شیخ الدرعی منیٰ کی روداد میں لکھتے ہیں۔

"۔۔۔اپنے مطوف کے اصرار کی بنا پر، اور اس لیے کہ ہمارے پاس موم بتیاں بھی نہ تھیں، اور اپنے دفاع کے لیے کوئی سامان نہ تھا، رات تاریک تھی، اور کیڑوں اور زہریلے جانوروں کا بھی خطرہ تھا، اور متواتر خبریں ایسی سننے میں آئی تھیں کہ رات کو لٹیرے آتے ہیں اور حاجیوں کو قتل کر دیتے ہیں، اس لیے با دل نخواستہ مغرب کی نماز پڑھتے ہی عرنہ کی طرف کوچ کیا، اور رات بھر اللہ کی امان و حفاظت طلب کرتے رہے۔۔۔۔۔"(۳)

گذشتہ اقتباس اور تذکروں سے مذکورہ عہد کے حجاز کی سماجی حالت کے حوالے سے بدوؤں کی منفی تصویر سامنے آتی ہے، لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ بدو بالکل اُجڈ، ظالم اور لٹیرے ہوا کرتے

تھے۔ متعدد حج ناموں میں ان کی غیرت جمیت، خودداری اور جفاکشی کے تذکرے موجود ہیں۔

(۴) ایک زائرِ حجاز خداداد خان نے جنھوں نے اپنے سفر کا بڑا حصہ پیدل طے کیا تھا اپنے حج نامہ ''حج خداداد'' میں بدوؤں کی مہمان نوازی کا حال قلم بند کیا ہے، جس سے ان کی شخصیت کی مثبت تصویر سامنے آتی ہے۔ ذیل کا اقتباس قدرے دلچسپ ہے، ملاحظہ فرمائیں:

''۔۔۔میں بہت تھک گیا تھا، اس لیے نماز پڑھ کر لیٹنے لگا کہ وہ میرے لیے آدھا پاؤ بکر (ثرید) یعنی کھجوروں کا حلوہ لایا اور اس کے بچے رو رہے تھے۔ مجھے خیال ہوا کہ اس کے گھر کھانے کو یہی کچھ ہے، جو وہ میرے لیے لے آیا، اور بچے بھوکے رو رہے ہیں۔ میں انکار کرتا لیکن اس نے اصرار کر کے کھلا ہی دیا۔ میں کھا کر سویا، معلوم نہیں کتنی دیر کے بعد مجھ کو اُٹھایا گیا، دیکھا کہ تین بچے اور ایک عورت اور ایک مرد میرے چاروں طرف بیٹھے ہیں۔ اگر میں نیند میں نہ ہوتا تو ڈر کر بھاگنے لگتا یا طاقت کے زعم میں لڑنے لگتا کہ شاید یہ آدم خور مجھے کھانے کو بیٹھے ہیں، کہ ایک بڑا سا لکڑی کا پیالہ جس میں دو سیر، تین سیر چاول ہوں گے میرے سامنے رکھ کر اصرار کیا جانے لگا۔ سخت اصرار پر تین چار لقمہ کھائے اور لیٹ گیا، دیکھا کہ جس طرف سے پیالہ میں میں نے ہاتھ ڈال کر کھایا تھا اسی طرف سے وہ بڈو لقمہ بنا بنا کر اپنے بیوی بچوں کو دیتے ہوئے یہ کہتا جاتا کہ یہ برکت کا ہے، کھاؤ اور خود آپ اسی پس خوردہ جگہ سے کھاتا جا رہا تھا۔ میں نے دل میں کہا کہ حاتم کو سنا تھا اور ان کو دیکھا ہے۔۔۔'' (۵)

بردہ فروشی:

اُنیسویں صدی کے نصف آخر کے حجاز کا ایک اور اہم مسئلہ بردہ فروشی رہا ہے۔ اس دور تک حجاز میں غلاموں کی خرید و فروخت کا سلسلہ جاری تھا۔ ابتدائی حج نامہ نگاروں میں سے نواب سکندر بیگم، حاجی منصب علی خان اور مرزا عرفان علی بیگ نے اپنے حج ناموں میں اس کا ذکر کیا ہے۔ مرزا عرفان علی بیگ کے ''سفرنامۂ حجاز'' (مطبوعہ: ۱۸۹۵ء) میں غلاموں کے بازار کے مشاہدے اور

اس منظر نامے کا تذکرہ موجود ہے۔ اس بابت سفر نامہ نگار لکھتا ہے:

"۔۔۔مسجد حرم سے باہر نکلتے ہی لونڈی غلاموں کا بازار ملا۔ کچھ حبشی لونڈی، غلام فروخت کو موجود تھے۔ بردہ فروشی کا انسداد اس ملک میں ہنوز نہیں ہوا ہے، گو اس قدر تحقیقات سے معلوم ہوا کہ نئے لونڈی، غلام بڑی مشکل سے دستیاب ہوتے ہیں، اور اس وقت کے پیش آنے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ سواحل بحر قلزم پر سرکار انگلیشیہ کی جانب سے روک ٹوک زیادہ ہے۔۔۔۔" (۶)

"ماہ مغرب" (مطبوعہ: ۱۸۷۱ء) میں منصب علی خاں نے بھی غلاموں کے بازار کے مشاہدات درج کیے ہیں۔ انھوں نے دیگر حج نامہ نگاروں کے برعکس اس عہد میں اس رسم کی موجودگی کے اسباب جاننے کی کوشش بھی کی، مگر وہ اس میں پوری طرح کامیاب نظر نہیں آتے۔ منصب علی خاں لکھتے ہیں:

"انھوں نے یہ جواب دیا کہ ملک عرب کے کنارے پر حبشی، شیدی وغیرہ کفار بستے ہیں، ان سے جو لڑائی ہوتی ہے بندے لا کر فروخت کر دیتے ہیں مگر درباب قوم گرجی بعض نے سکوت کیا۔ کیا معنی کہ کل گرجی اصل میں مسلمان ہیں ان کے باپ، بھائی اپنے صغیر سن بچوں کو جو نہایت خوب صورت اور حسین ہوتے ہیں، بہ قیمتِ گراں بیچ کر دیتے ہیں۔۔۔" (۷)

شراب نوشی:

اُنیسویں صدی کے نصف آخر کے حج ناموں میں شراب کی دکانوں کی موجودگی کا ذکر بھی ملتا ہے نواب سکندر بیگم، محمد زردار خان اور محمد حفیظ اللہ کے حج ناموں میں اس کا ذکر موجود ہے۔ البتہ محمد زردار خان نے حجاز میں کھلے عام افیون فروخت ہونے کا ذکر بھی کیا ہے، اور لکھا ہے کہ اسے نشہ میں شمار نہیں کرتے، واللہ اعلم بالصواب۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

"۔۔۔۔جدہ شریف میں دیکھا گیا کہ دو چار دکانیں انگریزوں کی شراب کی ہیں اور کعبہ

شریف میں ایسی ممانعت ہے کہ اگر کوئی خبر شراب پینے کی معلوم ہو جائے تو چودہ سال کی قید پابجولاں و با مشقت ہوتی ہے۔ بعد میعاد کے وہ شخص شہر سے خارج کیا جاتا ہے مدت العمر تک۔ اور قید سلطانی بہت سخت دیکھی گئی ہے، یعنی ایک زنجیر میں دو شخص ہوتے ہیں اور تمام نشہ کی چیزوں کی ایسی ممانعت ہے جیسی کہ شراب کی لکھی گئی ہے لیکن افیون تو ظاہر فروخت ہوتی ہے اس کو نشہ میں شمار نہیں کرتے۔۔۔۔"(۸)

محمد حفیظ اللہ کے "سفر نامہ عرب" سے اس صورت حال کا اور بہتر علم ہوتا ہے۔ اُنھوں نے لکھا کہ ۱۳۱۰ھ میں جدہ میں انگریزوں نے شراب خانہ قائم کیا تھا، لیکن جب عثمان پاشا مکہ کے گورنر بن کر آئے تو شراب خانہ بند کردیا اور مے فروشوں کو سزائیں دیں۔(۹)

مکانات، طرز نشست و برخاست:

کسی ملک اور خطے کی ثقافتی زندگی میں مکانات، رہن سہن، طرز نشست و برخاست، لباس، اشیائے خورد و نوش اور دیگر رسوم کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس سے اس خطے کے لوگوں کے ذوق اور ذہن و مزاج کا اندازہ ہوتا ہے، اور زندگی گزارنے کے متعلق ان کا رویہ سامنے آتا ہے۔ حج کے سفر ناموں میں بھی یہ چیزیں نمایاں شکل میں موجود ہیں۔ مصنفین حج نامہ نے حجاز کی زندگی کے ان ثقافتی مظاہر سے واقف ہونے اور پھر انھیں اپنے حج ناموں میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ انھوں نے ایک سیاح کی طرح اپنی آنکھیں کھلی رکھی ہیں، اور ثقافتی زندگی کے ان قیمتی نقوش کو صفحات قرطاس پر پیش کر دیا ہے۔

محمد عمر علی خان کے حج نامہ "زاد غریب" (مطبوعہ: ۱۲۹۳ھ/۹۶-۱۸۹۵ء) اور منصب علی خان کے "ماہ مغرب" (مطبوعہ: ۱۸۷۱ء) میں حجاز کے مکانات اور وہاں کے لوگوں کی طرز رہائش اور نشست و برخاست کی تفصیلات کو پیش کیا گیا ہے۔ "زاد غریب" سے جدہ کی آبادی، مکانات اور وہاں کے بازار کی طرز تعمیر کی تفصیلات سامنے آتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کی آخری دہائی میں جدہ کی آبادی ۱۵ سے ۲۰ ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ وہاں مکانات کی منزلہ

بلند تعمیر کیے جاتے تھے شہر کی گلیاں تنگ تھیں اور بازار کے راستے چھت دار تھے۔ مصنف لکھتے ہیں:

''ایک شہر مختصر قریب ۱۵ یا ۲۰ ہزار آدمیوں کی آبادی کا ہوگا۔ مکانات بلند بلند، کوچہ تنگ، بازار اوپر سے لکڑی سے پٹا ہوا۔ وسط شہر میں بازار سے ملی ہوئی جامع مسجد ہے۔۔۔'' (۱۰)

انیسویں صدی کے نصف آخر میں جدہ میں جس طرح کئی کئی منزلہ عمارتوں میں چاروں طرف چوبی اور منقش دروازے ہوا کرتے تھے اور ان میں صحن کا رواج نہیں تھا۔ چارپائی کا رواج بہت کم تھا اور سونے اور بیٹھنے کے لیے نفیس اور ملائم فرش بچھے رہتے، اور خوب صورت تکیے دیواروں سے لگے رہتے تھے۔ حاجی منصب علی خان اس بابت لکھتے ہیں:

''مکہ معظمہ میں مکانات کئی کئی منزل بلند، ہر درجہ میں چاروں طرف چوبی دروازے خوش نما منقش، ہوا کے واسطے ہوتے ہیں۔ ان مکانات میں صحن نہیں ہوتا، کوئی موسم ہو، مخلوق مکانوں کے اندر رہتی ہے۔ چارپائی کا رواج بہت کم ہے بلکہ نہیں۔ اس کے بدلے گدے بہت ملائم، نفیس، طرح بہ طرح چھینٹوں کے دیوار سے لگا کر بچھاتے ہیں۔ درمیان میں قالین، چٹائی کا فرش ہوتا ہے۔ تکیے تین فٹ لمبے، دو فٹ اونچے، بوٹہ دار چھینٹ کے جو اسی کے لیے مخصوص ہیں دیواروں سے لگے رہتے ہیں اور روشنی کو چربی کی بتی ولایتی، یا تیل کیروسائین کی قسم، شیشے کے لیمپ میں جلاتے ہیں جس میں دھواں نہیں ہوتا، اور مکانات سے عفونت ہوا، دور کرنے کو ''اگر'' وغیرہ خوشبوئیں بخور کرتے ہیں۔۔۔'' (۱۱)

ماہ مغرب سے تقریباً تینتیس سال بعد ۱۹۰۵ء میں جب ڈاکٹر نور حسین صابر کا ''رفیق الحجاج'' شائع ہوا تو انھوں نے بھی سونے کے لیے زمین پر فرش بچھانے کے رواج کا ذکر کیا البتہ اس میں جرمن فرنیچر کی موجودگی اور اس کی وقعت کا ذکر بھی نظر آتا ہے:

''۔۔۔ مکانات کو تو عجیب طرح سجایا جاتا ہے۔ جرمن و فرنچ فرنیچر و سامان آرایش کو زیادہ وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ مکانوں میں اونچے بستر ے، نفیس و قیمتی لگا کر زمین پر سوتے ہیں اور تکیے، گاؤ تکیے کا رواج عام ہے۔۔۔'' (۱۲)

لباس:

مصنفین نے حج ناموں میں اہلِ حجاز کے لباس کے بارے میں تفصیلات تحریر کی ہیں۔ انھوں نے مردوں، بالخصوص عورتوں کے لباس، ان کی ہیئت اور آرائش پر گفتگو کی ہے، اور عربوں اور ترکوں کے لباس کی صفائی سے متعلق بھی معلومات تحریر کی ہیں۔ "زادِ مغرب" میں منصب علی خان نے اہلِ مکہ کے لباس کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"۔۔۔اہلِ مکہ معظمہ لباس عمدہ رنگین، مثل بانات، قیمتی صوف وغیرہ پہنتے ہیں۔۔۔" (۱۳)

نور حسین صابر اور نواب سکندر بیگم نے لباس کی صفائی کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔ ڈاکٹر نور حسین صابر اس بابت لکھتے ہیں: "عرب لوگوں کا گزران اعلیٰ درجہ کا امیرانہ ہے۔ لباس و خوراک میں صفائی کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔۔۔" (۱۴) جب کہ نواب سکندر بیگم نے اپنے قلمی سفر نامۂ حج "یادداشت تاریخ وقائع حج" (سفر: ۱۸۶۴ء) میں مکہ کے ترکوں کے میلے لباس استعمال کرنے کا تذکرہ کیا ہے، وہ لکھتی ہیں:

"۔۔۔ترک لوگ بہت میلے کپڑے رکھتے ہیں، اور موٹا کھانا کھاتے ہیں۔۔۔" (۱۵)

لباس کے حالات تحریر کرتے ہوئے بعض حج نامہ نگاروں نے عورتوں کے لباس کے بارے میں جزئیات نگاری سے کام لیا ہے، اور تفصیلات کو وضاحت سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ عمر علی خان کے "زادِ غریب" سے اُنیسویں صدی کے آخر کے مکہ کی عورتوں کے لباس کی تصویر سامنے آتی ہے۔ اس سے متعلقہ عہد کے ثقافتی ذوق کے ساتھ مصنف کی دل چسپی، جزئیات نگاری اور زبان کی ثقالت کا اظہار بھی ہوتا ہے:

"۔۔۔مدوّرہ: دوپٹہ ہوتا ہے طول اور عرض مربع، اکثر بہ طور تنگی کے ہوتا ہے۔ کونوں پر اُس کے آویزے ہوتے ہیں۔ ثوب: کرتۂ دراز آستین۔ محرمہ: رومال سر بندھنی، صدریہ، سروال، پائجامہ تنگ بغیر چوڑی، جس میں ترگید لگاتے ہیں، یعنی گوٹا کا کام نصف ساق تک

سیون کے ایک ایک اُنگل دونوں جانب کرتے ہیں اور پاینچوں پر کنگورہ دار لیس ٹانکتے ہیں۔ برقعہ ایک کپڑا ہوتا ہے بالشت سے زیادہ چوڑا، لانبا تا بہ زانو جو ناک کے اوپر باندھتے ہیں طابیہ: سب سے اوپر اوڑھنے کی چادر کو کہتے ہیں۔۔۔۔"(۱۶)

ڈاکٹر نور حسین صابر نے بھی خواتین کے لباس کے ذکر کو اپنے حج نامے میں سمویا ہے۔ محمد عمر علی خان کی جزئیات نگاری سے قطع نظر انھوں نے اس کے لیے مختلف طریقہ کار اپنایا ہے۔ نور حسین صابر کا سفری رویہ ایک حقیقی سیاح کی طرح نظر آتا ہے، چنانچہ انھوں نے اس سفر مقدس میں بھی اپنی آنکھوں کو ہر منظر کے لیے کھلا رکھا ہے، اور اگر کہیں کوئی حسن و دل آویزی نظر آئی ہے تو اسے بھی جزو حج نامہ بنا لینے سے گریز نہیں کیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ انھوں نے مدنی اور ترک خواتین کے حسن اور ناز و ادا کی تصویر کشی کی ہے۔ جس میں بہت دل آویزی اور رعنائی ہے۔ اس منظر کشی میں خواتین کے لباس کا تذکرہ بھی آ گیا ہے۔ اس کا ایک حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔:

"۔۔۔یورپین گرگابی یا پشاوری سلیپر، ٹانکے دار زردوزی بخاری پاجامہ، لمبے کرتے فیشنیبل برقعہ، سنہری کمر بند، پُر تکلف بغدادی چادر، نرم کلائی، سائیڈ سیس، نازک ادائیں، مٹک چال، یہ وہ چیزیں ہیں، جو ایک حسن پرست کو تڑپا دیتی ہیں۔۔۔۔"(۱۷)

مذکورہ اقتباسات میں سے اوّل الذکر اقتباس سے جہاں حجاز کی عورتوں کی باپردہ شخصیت اور ثانی الذکر اقتباس سے پردے کے ساتھ جدت اور تکلف کا اظہار ہوتا ہے، وہیں ایک حیدر آبادی مصنفہ اُمۃ الغنی نور النساء کے "سفرنامۂ حجاز، شام و مصر" (سفر: ۱۹۰۹ء) سے حجاز کی عورتوں کے لباس پر کرب کا اظہار بھی سامنے آتا ہے۔ مصنفہ لکھتی ہیں:

"یہاں کی عورتوں نے اپنا لباس اور ملکوں کی عورتوں کی طرح تبدیل کر دیا ہے۔ سینہ وغیرہ عیسائیوں کی طرح کھلا رکھتے ہیں۔۔۔۔"(۱۸)

قہوہ خانے

حج کے سفر نامے سے عربوں کی زندگی میں قہوہ، قہوہ خانوں، چائے اور حقے کی تہذیبی حیثیت سامنے آتی ہے۔ مصنفین حج نامہ نے ان تفصیلات کو بھی جزوِ حج نامہ بنایا ہے۔ ڈاکٹر نور حسین صابر کے سفرنامے (مطبوعہ:۱۹۰۵ء) سے اس کی مذکورہ حیثیت سامنے آتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''۔۔۔حقہ نوشی بہ کثرت ہے۔ایک قسم کا طویل، لمبا حقہ مشہور ہے۔قہوہ، چائے بغیر دودھ کے عرب کی خوراک میں شامل ہے اور مہمان کو سب سے اوّل اسی کی خاطر کی جاتی ہے۔۔۔'' (۱۹)

اُنیسویں صدی کے آخر میں حجاز میں قہوہ خانوں کی ثقافتی حیثیت کا نمایاں تذکرہ حاجی علیم الدین کے حج نامے میں نظر آتا ہے۔ اس سے وہاں قہوہ خانوں کی کثرت اور گرمی کے موسم میں بطورِ خاص تفریحی مقامات کے قہوہ خانوں میں لوگوں کے رات کو سونے کا علم بھی ہوتا ہے۔ انھوں نے ''رسالۂ حج'' (مطبوعہ:۱۸۹۲ء) میں قہوہ خانوں سے متعلق اپنے مشاہدات و معلومات کو سطور ذیل میں لکھا ہے:

''ملک عرب میں دستور ہے کہ ہر محلے اور عام گزرگاہ اور مکانات تفریح پر کسی مکان یا دکان میں سرِ راہ قہوہ خانہ قائم کر لیتے ہیں۔ بیٹھنے کا سامان ملکی رواج کے مطابق ہوتا ہے۔ ہر آدمی بلا تمیز و تخصیص اس میں جا سکتا ہے، اور جو چیز چائے، قہوہ، حقہ، منظور ہو، طلب کر سکتا ہے۔ مہتمم قہوہ خانہ بلا عذر ہر چیز مطلوبہ پیش کرے گا۔ اور جب تک دل چاہے بیٹھے رہیے، وہ متقاضی نہ ہوگا۔۔۔ گرمی کے موسم میں اکثر عرب ایسے قہوہ خانوں میں جو کنارۂ شہر پر یا ہوا زیادہ آنے کے موقع پر واقع ہیں، رات کو سویا بھی کرتے ہیں۔۔۔'' (۲۰)

حمام

عرب دنیا میں حمام کی ثقافتی روایت رہی ہے۔ حج نامہ نگاروں نے جہاں حجاز کے دیگر

تہذیبی اور ثقافتی مظاہر کی طرف توجہ کی ہے، وہیں اس اہم جہت کو بھی اپنی تخلیقات میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ آج سے سو سال قبل کے حجاز کے حمام خانوں کی کچھ جھلک مولانا ابوالقاسم کے سفر نامے کی ذیل کی تحریر سے سامنے آتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہاں کے لوگ زیادہ تر حمام خانوں میں غسل کرنے کے خوگر ہیں۔ عجیب وغریب طرز کے حمام خانے بنے ہوئے ہیں۔ سنگ مرمر کا فرش، متعدد نہلانے والے، اچھی لنگیاں، ٹرکش ٹاول (بڑے تولیے) استعمال کے لیے دی جاتی ہیں۔ ہر ایک غسل کے موقع پر دو دو ٹونٹیاں لگی ہیں۔ ایک سے گرم پانی دوسرے سے ٹھنڈا پانی آتا ہے۔۔۔'' (۲۱)

شادی اور طلاق

زائرین حجاز نے متنوع مناظر کے ساتھ ساتھ حجاز کی شدی بیاہ اور اس کی رسموں میں بھی دلچسپی لی ہے اور انھیں تفصیل وجزئیات کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ اس طرح حج ناموں کی ثقافتی جہت مستحکم ہوئی ہے۔ اور ان میں تنوع اور رنگارنگی پیدا ہوئی ہے۔ عبدالرحیم نقش بندی کے ''سفر حرمین الشریفین وذکر مدینہ منورہ'' (مطبوعہ: ۱۹۱۲ء سے بیسویں صدی کے ربع اوّل کے حجاز کی شادی کی کچھ رسوم کا علم ہوتا ہے۔ حج نامہ نگار لکھتا ہے:

''۔۔۔پچھلی رات برات آتی ہے۔ دولہا مع چند مستورات دلہن والے کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ جب دونوں ایک دوسرے کے بالمقابل ہوتے ہیں، تب دلہن اپنا منہ کھول دیتی ہے۔ اس وقت سوائے دولہا اور چند ہمراہی مستورات کے اور کوئی اس کمرے میں نہیں جاسکتا۔ بعد میں دولہا دلہن کے سر پر ہاتھ رکھ کر سورۂ فاتحہ پڑھتا ہے۔ اس وقت دونوں طرف کی مستورات جمع ہو کر حمد ونعت پڑھتی اور گاتی ہیں۔ بعد سب لوگ فریقین کو مبارک باد دیتے ہیں۔ صبح کو قبل ز طلوع آفتاب دولہا دلہن کا بازو پکڑ کر پاپیادہ اپنے گھر لے جاتا ہے اور چند مستورات ہمراہ جاتی ہیں۔ دلہن اپنے سسرال میں صرف ایک شب رہ کر صبح کو اپنے والدین کے گھر آجاتی ہے۔ ماں باپ اپنی لڑکی کو ایک روز رکھ کر پھر واپس سسرال روانہ کر دیتے ہیں۔'' (۲۲)

شیخ فضل الرب نے بھی جن کا حج نامہ "زادالدرین" کے نام سے ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا مکے کی شادی کی رسوم ورواج کو بالتفصیل تحریر کیا ہے۔اس سے اس عہد میں مروّجہ بعض لغویات کا علم بھی ہوتا ہے۔انھوں نے چراغاں کرنے، براتیوں کے ذریعہ انفرادی طور پر بہ کثرت روشنی کی فانوسیں ساتھ لانے (جنھیں غلام یا مزدور اٹھائے ہوتے تھے)، برات میں انار اور مہتابیوں کے چھوڑے جانے، بینڈ باجے کے اہتمام، فریقین کے یہاں رشتہ داروں کے ذریعہ اناج، روغن اور دُنبے بھیجے جانے، لڑکی کے والد کے ذریعہ داماد کو ولیمہ کے دن گھڑی وغیرہ سلامی میں دینے اور لڑکی کی منہ دکھائی کے وقت کی ایک عجیب رسم کا ذکر کیا ہے۔اس طرح کی اکثر رسمیں ہمارے ملک میں بھی رائج ہیں۔ مذکورہ تفصیلات کی پیش کش کے سبب اس حج نامے کی منفرد تہذیبی حیثیت سامنے آتی ہے۔منہ دکھائی کی رسم کے بارے میں شیخ فضل الرب لکھتے ہیں:

"نمازِ عصر کے وقت پہلے نوشہ کے ماں باپ ایک ایک زیور بہ طور رونمائی کے دیتے ہیں، بعد، عام برادری کے لوگ مرد وزن ایک ایک دو دو اشرفیاں، خواہ روپے جو جس کی لیاقت ہو، وہ پیشانی دلہن پر کسی لیس دار چیز سے سات دیتے ہیں کہ وہ گر کر دامن یا گود میں عروسہ کے جمع ہو جایا کرتی ہیں۔۔۔" (۲۳)

شیخ فضل الرب نے بدوؤں کی شادی کے احوال بھی تحریر کیے ہیں۔ چنانچہ مصنف نے نکاح کے وقت ان کے یہاں رائج ایک رسم کا ذکر کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

"۔۔۔تاریخ مقررہ شادی پر نوشہ ایک لالٹین روشنی کی اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے اور کل بدو اُس کے اقران کے خیمہ میں صاحبِ دختر کے آتے ہیں اور نکاح پہ دین مہر قلیل زر نقد کے ہوتا ہے۔بعد نکاح کے لڑکا اپنے ہاتھ سے ایک دُنبہ کا بچہ گواہوں کے سامنے ذبح کر ڈالتا ہے۔ جب خون اس کا زمین پر گر پڑتا ہے، تب اختتام رسم شادی تصور کی جاتی ہے۔۔۔" (۲۴)

حج ناموں میں حجاز میں طلاق کی کثرت کا ذکر بھی ملتا ہے۔نواب سکندر بیگم نے "یادداشت تاریخ وقائع حج" (قلمی، سفر: ۱۸۶۴ء) میں مکہ کی عورتوں کی طلاق بعد طلاق کے سبب دس تک

شادیوں کا ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ عام طور پر نکاح ایک یا دو سال سے زائد قائم نہیں رہتا۔(۴۵) اگرچہ دیگر مصنفین حج نامہ نے بھی کثرت طلاق کا ذکر کیا ہے لیکن اس کثرت کا تذکرہ کسی اور حج نامہ میں راقم کی نظر سے نہیں گزرا۔

رسم بعد موت:

حج ناموں میں جہاں شادی کی رسموں کا بیان موجود ہے وہیں ان میں موت کے بعد ایصالِ ثواب کے لیے اختیار کیے جانے والے طریقوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ شیخ فضل الرب نے ''زادالدارین'' میں ایصال ثواب کی رسم کا حال بھی تحریر کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کے آخر کے مکے میں میت کی تدفین کے بعد تین دنوں تک کلام اللہ پڑھنے اور چوتھے روز محفلِ میلاد منعقد کرنے اور پھر ایصالِ ثواب کرنے کا رواج موجود تھا۔ حج نامہ نگار لکھتا ہے:

''یہاں یہ دستور ہے کہ جس گھر میں میت ہو وہاں بعد مغرب خویش و اقارب دوست و احباب میت کے دن سے تین روز تک برابر جاتے ہیں اور ایک ایک پارہ کلام اللہ کا پڑھ کر چلے آتے ہیں۔ چلتے وقت ایک ایک پیالی قہوہ کی دی جاتی ہے اور چوتھے روز کہ چہارم کا دن ہے۔ یہ ہوتا ہے کہ سب لوگ بعد مغرب جمع ہوئے۔ پہلے سبھوں نے حسب دستور ایک ایک پارہ کلام مجید و فرقان حمید کا پڑھا بعد اس کے میلاد شریف حضرت رسول اکرم صلعم پڑھی گئی۔ اور لوگوں نے بیان ولادت کے وقت قیام کیا۔ بعد اس کے مجلس ختم ہو کر ایک ایک سورہ قل کا پڑھ کر میت کے نام پر فاتحہ کیا اور ایک پیالی قہوہ و ایک پیالی چائے و ایک تشتری بتاشہ تقسیم ہوئے پھر لوگ رخصت ہوئے۔۔۔''(۴۶)

رسم ختنہ:

''زادالدارین معروف بہ قبلہ نما'' میں حجاز میں ختنے کی رسوم کا حال بھی تفصیل سے نظر آتا ہے۔ ان رسوم میں متعدد لغویات کا علم بھی ہوتا ہے۔ شیخ فضل الرب کے مطابق جس لڑکے کا ختنہ کرانا ہوتا ہے اُسے نفیس و لطیف لباس پہنا کر ایک آراستہ و پیراستہ گاڑی پر سوار

کرتے ہیں جسے ٹھپر کھلیجا ہے لڑکے کے ساتھ دس بارہ ہم سن لڑکوں کو بھی سوار کراتے ہیں۔ سیکڑوں فانوسوں اور موم بتیوں کا انتظام رہتا ہے، جنھیں دوست اور رشتہ دار لاتے ہیں اور جن کو غلام اُٹھائے رہتے ہیں۔ اس جشن میں بینڈ باجے کا انتظام بھی رہتا ہے یہ پورا قافلہ بارات کی طرز پر بینڈ بجاتا اور مہتابیاں چھوڑتا حرم بیت اللہ کو جاتا ہے جہاں حرم میں لڑکے کو لے جا کر دعا پڑھاتے ہیں اور پھر گاڑی میں سوار کر کے بازار میں گشت کراتے ہوئے مکان پر لے جاتے ہیں تب جا کر ختنہ ہوتا ہے۔ صبح کو اس خوشی میں مہمانوں کی دعوت ہوتی ہے۔" (۲۷)

مذکورہ حج نامہ کے مصنف نے بدوؤں میں جاری ختنے سے متعلق ایک عجیب رواج کا ذکر کیا ہے جس کے مطابق بنی ثقیف کے بدوؤں کا یہ طریقہ ہے کہ ختنے کے وقت زیر ناف کا چمڑہ بھی صاف کر دیتے ہیں۔ حج نامہ نگار لکھتا ہے:

"بدو کے بعض خاص فرقہ میں ایک جدت یہ ہے کہ سوائے چمڑہ عجس کے کہ جس کا ختنہ کرنا ضروری ہے زیر ناف کا چمڑہ بھی ایک دم اُسترا سے چھیل دیتے ہیں تا کہ موئے زہار نہ پیدا ہوں۔۔ یہ قوم بنی ثقیف کی ہے جو طائف سے پورب وادی نخل میں رہتی ہے۔" (۲۸)

لڑکیوں کا ختنہ:

برصغیر میں لڑکیوں کے ختنے کا کوئی رواج نہیں ہے لیکن عرب میں ان کے ختنے کی روایت رہی ہے اور غالباً اب بھی یہ رسم رائج ہے۔ مخصوص جغرافیائی ماحول کے زیر اثر لڑکیوں میں جو فاضل گوشت بڑھ جاتا ہے اُسے ختنے کے ذریعہ صاف کر دیتے ہیں۔ مولانا ابوالقاسم کے ۱۹۱۳ء میں شائع ہونے والے حج نامے "سفر بیت اللہ" میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"جیسے لڑکوں کا ختنہ ہوتا ہے ایسے ہی یہاں قدرتی طور پر لڑکیوں کے پیشاب کی آب وہوا کی تاثیر سے کچھ گوشت بڑھ جاتا ہے، جس کو تین سال کی عمر سے چھ سال کی عمر کے اندر اندر کاٹ ڈالتے ہیں۔۔۔" (۲۹)

معمولاتِ رمضان:

اہل مکہ کے رمضان المبارک کے معمولات کا ذکر متعدد حج ناموں کی زینت ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان میں اہل مکہ کے معمولات بالکل تبدیل ہو جاتے تھے۔ لوگ دن کو سوتے اور رات کو جاگتے تھے۔ راحیل شیروانیہ نے اپنے حج نامے "زاد السبیل" (سفر ۱۹۲۳ء) میں ان تفصیلات کو پیش کیا ہے جن سے پتا چلتا ہے کہ اُس زمانے میں سرکاری کام کاج بھی رات کو ہی انجام پاتے تھے۔ وہ لکھتی ہیں:

"۔۔۔ بازار کی چیز رات ہی کو ملتی تھی۔ دوست احباب سے ملنے جائیں تو رات کو اور عورتیں سینا پرونا کریں تو رات ہی کو کرتی ہیں۔ غرض کہ پانچ سال کا بچہ بھی تمام شہر میں مشکل سے سوتا ہوگا۔ سڑکوں پر بچوں کا کھیل ہے تو رات کو ہے اور کسی کام والے کو ضرورت ہو تو رات کو غرض رات کیا ہے گلزار ہوتی ہے۔ ڈاک رات ہی کو تقسیم ہوتی ہے اور رات کو ہی روانہ ہوتی ہے اور کوئی خاص مقدمہ ہو تو وہ بھی رات کو حمیدیہ میں فیصل ہوگا۔۔۔ میری رائے میں تو جس مسلمان نے مکہ مکرمہ کے رمضان نہ دیکھے اُس نے دنیا میں کچھ نہ دیکھا۔۔۔" (۳۰)

عید

حج ناموں سے مکہ میں عید کی خوشیاں منانے کی رنگا رنگ روایت کا علم ہوتا ہے۔ ان کے مطابق عید کے کئی روز بعد تک لوگ خوشیاں مناتے، لباس فاخرہ زیب تن کرتے، ایک دوسرے کی باہم دعوتیں کرتے، گھوڑے دوڑاتے اور نیزہ بازی کرتے تھے۔ رفیع الدین فاروقی مراد آبادی کے مترجمہ حج نامے "سفر نامۂ حجاز" سے ۱۸۸۶ء کے مکہ کی عید کی تفصیلات سامنے آتی ہیں۔ فاروقی لکھتے ہیں:

"۔۔۔ عید کے چار روز بعد تک اظہار نشاط و سرور کرنا اور لباس فاخر کا زیب تن کرنا اہل مکہ کا معمول ہے۔ ان ایام میں جمیع سوار و پیادۂ عسکر نیزہ بدو، دن کے آخری حصے میں دار السادہ کے دروازے پر حاضر ہوتے ہیں اور میدان جلوخانہ میں گھوڑے دوڑاتے ہیں، نیزہ بازی

کرتے ہیں۔ نوجوان مکہ گدھوں کو کرایے پر لے کر دوڑاتے ہیں۔ شریف خود باہر نکلتا ہے اور گھوڑا دوڑاتا ہے۔۔۔۔" (۳۱)

محمد حفیظ اللہ نے بھی "سفرنامہ عرب" میں ۱۳۰۸ھ کے مکہ میں عید کی دعوتوں کی تفصیلات لکھی ہیں۔ ان کے مطابق سلطان کی طرف سے عید کے دن دعوت عام ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اسی روز شہر کے علما کی باہم دعوتیں ہوتی ہیں، دوسرے روز مشائخ کی دعوتیں ہوتی ہیں تیسرے روز مقربان سلطانی کی دعوتیں اور چوتھے روز لشکر کی دعوت سلطان کی طرف سے ہوتی ہے۔ (۳۲)

راحیل شیروانیہ نے ۱۹۲۳ء کے زمانے کے مکے کی عید کے حالات میں لکھا ہے کہ یہاں تین روز تک دوکانیں بند رہتی ہیں اور گھروں پر رونق ہوتی ہے۔ مہینے بھر عید کی تقریبات کا اہتمام ہوتا ہے۔ لوگ پورے ایک مہینے تک ایک دوسرے کی دعوتیں کرتے رہتے ہیں۔ (۳۳)

مذکورہ حج ناموں کے علاوہ خطیب قادر بادشاہ کے "سفر حجاز" (مطبوعہ: ۱۹۰۷ء) سے بھی مکہ کی عید کی رونق، مسجد الحرام میں نماز عید کی ادائیگی کی شان و شوکت عید سے قبل دس روز تک رات بھر بازار کے کھلے رہنے وہاں کی رونق اور عید کی خوشی میں تین روز تک توپیں سر ہونے کی تفصیلات کا علم ہوتا ہے۔ (۳۴)

مجلس مولود:

ترکی عہد کے حجاز میں بدعات کا رواج رہا ہے۔ چنانچہ مجلس مولود میں ذکر ولادتؐ کے وقت قیام کے تذکرے حج کے سفرناموں میں ملتے ہیں۔ عام مواقع اور ایصال ثواب کے موقعے پر مجلس مولود منعقد کرنے کا ذکر مصنفین حج نامہ نے کیا ہے جن میں حاضرین قیام بھی کیا کرتے تھے۔ شیخ فضل الرب نے "زاد الدارین" میں مکہ میں ایصال ثواب کے موقعے پر مجلس مولود کے انعقاد کا ذکر کیا ہے۔ (۳۵) اور محمد زردار خان کے "سفر نامہ حرمین" سے مسجد نبوی میں بہ کثرت مجلس مولود کے انعقاد کا علم ہوتا ہے۔ محمد زردار خان لکھتے ہیں۔

"۔۔۔یہاں پر مولود شریف کا بہت کچھ دستور ہے۔ ہر وقت ذکر ولادتؐ کے کل عرب

واسطے تعظیم کے کھڑے ہوتے ہیں اور صلوٰۃ اور درود پڑھتے ہیں اور جو کہ شیرینی اور خوشبو عود، عطر وغیرہ کی تیاری بہت کچھ ہوتی ہے، فاتحہ کی شیرینی حاضرین محفل کو تقسیم ہو جاتی ہے۔ مسجد نبوی میں بہت کچھ کثرت سے مولود ہوتی ہے۔۔۔" (۳۶)

اردو حج ناموں اور بعض تراجم کے ذریعہ حجاز کی سوا دو سو سالہ مدت کے جن سماجی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے نقوش کا مطالعہ کیا گیا ہے، وہ حج ناموں کا قیمتی اور روشن باب ہیں۔ ان تفصیلات سے حجاز کی زندگی کے بہت سے مثبت پہلو سامنے آتے ہیں، اور اہلِ حجاز کی لطیف و نفیس طبیعت، ان کی شخصیت، مزاج، رجحانات اور ان کی دلچسپیاں نمایاں ہوتی ہیں، البتہ بعض حوالوں سے حجاز کی زندگی کی منفی تصاویر بھی سامنے آتی ہیں۔

حجاز اور اہل حجاز کی زندگی کے حوالے سے حج ناموں کے وسیع ذخیرے کے صفحات پر پھیلی ہوئی یہ تفصیلات بہت اہم، وقیع اور گراں قدر ہیں اور ان کے سبب حج ناموں کو متعلقہ عہد کے حجاز کی سماجی، تہذیبی، اور ثقافتی زندگی کی تاریخ کے مصادر کی حیثیت بھی حاصل ہو گئی ہے۔ جب بھی مذکورہ زاویوں سے حجاز کی زندگی کی تفصیلات جاننے کی کوشش کی جائے گی، تو دیگر حوالوں کے ساتھ ان حج ناموں کی حیثیت واہمیت کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہوگا۔

حواشی

۱۔ مرزا عرفان علی بیگ: سفر نامۂ حجاز، لکھنو، مطبع منشی نول کشور، ۱۸۹۵ء، ص ۲۰۲

۲ سید دلاور علی: سیاحت الحرمین بزیارت الثقلین، حیدر آباد، مطبع عزیز، ت۔ن، ص ۲۰۶ تا ۲۱۲

۳ عبدالسلام الدرعی/ضیاء عبداللہ ندوی (مترجم): سفر نامۂ حج، نئی دہلی، مجلس علمی ۱۹۹۱ء، ص ۵۰

۴ ملاحظہ کریں: ماہر القادری: کاروان حجاز، نئی دہلی، مرکزی مکتبۂ اسلام پبلشرز، ۲۰۰۳ء، ص ۱۲۰، ۱۰۶، ۱۰۷

۵ خداداد خاں: حج خداداد، مرادآباد، مصنف، ت۔ن، ص ۳۱۔۳۲

۶ مرزا عرفان علی بیگ: سفر نامہ حجاز، ص ۱۳۲

۷ منصب علی خان: ماہِ مغرب، میرٹھ، مطبع محب کشور ہند، ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء، ص ۷۸

۸ محمد زردار خان: سفر نامۂ حرمین، لکھنؤ، مطبع نامی منشی نول کشور، ۱۲۹۰ھ/۱۸۹۵۔۹۶ء، ص ۱۴

۹ محمد حفیظ اللہ سفر نامہ عرب، پٹنہ، مطبع احمدی، ۱۳۱۲ھ/۹۵۔۱۸۹۴ء، ص ۱۱

۱۰ نواب محمد عمر علی خان: زادِ غریب، میرٹھ، مطبع گلزار محمدی، ۱۳۱۳/۹۶۔۱۸۹۵ء، ص ۱۳

۱۱ منصب علی خان: ماہِ مغرب، ص ۷۵۔۷۶

۱۲ ڈاکٹر نور حسین صابر: رفیق الحجاج، لاہور، خادم التعلیم اسٹیم پریس، ۱۹۰۷ء، ص ۱۱۸

۱۳ منصب علی خان : ماہِ مغرب ، ص ۷۶

۱۴ نور حسین صابر : رفیق الحجاج، ص ۱۱۸

۱۵ نواب سکندر بیگم: یادداشت، تاریخ وقائع حج (قلمی) مخزونہ: رام پور رضا لائبریری، رام پور، ص ۳۹

۱۶ محمد عمر علی خان: زادِ غریب، ص ۳۵

۱۷ نور حسین صابر : رفیق الحجاج، ص ۱۹۳

۱۸ لمعۃ الحق نور النساء: سفر نامۂ حجاز، شام و مصر، حیدرآباد، ورڈ ماسٹر کمپیوٹر پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء ص ۳۱

۱۹ نور حسین صابر : رفیق الحجاج ، ص ۱۱۸

۲۰ حاجی علیم الدین: رسالۂ حج، لکھنؤ، نامی پریس، ۱۸۹۲ء، ص ۸۶

۲۱ مولانا ابوالقاسم، سفر بیت اللہ، بنارس مطبع سعید المطابع، ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء ص ۳۳

۲۲ عبدالرحیم نقش بندی: سفر حرمین الشریفین و ذکر مدینہ منورہ، بنگلور، مطبع شوکت الاسلام، ۱۹۱۲ء ص ۲۳۶

۲۳ شیخ فضل الرب زادالدارین، معروف بہ قبلہ نما پٹنہ صادق پور پریس، ۱۸۹۶ء ص ۲۵۰

۲۴ ایضاً، ص ۲۵۱

۲۵ نواب سکندر بیگم: یادداشت تاریخ وقائع حج (قلمی) ص ۴۱

۲۶ شیخ فضل الرب: زادالدارین۔۔۔ص ۱۷۷

۲۷ ایضاً، ص ۲۲۵۔۲۲۸

۲۸ ایضاً، ص ۲۴۶

۲۹ مولانا ابوالقاسم: سفر بیت اللہ، ص ۳۴

۳۰ راحیل شیروانیہ: زادالسبیل، م۔ن، م۔ن، ت۔ن، ص ۸۴

۳۱ رفیع الدین فاروقی مرادآبادی: سفرنامۂ حجاز (ترجمہ) لکھنؤ، کتب خانہ الفرقان، ۱۹۶۱ء، ص ۸۱۔۸۲

۳۲ محمد حفیظ اللہ: سفرنامۂ عرب، ص ۹۳۔۹۴

۳۳ راحیل شیروانیہ: زادالسبیل، ص ۱۱۳

۳۴ خطیب قادر بادشاہ: سفر حجاز، مدراس، مطبع نامی، ۱۳۴۵ھ، ص ۴۲

۳۵ شیخ فضل الرب: زادالدارین معروف بہ قبلہ نما، ص ۷۷

۳۶ محمد زردار خان: سفرنامۂ حرمین، ص ۸۹

ڈاکٹر گل ناز بانو

اردو ادب میں خاکہ نگاری

خاکے کا شمار اردو ادب کی جدید اصناف میں ہوتا ہے بحیثیت ایک صنف اس کی ابتداء بیسویں صدی میں ہوئی اگر چہ اس کے ابتدائی نقوش ہمیں قدیم ادب میں ملتے ہیں تذکروں میں تو اس صنف کی جھلکیاں بہت نمایاں ہیں اور خصوصاً محمد حسین آزاد کی ''آب حیات'' اس سلسلے میں قابل ذکر ہے آب حیات سابقہ تذکروں کی ایک ترقی یافتہ تخلیق ہے اس میں صرف شعراء کے تعارف پر ہی قناعت نہیں کی گئی بلکہ آزاد کے اعجاز قلم نے مرقع نگاری کے عمدہ نمونے بھی پیش کیے کیونکہ ان کا مقصد آئندہ نسلوں کے سامنے گذشتہ زمانے کے شعراء کی جیتی جاگتی چلتی پھرتی تصویریں پیش کرنا تھیں اسی لیے انہوں نے مختلف شخصیات کے حلیے، عادات و اطوار، نظریات و عقائد ان کی خوبیوں اور کمزوریوں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ پوری شخصیت ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے آزاد کو اس بات کا احساس تھا کہ قدیم تذکروں سے نہ کسی شاعر کی زندگی کی سرگذشت کا حال معلوم ہوتا ہے اور نہ اس کی طبیعت اور عادات و اطوار کا حال کھلتا ہے۔

آب حیات کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''خیالات مذکورہ بالا نے مجھ پر واجب کیا کہ جو حالات ان بزرگوں کے معلوم ہیں یا مختلف تذکروں میں متفرق مذکور ہیں انہیں جمع کر کے ایک جگہ لکھوں اور جہاں تک ممکن ہو، اس طرح لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی، چالتی، پھرتی، چلتی تصویریں سامنے آن کھڑی ہوں اور انہیں حیات جاوداں حاصل ہو۔'' (آب حیات ص ۶)

چنانچہ آزاد نے ''آب حیات'' میں بڑی حد تک اس قول کو نبھایا، اور اس میں پیش کردہ شخصیات کو گوشت پوست کے انسانوں کی صورت میں پیش کیا ہے اسی خصوصیت کی بنا پر نقادوں نے بھی اس فن پارے کو قلمی مرقعوں کا بہترین نمونہ قرار دیا ہے آزاد نے تذکرہ نگاری کے قدیم طرز

کو چھوڑ کر اپنے لیے ایک نیا راستہ منتخب کیا قدیم تذکروں میں شعراء کی سوانح کم اور کلام کا انتخاب زیادہ ملتا ہے جب کہ آب حیات میں مصنف نے شعوری و قلمی کوشش سے اسلوب کے اچھوتے اور دلچسپ انداز بیاں سے شخصیات کو زندہ و متحرک کر کے پیش کیا ہے اسی لیے آب حیات نہ صرف تذکروں و تاریخ بلکہ مرقع نگاری اور انشا پردازی کا بھی عمدہ نمونہ ہے آب حیات ۱۸۸۰ء کی تخلیق ہے جب کہ خاکہ نگاری یا شخصیت نگاری کا باقاعدہ صنف کے طور پر اردو ادب میں دور دور تک سراغ نہیں ملتا اگرچہ آزاد نے ایک صنف کے طور پر آب حیات میں اسے نہیں برتا اور یوں یہ لاشعوری کوشش مستقبل کی اس صنف کے حق میں سازگار ثابت ہوئی موجودہ دور کے خاکوں سے آزاد کے قلمی مرقعوں کا موازنہ کرنا بے معنی ہے کیونکہ آزاد کے مرقعوں میں ذاتی پسند نا پسند اور جانبداری کا رنگ غالب ہے اعتدال اور توازن کی عدم موجودگی کے باعث بعض شخصیات کے ساتھ انصاف نہ کر سکے بعض کی خوبیاں حد سے تجاوز کر گئی ہیں اور بعض کی خامیاں تاہم خاکہ نگاری کی تاریخ میں نہ صرف آزاد کی آب حیات بلکہ ''دربار اکبری'' اور ''نیرنگ خیال'' بھی قابل توجہ ہیں ان تمام تصانیف میں آزاد نے قلمی مرقعوں کے بہترین نمونے پیش کیے ہیں۔

اردو ادب میں خاکہ نگاری کو باقاعدہ ایک صنف کے متعارف کرانے کا سہرا نہ صرف فرحت اللہ بیگ کے سر ہے بلکہ پہلا مکمل خاکہ لکھنے کا اعزاز بھی انہیں حاصل ہے۔ ۱۹۲۷ء میں ''نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' لکھ کر ایک کامیاب خاکہ کے خالق بنے فرحت اللہ نے یہ خاکہ لکھ کر شخصیت پرستی کی روایت کو توڑا اور جرأت اظہار کا مظاہرہ کر کے منافقانہ، توصیفانہ مضامین کی بجائے حقائق پر مبنی انسانی سیرت و کردار و شخصیت پر سے نقاب اٹھا کر اسے ماورائی مخلوق کی بجائے ایک زندہ انسان کی صورت میں پیش کیا۔ خاکہ نگاری کے ضمن میں فرحت اللہ بیگ کی ''دہلی کا یادگار مشاعرہ'' اور ''ایک وصیت کی تعمیل'' کو بھی خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اول الذکر کتاب میں مصنف نے شعراء کی سراپا نگاری میں کافی محنت کی ہے۔ ان کی شکل و صورت لباس وضع قطع، نشست و برخاست، عادات و اطوار کا بڑی مہارت سے بیان ملتا ہے تاہم اس کتاب پر

آب حیات کے مشاعرے کا پرتو ملتا ہے فرحت اللہ بیگ نے اردو ادب میں خاکہ خاکہ نگاری کو باقاعدہ ایک صنف کے طور پر نہ صرف متعارف کیا بلکہ مقبول عام بھی بنایا یہی وجہ ہے کہ ان کے خاکے اردو خاکہ نگاری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں

خاکہ نگاری کی تاریخ میں ایک اہم نام مولوی عبدالحق کا بھی ہے "چند ہم عصر" ان کے شخصی خاکوں کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں چوبیس شخصیات کو پیش کیا گیا ہے۔ جن میں سید محمود، مولوی چراغ علی، مولوی عزیز مرزا، شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی، خواجہ غلام الثقلین، حکیم امتیاز الدین، مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی، نور خان، محسن الملک، مولانا محمد علی جوہر، شیخ غلام قادر گرامی، حالی، سر سید احمد خاں، میرن صاحب، نام دیو مالی، سر راس مسعود، ڈاکٹر محمد اقبال، مولانا حسرت موہانی، عبدالرحمٰن صدیقی، درویش پروفیسر ری ہٹ سک، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، نواب عماد الملک، پروفیسر مرزا حیرت اور خاندہ ادیب خانم شامل ہیں۔ مولوی صاحب نے اپنی تصنیف میں زیادہ تر شخصیات کے مثبت پہلوؤں کو ہی اجاگر کیا ہے کہیں کہیں خوبیوں کے ساتھ ہلکے اور دھیمے لہجے میں خامیوں کا بھی ذکر کیا ہے لیکن انداز تحریر انتہائی نرم اور دھیمار ہا ہے۔ انہوں نے مشاہیر کے علاوہ نام دیو اور نور خان سپاہی جیسی گمنام شخصیا ت پر لکھ کر انسانیت اور اس کی اعلیٰ قدروں سے محبت کا ثبوت دیا ہے وہ شخصیات کے اعلیٰ اوصاف کو نہ صرف خود دیکھتے ہیں اور متاثر ہوتے ہیں بلکہ قاری کو بھی دکھاتے ہیں اور متاثر کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔

خاکہ نگاری میں ایک اور اہم نام رشید احمد صدیقی کا ہے ان کے خاکوں کا پہلا مجموعہ "گنجہائے گرانمایہ" میں تیرہ (۱۳) شخصایت پر کرداری خاکے ہیں یہ شخصی و کرداری خاکے زیادہ تر اپنے دوستوں اور نامور ہستیوں پر لکھے گئے ہیں۔

دوسرا مجموعہ ہم نفسان رفتہ ہے۔ اس میں سات شخصی مضامین شامل ہیں رشید احمد صدیقی ایک صاحب طرز ادیب تھے انہوں نے خاکہ کو اسلوب کے حوالے سے صحیح معنوں میں ایک تخلیقی صنف کا روپ دیا اور پیش کردہ شخصیات کو اپنے مکمل فنی شعور، نادر و شگفتہ انداز میں بیان سے

زندہ و جاوید کر دیا ان کے خاکوں میں شخصی محاسن پر زیادہ توجہ دی گئی ہے اسی لیے عقیدت مندانہ رویہ نمایاں ہے۔

بیسویں صدی کا تیسرا عشرہ اردو ادب میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے اس دور میں نئے رجحانات اور نئے تجربات سامنے آتے ہیں اس دور میں نہ صرف ادب کو وسعت و کشادگی ملی بلکہ ادیب کی فکر اور قلم کو بے باکی، بے خوفی اور جرأت اظہار کا موقع ملا چنانچہ نہ صرف ناول و افسانہ بلکہ دیگر اصناف نظم و نثر میں حقیقتوں اور صداقتوں کے بیان کا رجحان بڑھا۔ اس سلسلے میں عصمت چغتائی کا نام سرفہرست ہے عصمت اردو ادب میں افسانہ نگاری کی حیثیت سے شہرت رکھتی ہیں لیکن ''دوزخی'' کے لکھنے کے بعد خاکہ نگاری میں بھی اپنی پہچان کروا دی 'دوزخی' عظیم بیگ چغتائی کا خاکہ ہے اس میں مصنفہ نے اپنے بھائی کی زندگی کے ہر پہلو کو انتہائی بے باکی سے بیان کیا ہے اس کی شخصی و فطری کمزوریوں اور خامیوں کو بڑی بے خوفی اور جرأت مندی سے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔

اسی دور کے بعض دوسرے ادباء نے بھی اکا دکا خاکے لکھے ہیں ان میں کرشن چندر، سردار جعفری، ساحر لدھیانوی شامل ہیں یہ خاکے مختلف پرچوں میں چھپے، کتابی صورت میں نہیں ملتے کتابی صورت میں چراغ حسن حسرت کے شخصی خاکوں کا مجموعہ 'مردم دیدہ' ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا اس میں زیادہ تر مضامین تعارفی و سوانحی نوعیت کے ہیں تاہم بعض مضامین میں خاکے کے کچھ اجزاء پائے جاتے ہیں جس کی وجہ سے انہیں کرداری یا نیم خاکے کہا جا سکتا ہے۔

قیام پاکستان سے قبل شخصی مرقع نگاروں میں شوکت تھانوی کا نام بھی لیا جاتا ہے حالانکہ ''شیش محل'' اور ''قاعدہ بے قاعدہ'' شخصی خاکوں کی نہیں بلکہ مختصر شخصی تذکروں پر مبنی کتابیں ہیں خود مصنف لکھتے ہیں۔

> ''اس کتاب میں ان میں سے چند ادباء اور شعراء کا تذکرہ پیش کیا جا رہا ہے جن سے میں کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی صورت سے مل چکا ہوں'' (شیش محل ص ۹)

''شیش محل'' دو سو چالیس صفحات کے چھوٹے سائز کی کتاب ہے اس میں ایک سو تیرہ شخصیت کا ایک دو صفحے پر مختصر ترین تعارف ہے تاہم ان شخصی تذکروں میں بعض شخصیات کے بیان میں ہلکا سا شخصی عکس سامنے آتا ہے یہی کیفیت 'قاعدہ بے قاعدہ' میں ملتی ہے ایک سو اٹھارہ صفحات کے چھوٹے سائز کی اس کتاب میں اکتیس شخصیت پر ایک آدھ صفحے کا تذکرہ ہے اس میں حروف تہجی کے تحت الف سے ے تک شخصیات کے ناموں کی مناسبت سے مختصر تعارف ہے۔

ان کے علاوہ کچھ اور اہم نام بھی ہیں جنھوں نے قیام پاکستان سے قبل اس صنف میں کچھ نقوش چھوڑے ہیں ان میں محمد شفیع دہلوی، شبیر احمد ہاشمی، عبدالرزاق کانپوری عبدالماجد دریا آبادی، خواجہ غلام السیدین اور مالک رام شامل ہیں ان کے خاکوں میں موجودہ دور کے خاکوں جیسے فنی محاسن نہیں ملتے لیکن خاکہ نگاری کے جزوی عناصر منتشر طور پر پائے جاتے ہیں دراصل اس دور کی خاکہ نگاری میں ایک مقصد کارفرما نظر آتا ہے اور وہ مقصد قوم کی بڑی بڑی شخصیات کی تہذیب و تمدن، اعلیٰ اقدار و روایات اور ماحول و معاشرت کو شخصیات کے پس منظر میں آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کرنا ہے خاکہ نگاری کے فنی اصول و ضوابط کو شعوری طور پر پیش نظر نہیں رکھا گیا۔

''دید و شنید'' کے عنوان سے رئیس احمد جعفری کے شخصی مضامین کا مجموعہ ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ اس میں سو سے زیادہ شخصیات پر تعارفی و تاثراتی مضامین لکھے گئے ہیں قیام پاکستان کے بعد خاکہ نگاری میں بہت سے اہم نام ہمارے سامنے آتے ہیں۔ جنھوں نے اس صنف کو اپنی خصوصی توجہ سے مقبولیت کے درجے تک پہنچایا ان خاکہ نگاروں میں سعادت حسن منٹو، شاہد احمد دہلوی، احمد بشیر، محمد طفیل، ممتاز مفتی، مرزا ادیب، فارغ بخاری، رحیم گل اور ڈاکٹر ظہور احمد اعوان قابل ذکر ہیں۔

تقسیم کے بعد کے خاکہ نگاروں میں شاہد احمد دہلوی کا نام سرفہرست ہے ان کے خاکوں کے دو مجموعے ''گنجینۂ گوہر'' اور ''بزم خوش نفساں'' ہیں۔ گنجینۂ گوہر ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا اس میں کل سترہ خاکے ہیں جو کتابی صورت میں آنے سے پہلے مختلف رسائل میں چھپتے رہے ہیں۔

آپ کے خاکوں کا مجموعہ "بزم خوش نفساں" ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس کتاب کو مرتب کیا اس کتاب کے بیشتر مضامین تعارفی و تاثراتی نوعیت کے ہیں خاکہ جن فنی لوازم کا متقاضی ہے یعنی حلیہ نگاری، شخصیت کی تصویر کشی، واقعہ نگاری، وحدت تاثر غیر جانبداری وغیرہ۔ یہ لوازم شاہد احمد دہلوی کے خاکوں میں کم وبیش توازن اور تناسب کے ساتھ ملتے ہیں ان کے خاکوں کی نمایاں خصوصیت حلیہ نگاری، سراپا نگاری ہے لیکن واقعہ نگاری میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں معمولی سے معمولی واقعہ کو پر اثر الفاظ میں خاص ترتیب سے اس طرح بیان کرتے ہیں کہ صاحب خاکہ کی زندگی اور شخصیت کا پورا پرتو واضح طور سے قاری کے پیش نظر آجاتا ہے ان کی زبان ٹکسالی، سادہ، شستہ اور شگفتہ ہے شوخی، بے تکلفی اور برجستگی ان کی تحریر کی نمایاں خصوصیات ہیں انہوں نے ایک کامیاب خاکہ نگار کی طرح صاحب خاکہ کو ایک انسان کے طور پر ہی پیش کیا ہے انہوں نے اپنے مخصوص لب ولہجہ اور بامحاورہ دہلی کی زبان سے خاکہ نگاری کو بہت آگے بڑھایا اور زبان وبیان کی رنگ آمیزی سے اس صنف کو ادب کی مقبول ترین صنف بنادیا ہے۔

سعادت حسن منٹو عظیم افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب خاکہ نگار بھی تھے ۱۹۵۲ء میں ان کے خاکوں کا پہلا مجموعہ "گنجے فرشتے" کے عنوان سے اور دوسرا ۱۹۵۵ء میں "لاؤڈ سپیکر" کے عنوان سے شائع ہوا حقائق کی عکاسی، بے باکی اور جرأت اظہار جس طرح افسانہ نگاری میں ان کا شعار رہا، اسی طرح خاکہ نگاری میں بھی انہوں نے اپنے انوکھے اور منفرد انداز اور گہرے مشاہدے سے شخصیات کے ظاہر و باطن کو پیش کیا ہے 'گنجے فرشتے' میں مختلف نوعیت کے خاکے ہیں ان کے خاکوں میں افسانے جیسا وحدت تاثر اور تجسس ملتا ہے۔

۱۹۵۵ء میں عبدالمجید سالک کی کتاب "یارانِ کہن" شائع ہوئی اس میں بیس شخصیات پر سوانحی، تعارفی و اتفاقی مضامین ہیں ۱۹۵۵ء میں رسالہ نقوش کا شخصیات نمبر نکلا اس میں جملہ ۸۲ بلند پایہ ادیبوں اور شاعروں کے خاکے ان کے قریبی دوست واحباب سے لکھوائے گئے لیکن زیادہ تر انداز تعارفی رہا اور زیادہ تر شخصیات کے کارناموں پر تنقیدی و توضیحی تبصرہ کیا گیا بہت کم شخصیات کے مکمل خاکے ملتے ہیں۔

اخلاق احمد دہلوی کے شخصی مضامین کا مجموعہ "اور پھر بیاں اپنا" ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا۔ اس میں کچھ شخصی مضامین خاکے کی ذیل میں آتے ہیں ضیاءالدین احمد برنی کی کتاب عظمت رفتہ ۱۹۶۱ء میں اور اشرف صبوحی کی خاکوں پر مبنی کتاب دلی کی چند عجیب ہستیاں ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئیں اسی سال علی جواد زیدی کی خاکوں کی کتاب "آپ سے ملیئے" اپریل ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی اس کتاب میں مصنف نے تیرہ شخصیات سے ہماری ملاقات کرائی ہے لیکن یہ ملاقات رسمی، سرسری اور وقتی ہے کوئی دیرپا اثر نہیں چھوڑتی۔

شورش کاشمیری کے شخصی خاکوں کی کتاب 'چہرے' ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی اس کتاب میں مختلف عنوانات کے تحت جیسے رہنما و علماء، وزارتی چہرے، خواتین کے چہرے، صحافتی اور ادبی چہرے شاعروں کے چہرے، دوستوں کے چہرے کافی تعداد میں شخصیات پر مختصر تعارفی و تاثراتی شخصی مضامین ہیں۔

اردو خاکہ نگاری میں ایک ممتاز و معتبر نام محمد طفیل کا ہے آپ کے چھٹی دہائی سے آٹھویں دہائی تک شخصی خاکوں کے سات مجموعے 'جناب'، 'صاحب'، 'آپ'، 'مکرم'، 'معظم'، 'محبی'، 'مخدومی' شائع ہوئے ہیں آپ وہ واحد ادیب و فنکار ہیں جنھوں نے اس صنف پر خصوصی توجہ کی اور تقریباً چوتھائی صدی تک مستقل مزاجی سے اس کی آبیاری کرتے رہے ہیں انھوں نے ۱۹۵۵ء میں "نقوش شخصیات نمبر" جیسا ضخیم رسالہ نکال کر اس صنف سے اپنی دلچسپی اور وابستگی کا ثبوت دیا جہاں تک آپ کے خاکوں کے معیار کا تعلق ہے تو یقیناً فن خاکہ نگاری کے اصولوں کے مطابق لکھے گئے ہیں آپ کا دلنشیں اور رواں دواں اسلوب خاکوں میں ایک خاص حرارت پیدا کرتا ہے لب ولہجہ کی شوخی، مزاح سے پُر شیریں الفاظ اور بامعنی جملے تحریر کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

ممتاز مفتی کے خاکوں کا پہلا مجموعہ "پیاز کے چھلکے" ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا اس کے بعد خاکوں کے مجموعوں میں 'اوکھے لوگ' اور اوکھے لوگ، 'اوکھے اولڑے' اشاعت پذیر ہوئے "اور اوکھے لوگ" دراصل "اوکھے لوگ" کی ہی توسیع ہے کیونکہ اس مجموعہ میں بارہ شخصیات پہلے والی ہی رہیں

کچھ اور شخصیات کا اضافہ کردیا گیا ممتاز مفتی نے خاکہ نگاری میں اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے ایک الگ روش اختیار کی خاکہ نگاری کے بندھے ٹکے اصولوں سے ہٹ کر ہیئت کے مختلف تجربے کیے جن میں کافی حد تک کامیاب رہے آپ نے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں سے شخصیات پر سے ظاہری، مصنوعی اور بناوٹی پردوں کو ہٹا کر ان کو ان کے حقیقی روپ میں پیش کیا ہے یہ آپ کی ایک بہت بڑی کامیابی ہے کہ آپ نے اس صنف کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے خاکے کو خاکے کے انداز میں ہی لکھا ہے صاحب خاکہ کو ایک انسان کے طور پر اس کے مثبت و منفی دونوں پہلوؤں کے ساتھ پیش کر کے خاکہ کو توصیفی مضمون بننے نہیں دیا۔

مرزا ادیب کے خاکوں کا مجموعہ ''ناخن کا قرض'' ہے اس کے علاوہ ان کی خودنوشت سوانح ''مٹی کا دیا'' کے دوسرے ایڈیشن میں بھی متعدد خاکے ملتے ہیں مرزا ادیب کے شخصی خاکوں میں حد سے بڑھی ہوئی یادنگاری کا عنصر نمایاں ہے سید ضمیر جعفری کے خاکوں کے مجموعے ''کتابی چہرہ'' اور ''اڑتے ہوئے خاکے'' ہیں آپ نے اپنے مزاحیہ اور شگفتہ انداز بیاں سے اپنے ہم عصروں کے خاکے لکھے ہیں:

''جان پہچان'' نظر صدیقی کے شخصی مضامین کا مجموعہ ہے اس میں زیادہ تر مضامین تنقیدی، تعارفی اور تاثراتی نوعیت کے ہیں۔ کچھ شخصیات پر خاکہ نما تحریریں بھی ملتی ہیں۔

عطاء الحق قاسمی کی کتاب ''عطائیے'' کا نصف حصہ شخصی خاکوں پر مبنی ہے جس میں سولہ شخصیات پر قلم اٹھایا گیا ہے اس کے علاوہ ان کی دوسری کتاب ''مزید گنجے فرشتے'' ہے جس میں انہوں نے اپنے ہم عصر اہل قلم کے خاکے پیش کیے ہیں۔

فارغ بخاری کے خاکوں کا پہلا مجموعہ ''البم'' ۱۹۷۸ء میں اور دوسرا مجموعہ ''دوسرا البم'' ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئے ''البم اور دوسرا البم'' صنف خاکہ نگاری میں ایک خوبصورت اضافہ ہیں خاکہ نگاری کے جو لوازمات متعین کیے گئے ہیں وہ فارغ بخاری کے ان خاکوں میں سعادت حسن منٹو، فیض احمد فیض، ضیاء جعفری ، احمد فراز، کشور ناہید، انور خواجہ، قتیل شفائی، شاد امرتسری، ساحر

لدھیانوی، صہبا لکھنوی، احمد ظفر، پریشان خٹک، ابن انشاء اور عبدالحمید عدم کے خاکوں میں تقریباً پائے جاتے ہیں فارغ بخاری کے ہاں خاکہ نگاری کا ایک پختہ شعور وفنی ادراک اور مردم شناسی کا ہنر بدرجہ اتم ملتا ہے۔ اور انھوں نے اپنی انہیں صلاحیتوں کا ان خاکوں میں بھرپور ثبوت دیا ہے۔

رحیم گل منفرد ناول نگار، کامیاب فلم ساز و مکالمہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ خاکہ نگار بھی ہیں۔ ناولوں میں جہاں انہوں نے 'جنت کی تلاش' جیسا دلفریب ناول لکھ کر اس فن میں شہرت پائی خاکہ نگاری میں بھی ''پورٹریٹ'' اور ''خدوخال'' جیسے شخصی خاکوں کے مجموعے پیش کر کے اس فن کی قدر و قیمت کو بھی بڑھایا ہے۔ پورٹریٹ ۱۹۷۹ء اور ''خدوخال'' ۱۹۹۶ میں شائع ہوئیں پورٹریٹ میں سترہ (۱۷) اور خدوخال میں اکیس (۲۱) شخصیات کے خاکے ہیں یہ دونوں کتابیں اردو خاکہ نگاری میں منفرد اضافہ ہیں۔ ابراہیم جلیس، ریاض شاہد، عطاالحق قاسمی، خالد اختر، گلزار وفا چوہدری، اظہر جاوید، اقبال ساجد، ناصر زیدی، احمد راہی اور آغا یمین جیسی شخصیات پر خوبصورت خاکے لکھ کر نہ صرف اس فن سے آگاہی کا ثبوت دیا ہے بلکہ اردو کے منفرد خاکوں میں اضافہ بھی کیا ہے۔

''نایاب ہیں ہم'' صادق الخیری کے شخصی مضامین کی کتاب ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی اسی سال محمد ایوب قادری کی کتاب ''کاروان رفتہ'' بھی شائع ہوئی اس میں چھبیس مرحومین پر سوانحی و تعارفی مضامین ملتے ہیں مصنف نے خاکہ نگاری کی بجائے ایک مورخ کے انداز میں ان شخصیات کا خاندانی شجرۂ نسب، خاندانی احوال و آثار، عہدوں پر تقرری، علمی و ادبی کارناموں اور ادبی مشاغل کا تفصیلاً تذکرہ کیا ہے۔

''تنگ دوست'' اے حمید کے شخصی مضامین کی کتاب ۱۹۸۴ء میں منظر عام آئی مصنف کے منجھے ہوئے اسلوب اور افسانوی طرز کے حوالے اس میں دلچسپ مضامین ہیں اپنی ماضی کی خوشگوار یادوں کے سہارے شخصیات کے متعلق سرسری اور تعارفی مضامین لکھے ہیں۔ ان شخصی مضامین میں افسانوی، روداد اور آپ بیتی کا رنگ ملتا ہے تعارفی و تاثراتی مضامین کے علاوہ بعض شخصیات کے مکمل خاکے بھی پائے جاتے ہیں۔

اسی سال ۱۹۸۴ء میں نصر اللہ خان کی کتاب ''کیا قافلہ جاتا ہے'' شاعت پذیر ہوئی اس میں باون (۵۲) شخصیات کے شخصی خاکے پیش کئے گئے ہیں لطیف کاشمیری کی شخصی خاکوں پر مبنی کتاب ''جمالِ ہمنشیں'' ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی اس میں پندرہ (۱۵) شخصیات کو ان کے فن کے حوالے سے پیش کیا ہے احمد ظفر، حمید کاشمیری، سلیم کاشر، قتیل شفائی اور مصطفی زیدی پر لکھے گئے مضامین خاکے کی ذیل میں آتے ہیں۔

سید یوسف بخاری دہلوی کی شخصی مضامین کی کتاب ''یارانِ رفتہ'' ۱۹۸۷ء میں طبع ہوئی مصنف نے ان مضامین کو خاکے کہا ہے کتاب کی سرورق پر بھی شخصی خاکوں کا مجموعہ لکھا گیا ہے جب کہ مطالعہ کے بعد یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شخصیت پر لکھے گئے یہ مضامین خاکے نہیں سوانحی، شخصی اور تنقیدی مضامین ہیں۔

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کا شمار جدید خاکہ نگاروں میں ہوتا ہے اب تک درجنوں شخصیات کو اپنی کتابوں کے سکرین پر ان کے ظاہر و باطن، مثبت و منفی، روشن و تاریک پہلوؤں کے ساتھ انتہائی جاندار لب و لہجہ سے حقیقت پر مبنی واقعات کے ساتھ زندہ متحرک صورت میں پیش کر چکے ہیں ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کے شخصی خاکوں پر مبنی پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

''سب دوست ہمارے'' ۱۹۸۹ء مصنف کی خاکہ نگاری کے میدان میں پہلی کوشش ہے یہ پہلی کوشش کافی حد تک کامیاب رہی ہے کیونکہ مصنف نے اس فن سے پوری آگاہی اور شناسائی کے بعد قلم اٹھایا ہے ''حسابِ دوستاں'' شخصی خاکوں پر مبنی ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کی دوسری کتاب ہے جو کہ جنوری ۱۹۹۵ء میں منظر عام آئی 'حسابِ دوستاں' میں شامل خاکے مواد کے حوالے سے مختلف اقسام کے ہیں ان میں مکمل خاکے، متعارفی و سوانحی خاکے، تاثراتی و توصیفی عقیدت مندانہ جذبات پر مبنی خاکے، رول ماڈل قسم کے خاکے اور خالص مضامین بھی ہیں سیاسی چہرے ڈاکٹر صاحب کے شخصی خاکوں پر مبنی تیسری کتاب فروری ۱۹۹۵ء 'چہرہ بہ چہرہ' کے عنوان سے مختلف شخصیات پر لکھے گئے مضامین کی چوتھی کتاب مارچ ۱۹۹۹ء اور 'سرِ دلبراں' پانچواں مجموعہ ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئیں۔

''آدمی غنیمت ہے'' سید انیس شاہ جیلانی کے شخصی خاکوں پر مبنی کتاب ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئی بارہ شخصیات پر باقاعدہ موضوعات کے تحت خاکے لکھے ہیں اسلم فرخی کے شخصی خاکوں کی کتاب ''گلدستۂ احباب'' ۱۹۹۴ء میں منظر عام آئی اس میں سترہ شخصیات کے شخصی خاکے ہیں اعجاز رضوی کی شخصی خاکوں پر مبنی کتاب ''کلوزاپ'' ۱۹۹۴ء میں طبع ہوئی اس میں باقاعدہ عنوانات کے تحت اکیس شخصیات کے خاکے ملتے ہیں۔

''کمرے کھولے'' احمد عقیل روبی کی شخصی خاکوں پر مبنی کتاب ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی بتیس شخصیات کی خاکوں میں سب سے پہلا ان کا اپنا خود نوشت خاکہ شامل ہے ۱۹۹۵ء میں ڈاکٹر اجمل نیازی کی کتاب ''تخلص'' اشاعت پذیر ہوئی اس میں مختلف موضوعات کے تحت چالیس مضامین لکھے گئے ہیں ان مضامین میں شخصی جھلکیاں نمایاں نظر آتی ہیں بلکہ بعض شخصیات منیر نیازی، مجید امجد، ظہیر کاشمیری، سراج منیر کے تو مکمل خاکے ملتے ہیں جو کہ خاکے کے فن اور معیار پر پورے اترتے ہیں۔

''جو ملے تھے راستے میں'' احمد بشیر کی شخصی خاکوں کی کتاب ۱۹۹۷ء میں طبع ہوئی ہے اس میں بارہ شخصیات پر باقاعدہ عنوانات کے تحت لکھا گیا ہے یہ خاکے مختلف پرچوں میں چھپتے رہے تھے بعد میں یونس جاوید نے یکجا کر کے کتابی صورت دی ڈاکٹر آفتاب احمد خان کی کتاب ''بیاد صحبت نازک خیالاں'' ۱۹۹۷ء میں شائع ہوئی مصنف نے ماضی کے واقعات اور یادوں کو اکٹھا کر کے پندرہ شخصیات پر قلم اٹھایا ہے اس میں زیادہ تر مضامین تاثراتی اور تنقیدی نوعیت کے ہیں تاہم شخصیات کی ان جھلکیوں میں فیض احمد فیض اور حسن عسکری پر لکھے گئے مضامین خاکے کی ذیل میں آتے ہیں۔

جدید خاکہ نگاروں میں ایک نام ڈاکٹر محمد یونس بٹ کا ہے ''بٹ صورتیاں''، ''شناخت پریڈ''، ''قل دستہ''، ''عکس برعکس'' ان کے خاکوں کے مجموعے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں یونس بٹ نے شگفتہ اور خوشگوار انداز تحریر سے شخصیات کے خاکے پیش کیے ہیں شخصیات کی سراپا نگاری، وضع قطع،

نفسیاتی کیفیات، داخلی واردات ان تمام لوازمات کو پُر مزاح انداز سے اس طرح پیش کیا کہ قاری ان کو پڑھنے کے بعد کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

حمیدہ اختر حسین رائے پوری کی شخصی خاکوں کی کتاب "نایاب ہیں ہم" ۱۹۹۸ء میں شائع ہوئی اس میں سات شخصیات کو موضوع تحریر بنایا گیا ہے مصنفہ نے ان شخصی خاکوں میں شخصیات کی عظمتوں، رفعتوں اور اعلیٰ اخلاقی اوصاف کو ہی بیان کیا ہے۔

اشفاق احمد ورک کا شمار بھی جدید خاکہ نگاروں میں ہوتا ہے ذاتیات، قلمی دشمنی، خاکہ مستی، اور خاکہ نگری آپ کے خاکوں کے مجموعے ہیں اشفاق احمد ورک فطری مزاح نگار ہیں اپنی اسی صلاحیت کو بروئے کار لا کر خوبصورت خاکے تخلیق کئے ہیں آپ نے بڑے چھوٹے اور منفرد انداز سے شخصیات کے خاکے لکھے ہیں شگفتہ انداز تحریر کے ساتھ بڑی غیر جانبداری سے حقائق کو سامنے لاتے ہیں۔

موجودہ دور میں خاکہ اردو ادب کی ایک دلکش اور مقبول عام صنف بن گئی ہے مختصر افسانے کی طرح خاکے کی صنف کے فروغ پانے کا ایک سبب قارئین کی کم فرصتی اور مختلف شخصیات کی زندگی کے بارے میں زیادہ جاننے کی خواہش ہے یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنی پسندیدہ شخصیت کی جلوت وخلوت، اس کی زندگی کے رازوں، اس کی داخلی کیفیات سے واقف ہونا چاہتا ہے انسان اپنی اسی جبلی خواہش کی تسکین کے لیے شخصی خاکے دلچسپی سے پڑھتا ہے اور پڑھتا رہے گا یہ خواہش انسان کے دل سے کبھی معدوم نہیں ہو سکتی اسی لیے خاکے کا مستقبل شاندار ہے بشرطیکہ اس کے اظہار کے طریقے وقت کے ساتھ بدلتے رہیں اس کے ادبی معیار اور وقار کو قائم رکھنے کے لیے بلند پایہ ادیب اس کی طرف سنجیدگی سے توجہ دیں۔

حامد رضا صدیقی۔ (ریسرچ اسکالر)
شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (انڈیا)

ممتاز مفتی بحیثیت افسانہ نگار: ایک تنقیدی مطالعہ

اردو فکشن میں جن مخصوص افسانہ نگاروں کو شہرت حاصل ہے مثلاً منٹو، غلام عباس، کرشن چندر، بیدی اور عصمت چغتائی ان میں ایک نمایاں نام ممتاز مفتی کا بھی ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام اور ممتاز مفتی کے پہلے افسانے ''جھکی جھکی آنکھیں'' کی اشاعت کا سال یک ہی ہے یعنی ۱۹۳۶ء ان کا یہ افسانہ 'ادبی دنیا' کے سالنامے میں شائع ہوا۔

مفتی نے افسانہ نگاری کا آغاز بڑے منفرد انداز میں کیا۔ انھوں نے اپنے عہد کے مروجہ رویوں حقیقت نگاری یا رومان پسندی میں سے کسی ایک کو کلی طور پر اپنانے کے بجائے دونوں کے جزوی اثرات قبول کرتے ہوئے اپنی راہ الگ نکالی۔ انھوں نے اپنے لیے جس حقیقت کا انتخاب کیا، وہ انسانی نفسیات تھی جو بلاشبہ بہت بڑی حقیقت ہے، اسی طرح رومان پسندی میں نفسیاتی لاشعور اور نفسیاتی کشمکش کا اضافہ کر کے ایک منفرد موضوع کو منتخب کیا، جو اس دور میں نیا موضوع تھا۔ انسان کی نفسیاتی کیفیات مفتی کے افسانوں کا نمایاں ترین موضوع ہیں۔ ان کے ابتدائی افسانے محبت کی نفسیات کا حیرت انگیز اور پہلو دار منظر نامہ مرتب کرتے ہیں، جس میں محبت کئی روپ کئی شکلوں میں سامنے آتی ہے۔ مفتی نے اپنے افسانوں کے اس پہلو کی بڑی خوبصورت وضاحت کی ہے۔

''میں نے محبت کے موضوع پر کئی افسانے لکھے ہیں میں نے بار بار یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ محبت کئی ایک روپ دھارتی ہے اور کئی بار دوسرے جذبے محبت کا سوانگ بھر لیتے ہیں۔ کبھی نفرت کا جذبہ بھس بھس کر کہتا ہے میں محبت ہوں کبھی انتقام کا جذبہ محبت کا روپ دھار لیتا ہے کبھی حالات ایسی شکل اختیار کر لیتے ہیں کہ محبت کا سوانگ بھرے بغیر چارہ نہیں رہتا۔ کبھی ضرورت محبت ایجاد کر لیتی ہے۔''[۱]

اردو میں ان افسانوں کا دائرہ صرف نفسیات تک محدود نہیں رہتا ہے بلکہ لاشعور کی گہرائیوں تک جاتا ہے جہاں کئی آرزوئیں تمنائیں نا آسودگی کے کرب میں سسکتی ہیں اور بسا اوقات یہ سسکیاں طوفان کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور معاشرتی، ثقافتی، سماجی، روایتی اقدار جو خواہشوں کی نا آسودگی کا باعث بنتی ہیں اس طوفان کی زد میں آکر ریزہ ریزہ ہو جاتی ہیں۔ مفتی کے بیشتر افسانے اس حقیقت کو بیان کرتے ہیں۔ اسی طرح مفتی نے عورت اور مرد دونوں کی نفسیات، ساخت اور باہمی رومانی تعلق میں جنس کی کارفرمائی کو بھی اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے۔ جنس اور جنسی نفسیات مفتی کا مرغوب ترین موضوع ہے، جنس اور اس کی خواہش ہماری فطرت اور جبلت میں شامل ہے لیکن ہم معاشرتی اور سماجی طور پر ایک ایسے نظام اور روایت کا حصہ ہیں جہاں اس کا ذکر تک شرافتوں کے نام نہاد معیار کے منافی ہے نتیجہ جبر اور گھٹن مختلف ذہنی اور نفسیاتی عوارض و عوامل اور ابنارمل حرکات وسکنات کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ مفتی کے افسانوں میں جنس نگاری کا یہی پہلو نمایاں ہے۔

مفتی کے افسانے یوں تو بالواسطہ طور پر ہمارے سماجی نظام کے مختلف پہلوؤں کو بے نقاب کرتے ہیں ترقی پسندوں نے مفتی کو جلاوطن اس لیے کیا تھا کہ ان کے افسانے طبقاتی تضادات، اقتصادی ناہمواری اور سیاسی جبر و استبداد کے اظہار سے گریز کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ سیاسی، سماجی اور معاشی واقعیت کا پہلو مفتی کے افسانوں میں مدھم مدھم دکھائی دیتا ہے لیکن ایسا ہر گز نہیں کہ ان کے افسانے عام سماجی صداقتوں اور حالتوں سے کلی طور پر چشم پوشی برتتے ہوں۔ ان کے بہت سے افسانوں میں ہماری سیاسی، سماجی خاص طور پر برصغیر کی تقسیم اور فسادات کا سانحہ اپنی بھرپور تلخی سمیت موجود ہے۔

اس کے علاوہ ان کے افسانوں کے کردار جس سماج کے نمائندے ہیں ان کے طرز عمل سے اس سماج کا تجزیہ کرنا چنداں مشکل نہیں۔

مفتی کے افسانوں کا ایک نمایاں موضوع اس کلچر کی عکاسی ہے جس کا ہماری زمین، روایات

اور لوک ورثے سے کوئی تعلق نہیں، جسے مغربی فیشن اور صنعتی انقلاب نے جنم دیا ہے اور اونچے طبقے کے لوگ شب و روز اس بے جڑ، بے روح کلچر کی زد میں آئے ہوئے ہیں۔ مفتی کے افسانے اس صورت حال کو بڑے معنی خیز انداز میں بے نقاب کرتے ہیں۔ اس تہذیب اور کلچر میں سانس لینے والے افراد کی صورت حال کو بھی پیش کیا ہے۔ جن کے قدم مغربی فیشن کی ہوا دہوس، رنگینی اور مستی نے خلا میں معلق کر رکھے ہیں۔ نہ ان کے قدموں کے نیچے زمین ہے اور نہ ان کے وجود میں اپنی مٹی کی مہک، پوری طرح سے جذبات سے خالی بے حس بے ذوق لوگ ہیں۔ یہ لوگ مفتی کے آخری دور کے افسانوں کا مرکزی موضوع ہیں مفتی نے ان کی جذباتی ناآسودگی داخلی و خارجی آویزشوں اور ذہنی و روحانی شکست و ریخت کو بڑی فنکارانہ ہنرمندی سے اجاگر کیا ہے۔

مفتی کے افسانے جہاں محبت کے پہلو دار حقیقت کو بیان کرتے ہیں، انسانی باطن میں موجود انوکھی سچائیوں کو باہر لاتے ہیں اور سماجی و ثقافتی منظرنامے میں زندگی کو تلاش کرتے ہیں۔ وہاں ان کے افسانوں میں اس ابدی اور ازلی خفی و جلی حقیقت کی تلاش کے سفر کے اشارے ملتے ہیں، جو اس کائنات کی اصل ہے یعنی مفتی کے افسانوں میں چوتھی سمت کے اسرار بھی موضوع بنتے ہیں۔ روح کے نہاں خانوں میں اٹھنے والے طوفان اور اس کے نتیجے میں سچ کی تلاش اور وجود کی تکمیل کی آرزو کے کئی مناظر زندگی کی مختلف منزلوں کے عکاس ہیں روحانیت، آخری دور کے افسانوں کا غالب رجحان ہے۔

''ان کہی'' مفتی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے، جو ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا اور اس کے بھی افسانے رومانوی ہیں اس میں صرف عشق و عاشقی، محبت و الفت کی داستان ہے۔ مگر ممتاز مفتی نے محبت کی اس داستان کو بڑے منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے یہاں عام انسانی رویوں اور روزمرہ کے معمولات میں ہلکی سی تبدیلی محبت کی شدت، گہرائی اور تپش کو سامنے لاتی ہے۔ افسانے ''جھکی جھکی آنکھیں'' کا موضوع یہی ہے۔ عذرا سلیم سے محبت کرتی ہے مگر محبت کو چھپانے کے لیے وہ ہمیشہ آنکھیں جھکائے رہتی ہے۔ عذرا اس سماج اور معاشرے کی رہنے والی ہے، جہاں محبت کرنا

جرم ہے، معاشرے کے بندھنوں سے وہ مجبور ہے اس کی شادی نذر سے ہو جاتی ہے مگر وہ ہمیشہ سلیم کے جذباتی لمس اور محبت بھرے جملوں کے سحر میں گرفتار رہتی ہے۔ نذر اسے چالیس روپے کی ساڑھی دلانے کے لیے دن رات کام کر کے بیمار ہو جاتا ہے اور شدید بیمار ہو جاتا ہے۔ اور ہر بات میں عذرا کو مدد کے لیے پکارتا ہے۔ چنانچہ عذرا سلیم کی محبت کے حصار کو توڑ کر نذر کی محبت میں خود کو مدغم کر لیتی ہے۔

ممتاز مفتی ذہنی اور فکری آزادی کے تو قائل ہیں مگر ہمیشہ انھیں یہ احساس رہتا ہے کہ جس معاشرے میں وہ رہ رہے ہیں وہاں محبت زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اس کے اظہار واقرار پر کڑے پہرے ہیں اس لیے خاموش محبت اندر ہی اندر سلگتی رہتی ہے، مدھم مدھم لو دیتی ہے اور جذبے جتنے مدھم ہوں ان کے رنگ اتنے ہی دیرپا اور دل میں اتر جانے والے ہوتے ہیں۔ یہی موضوع ممتاز مفتی کے افسانے ''آپا'' کا بھی ہے۔ 'آپا' ممتاز مفتی کی اولین پہچان اور ادبی تشخص کا باعث بنا اس کی خوب پذیرائی ہوئی۔ ''آپا'' بظاہر جلے ہوئے اُپلے کی راکھ ہے لیکن باطن میں سلگتی ہوئی چنگاری ہے آپا جو دل کی گہرائیوں میں جیتی ہے جب بھی مسکراتی ہے تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ جب تصدیق ہاسٹل چھوڑ کر گھر آتا ہے تو آپا کی خاموش اور پرسکون زندگی میں ایک ہلچل سی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ دل ہی دل میں تصدق کی عبادت و محبت کرنا شروع کر دیتی ہے۔ فرنی میں مٹھاس اس لیے زیادہ ڈالنا شروع کر دیتی ہے کہ تصدق کو پسند ہے، فروٹ سلاد بنانا اس لیے معمول بن جاتا ہے کہ تصدق کو پسند ہے اور راتوں کو چھپ چھپ کر ''ہارٹ بریک ہاؤس'' مطالعہ کرنا اس کی سمندر جیسی محبت کا غماز ہے۔ لیکن آپا اس وقت شیشے کی طرح ٹوٹ کر کرچیوں میں بٹ جاتی ہے جب تصدق آپا کو چھوڑ کر ساجو سے شادی کر لیتا ہے۔ آپا اس سارے دکھ کے پہاڑ کو دل کے نہاں خانوں میں سمیٹ لیتی ہے، شادی کے دو سال بعد جب آپا تصدق اور ساجو کے گھر پر جاتی ہے اور پھر وہ موڑ آتا ہے جو کہانی کے تمام تر تاثرات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔

''بھائی جان نے مغموم آواز میں کہا، اف کتنی سردی ہے پھر اٹھ کر آپا کے قریب چولہے کے

سامنے جا بیٹھے اور سلگتے اُپلوں سے ہاتھ سینکنے لگے، بولے ممانی سچ کہتی تھیں ان جلے ہوئے اُپلوں میں آگ دبی ہوتی ہے اور اوپر سے نہیں دکھتی کیوں سجدے۔"

آپا کی آنکھ سے آنسو چھن سے چنگاری پر گرے تو تصدق نے کہا "اب اس چنگاری کو نہ بجھاؤ سجدے، دیکھو تو کتنی ٹھنڈ ہے۔" ۱؎

اس مختصر مکالمے میں کہانی کی پوری روح آ گئی ہے۔ 'آپا' کردار نگاری کے حوالے سے ممتاز مفتی کا شاہکار افسانہ ہے۔

"مہندی والا ہاتھ" اور "ماتھے کا تل" بھی محبت ہی کی کہانیاں ہیں لیکن ان میں نفسیاتی حوالے خاص طور پر لاشعور سے شعور کی سطح تک کا ذہنی سفر چونکا دینے والے انداز میں سامنے آتا ہے۔ ان افسانوں میں مفتی کی اپنی نفسیات اور سوانح بہت نمایاں ہے، جس کا مکمل ثبوت "علی پور کا ایلی" ہے اور خاص طور پر "مہندی والا ہاتھ" مفتی کی اپنی جنسی نفسیات کو بڑی وضاحت سے بیان کرتا ہے۔ دراصل مفتی کے لاشعور میں بچپن کے بعض واقعات اس طرح جمع ہوئے ہیں کہ ان کا عکس اکثر اوقات ان کے افسانوں کے واقعات، میں کرداروں اور جملوں میں بار بار صورت پذیر ہوتا ہے۔ بہر حال "مہندی والا ہاتھ" مفتی کی نفسیات اور سوانح کا مظہر ہونے کے باوصف ایک ایسا افسانہ ہے جس میں خود کلامی کی کیفیت ملتی ہے۔ فلسفی و منطقی سا بھائی جو انگوٹھی اور مہندی والے ہاتھ سے سخت نفرت کرتا ہے۔ لہٰذا گھر میں ان دونوں چیزوں پر سخت پابندی عائد ہے پھر بھی بہت شرارت کرتے ہوئے آصفہ کے ہاتھوں کو انگوٹھی اور مہندی سے سجا کر بھائی کے پاس بھیجتی ہے۔ کہ نفرت اور غصہ کا حیرت انگیز تماشا ہو گا مگر تماشا یہ ہوا کہ بھائی دیوانہ وار آصفہ کے ہاتھوں کو چومنے لگا۔ ممتاز مفتی نے اس افسانے میں یہ نازک سا نفسیاتی نکتہ بیان کیا ہے کہ محبت اور نفرت وحشت اور لگاؤ ایک ہی کیفیت کے دو رخ ہیں جن باتوں کو ہم لاشعور میں دھکیل دیتے ہیں وہ جب ابھرتی ہیں تو ان کی شدت بہت کڑی ہوتی ہے۔

"ماتھے کا تل" جہاں 'شہزاد کے ماتھے کے تل کی یاد دلاتا ہے وہیں لاشعوری طور پر ایک دیو

کی بھابی سے محبت بھی ہے۔ جسے شعور کی سطح پر بھابی کے تقدس اور احترام کا احساس تو ہے مگر لاشعوری طور پر وہ اس کی محبت میں گرفتار ہے۔ وہ تسلیم میں بھی بھابی کی شباہت محسوس کرتا ہے اور رشتے کے لیے بھابی کو ساتھ لے کر جاتا ہے کہ اسے اب تسلیم کی تصویر دیکھے بغیر نیند نہیں آتی۔ بھابی جب تکیہ اٹھا کر دیکھتی ہے وہ چہرے سے ہنستی ہے مگر آنکھوں سے رو رہی ہوتی ہے۔ ''ماتھے کا تل'' نفسیات کا وہ جانا پہچانا رنگ بھی ہے جسے ایڈی پس کمپلکس سے تعبیر کیا گیا ہے جو مفتی کی نفسیات میں بہت نمایاں ہے۔

''سیانی''، ''خلط ملط''، ''غسلِ آفتابی''، ''مورا''، ''اندھا'' اسی پس منظر کی کہانیاں ہیں۔ جنسی نفسیات مفتی کا پسندیدہ موضوع ہے مگر اس نے جنس کو محض لطف اور لذت کے لیے نہیں پیش کیا بلکہ اس میں انتہائی باریک بینی اور نفسیاتی حوالے تلاش کیے ہیں وہ جسمانی اور جنسی اعضاء کی کشش اور خوبصورتی کا تو قائل ہے مگر کہیں بھی انھیں حیوانی سطح کی سستی گھٹیا لذتیت کا شکار نہیں ہونے دیتا۔ دراصل مفتی کا خیال ہے کہ کسی فرد کی شخصی تعمیر و تشکیل اور اس کی فطرت کو سمجھنے کے لیے جنس اور جنسی تجربات فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں'' خلط ملط'' کا موضوع بچوں کے ناپختہ ذہنوں کے وہ سوال ہیں جو وہ جنس سے متعلق کرتے ہیں اور ان کو گندی بات کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے بلکہ کبھی کبھی ان کی سختی سے سرزنش بھی کی جاتی ہے گھر کے اندر مزا دینے والی نیم عریاں تصویریں ان کے تجسس کو ابھارتی ہیں اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ چھپ چھپ کر ان سے لذت آشنا ہونے لگتے ہیں اور پھر گھٹن کی کیفیت آگے چل کر مختلف بیمار ذہنی رویوں کی صورت میں انفرادیت سے اجتماعیت میں ڈھل جاتی ہے۔

''غسلِ آفتابی'' اور ''مورا'' اُن کٹھ ملاؤں کی کہانیاں ہیں جو بظاہر تو بہت متشرع اور متقی نظر آتے ہیں لیکن جبلی طور پر ان عام انسانوں سے زیادہ ان معاملات اور موضوعات میں لذت محسوس کرتے ہیں، جن سے وہ بظاہر بچتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مفتی کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ شعور اور لاشعور کے تصادم کے بعد بڑی خوبصورتی سے کثافت و غلاظت کو ان کے طے کردہ لطافت اور صراط مستقیم میں بدل دیتے ہیں اور مولویوں کی منافقت سے آشنا کرا دیتے ہیں جو معاشرے میں کئی

المناک کہانیوں کو جنم دیتی ہے۔ ''ان کہی'' کے افسانوں کا انداز بیانیہ ہے۔ ''ان کہی'' کی گہری معنویت نے بہت سے ذہنی و انسانی مسائل کو ان کہے انداز میں ایسے پیش کر دیا ہے کہ ہر بات کہی جانے کے باوجود نہ کہے جانے کا حسن رکھتی ہے۔

ممتاز مفتی نے اس کے بعد جنسی ناآسودگی، عورت کے مضطرب اور ناآسودہ جذبے، مرد اور عورت کی جنسی خواہشات، جنسی کشمکش اور جنس کے جذباتی اور نفسیاتی مسائل کو موضوع بنایا ہے ''بدماش'' کا موضوع اور اس کی فضا عصمت چغتائی کے افسانوں کی یاد دلاتی ہے۔ جنسی نوعیت کے اس افسانے کی ابتداء ہی اس کا انجام اور کلائمکس ہے مگر اس میں عریانیت اور تلذذ پسندی نہیں ہے بلکہ ڈھکی چھپی نفاست مفتی کی فنکارانہ ہنرمندی ہے۔ شیرا بد ''بدماش'' جو یو پی جوڑے میں ملبوس دل آرا کو اپنی پوربن سمجھ کر گھیرتا ہے دل آرا جو رشید جیسے معزز شخص کی بیوی ہے جنسی طور پر ناآسودہ ہے۔ دل آرا جسمانی طور پر بہت گرم اور آگ کا شعلہ ہے، وہ رات کی تاریکی میں شیرا کو قبول کر لیتی ہے اور شیرا مغلوب ہو جاتا ہے اور اپنے دوست سے اپنی کیفیت اور مستقبل کی منصوبہ بندی کا اظہار بڑے دلکش انداز میں کرتا ہے۔

''میرے یار حد ہو گئی وہ سالی پوربن یوں پی گئی گویا شیرا نہ ہو پانی کا گلاس ہو۔۔۔ اچھا اب کے جو ملے۔۔۔ بھی ساری عمر یاد نہ کرے تو میرا نام شیرا نہیں تمہاری قسم۔'' [۳۵]

اس میں ممتاز مفتی نے جنس کی مختلف پیچیدگیاں اور خواہشات و جذبات کو ایک خوبصورت کہانی کا روپ دے دیا ہے۔ ابتدا ہی کہانی کا اصل نکتہ ہے جو قاری کو دھیرے دھیرے انجام کی طرف لاتا ہے اور وہ مفتی کی کاریگری کا دل سے قائل ہوتا چلا جاتا ہے۔ شیرا سے نفرت ختم ہو جاتی ہے اور دل آرا سے ہمدردی بھی محسوس کرنے لگتا ہے جو مفتی کا ممتاز ترین نظریہ فن ہے۔ بقول ممتاز مفتی:

''میرے نزدیک ادب کی سب سے بڑی خصوصیت لوگوں کے دلوں میں کرداروں سے ہمدردی پیدا کرنا ہے، نفرت یا تمسخر نہیں۔'' [۳۶]

''جب اور اب''، ''چپ''، ''دام خیال''، ''زندگی'' یہ تمام کہانیاں جنسی پیچیدگی جنسی آسودگی،

محبت ونفرت، جنسی جذبات وخواہشات کی کہانیاں ہیں۔ 'جب اور اب' میں ایک دیور بھابی کی جذباتی اور جنسی ناآسودگی کی کہانی ہے اور دونوں اپنی زندگی کے ہمسفر سے نالاں ہیں، مجید اپنی خوبصورت حسین وجمیل سلیمہ سے محبت کرنے کے بجائے گھر کی نوکرانی بانو پر مرتا ہے، تو حمید اپنی بیوی انوری کی بے وفائی کا شکار ہے۔ سلیمہ اور حمید لاشعوری طور پر ایک دوسرے میں مجید اور انوری کی پرچھائیاں محسوس کرتے ہیں۔ کہانی لاشعور سے شعور تک آتی ہے تو خواب ٹوٹ جاتا ہے اور زندگی کی تلخ حقیقت اور محبت کا تلخ انجام ان کے سامنے ہوتا ہے جسے دلی جذباتی اور نفسیاتی طور پر قبول کرتے ہوئے بھی دراصل قبول نہیں کر پاتے کہ ان کے درمیان محترم رشتہ موجود ہے۔

"جب اور اب" اور "چپ" میں ایک موضوعاتی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ محبت کا ہونا پھر نفرت کا غالب آنا محبت کا نفرت میں بدلنا اس طرح کہ اس کا جواز تک بعض اوقات معلوم نہیں ہوتا، افسانے کی ابتدا اسی فلسفے سے ہوتی ہے۔

"اے میاں محبت کی اوٹ میں لوگ کیا کیا نہیں کرتے کئی صرف اس لیے محبت کرتے ہیں کہ انہیں اپنے آپ سے نفرت ہوتی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ کسی میں کھو کر اپنے آپ کو بھلا دیں یا کسی کی بے وفائی کے بہانے غم کھا سکیں مرجانے کی آرزو کر سکیں ایسے بھی ہیں جو کسی سے انتقام لینے کے لیے اپنا محبوب بنا لیتے ہیں اکثر تو محبت سے محبت کرتے ہیں، محبوب سے نہیں۔" ۵

نزہت ایک حسین وجمیل لڑکی ہے لیکن زبان کی گونگی ہے اور بقول ممتاز مفتی:

"جذباتی مد وجزر سے یوں بیگانہ تھی جیسے کسی نے کلف لگا کر استری کر دی ہو، جوانی کے باوجود اس میں ایک کرختگی تھی جیسے کسی 'کھوئے دان' میں ہوتی ہے جو گلی کوچوں میں پھیے پھیے بکتی اور جس میں کھویا قطعی نہیں ہوتا۔" ۶

اس افسانے کا ہیرو مجسمہ جیسی وجود رکھنے والی شوخ اور چنچل فعال لڑکی کو چھوڑ کر جذباتی طور پر ٹھنڈی سا کن لڑکی نزہت سے شادی کر لیتا ہے، شادی کے بعد اسے احساس ہوتا ہے کہ محبت میں سکون اور جمود نہیں ہونا چاہیے، محبت حرکت و عمل پیچیدگیاں بے قراری اور تڑپ ہونی چاہیے کیونکہ سکون موت کی علامت ہے اور محبت کی حدت زندگی کی موت ہے اس مسلسل جمود کو بڑے معنی خیز انداز میں بیان کرتے ہیں:

''اب تو ہماری زندگی ابلے ہوئے چاولوں کی طرح پھیکی پڑ گئی ہے۔'' ؎

نزہت جب میکے چلی جاتی ہے اور تین سال تک مستقل رک جاتی ہے تو وہ وقفے وقفے درمیان میں خط لکھتی رہتی ہے اور وہ خطوط ایک ہی جملے پر مشتمل ہوتے ہیں کہ ''امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے'' اور میاں جذباتی طور پر اپنی بیوی کی طرف سے برملا جذبات کے اظہار کا خواہش مند ہے اور وہ اسی پیچ پیچ میں رہتا ہے کہ میری بیوی مجھ سے اپنے جذبات واحساسات اور میری محبت اور چاہت کا اظہار کرے اگرچہ ان میں سچائی کی رمق کہیں بھی نہ ہو۔ یہ مردوں کی نفسیات ہوتی ہے کسی مرد کا طوائف سے محبت کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ نزہت کی محبت خاموش ہے، دونوں اندر سے بکھرے اور ٹوٹے ہوئے ہیں اور دونوں کے اندر جذبات کا تلاطم اتھل پتھل کر رہا ہے اور وہ ایک دوسرے کے بلا دے کے منتظر بھی ہیں۔ مگر جھوٹی انا دونوں کو روکے ہوئے ہے اور انتقام محبت کا روپ دھار کر دوری کی خلیج کو اور وسیع کرتا جا رہا ہے۔

''دام خیال'' اور ''زندگی'' کی مضطرب اور نا آسودہ جذبوں کی کہانیاں ہیں۔ نزہت (دام خیال) اور عطیہ (زندگی) عورت کی حیثیت یعنی محبوبہ اور عورت کی شکل میں اضطراب اور نا آسودگی کی علامت بن جاتی ہیں۔ دونوں افسانوں کی ابتداء ہمیں ایک اور اداس کہانی کے لیے ذہنی طور پر تیار کرتی ہے۔

''سامنے میز پر کتابوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا، انگیٹھی پر الماریوں میں کتابوں کی قطاریں کھڑی تھیں اس کے ہونٹوں پر حقارت بھرا تبسم آ گیا۔ ناک پر ہلکی سی سرخی جھلک گئی بھنویں سمٹیں

اور ماتھے پر شکن بن گئیں، وہ محسوس کرنے لگی جیسے وہ خود کسی کتاب کا جز ہو یا کوئی اکھڑا ہوا ورق یا جیسے وہ کتاب میں جی رہی ہو" ۸

"دام خیال" کی انتہائی خوبصورت ذہین و فطین لڑکی جیلی جسے لڑکوں کے درمیان رہتے ان سے لڑنے ان سے گپیں مارنے اور ان کے ساتھ کھیلنے میں بہت مزہ آتا ہے۔ خالہ کے گھر پر مہمان آئی ہے ایک نوجوان کو جو اس کے دام الفت میں پھنس گیا ہے، اپنا نام اس سے غلط بتا دیتی ہے کہ وہ نزہت ہے جو اس کی خالہ زاد بہن کا نام ہے اور جسمانی کشش سے وہ ایک محروم لڑکی ہے۔ نوجوان نزہت کے نام خط لکھتا ہے نزہت تمام عمر صرف ان خطوط سے محبت کرنے میں گزار دیتی ہے جو دراصل جیلی کے نام ہوتے ہیں۔ اسی طرح "زندگی" کی عطیہ اپنے پروفیسر شوہر کے بھرپور التفات کی متمنی ہے اور اس کے اندر جنسی ناآسودگی ہے مگر پروفیسر کتابوں کی تخیلاتی دنیا میں گم سم رہتے ہیں اور پھر پڑوسی کی بھدی آواز 'آگ لگی اس من میں' عطیہ کے جذبات کا صاف طور پر ترجمانی کرتا ہے۔

ممتاز مفتی صرف ایک واقعہ نگار نہیں بلکہ دل کی پیچیدہ خواہشات اور ذہن کے الجھے ہوئے خوابوں کے سحر کار مصور ہیں۔ اس مصوری میں وہ علامتی یا تجریدی انداز نہیں اپناتے ہیں، بلکہ صاف اور سادے لب ولہجہ میں حقیقتوں کی تمام تر پہلوداری میں رمزیت اور تہہ داری کو بیان کرتے ہیں اس طرح کہ ہم خود اپنے دل کے نازک پیچ وخم سے واقف ہو جاتے ہیں۔ شدت احساس کی لہر ان افسانوں پر چھائی ہوئی ہے، جذبات واحساسات کا گہرا تاثر مفتی کی اپنی زندگی اور ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ بقول نذیر احمد:

"'گہما گہمی' میں افسانہ نگاری کی اپروچ وہی ہے جو 'ان کہی' میں ہے، بیانیہ پیرایہ بھی ویسا ہی ہے کہانی کی بُنت میں بدستور تحیر وتجسس کو سمویا گیا ہے، قاری کی توجہ پر افسانہ نگار کی گرفت مضبوط ہے۔ جنسی موضوعات کے بیان میں بے باکی اور پیرایۂ اظہار میں نفاست برقرار ہے۔" ۹

ممتاز مفتی کی "سندرتا کا راکشس"، "ان پورنی"، "کھل بندھنا"، "اپسرا حویلی"، ہندی متھ سے متعلق تاثر انگیز کہانیاں ہیں۔ یہ اس بات کی بھی غماز ہیں کہ مفتی کو ہندی تہذیب اس کے لوک ورثہ اور ہندی زبان پر کمال مہارت اور عبور حاصل ہے اگرچہ ہندی کے بعض لفاظ عام قاری کی تفہیم کی سطح سے بالاتر ہیں مگر افسانوں کی روانی اور ابلاغ کے راستے میں حائل نہیں ہوتے۔ سندرتا کا راکشس اپریل ۱۹۸۱ء میں رسالہ "فنون" میں شائع ہوا جو توجہ کا مرکز بنا۔ کہانی کا آغاز نئی تہذیب کی پروردہ دو نوجوان خوبصورت لڑکیوں شیلا و بملا سے ہوتا ہے، جو سچ کی تلاش میں سوامی جی کی کٹیا پر پہنچتی ہیں اور وہ اپنا اور عورت کا بھید پانا چاہتی ہیں اور برابری کے فلسفے کو سمجھنا چاہتی ہیں ان کی خواہش ان لفظوں میں ہوتی ہے۔

"میرے پتی نے مجھے دیوی بنا رکھا تھا اتنا پیار کرتا تھا کہ وہ پوجا لگتی تھی، میں کہتی پرکاش مجھے دیوی نہ بناؤ امر بناؤ ساتھی جانو برابر کا ساتھی۔ اونہوں، بملا نے آہ بھری وہ برابر کا نہیں جانتے ساتھی نہیں مانتے یا تو دیوی بنا کر پوجا کرتے ہیں یا باندی سمجھ کر حکم چلاتے ہیں۔" ۹؎

شیلا اور بملا دونوں نئی تہذیب اور تمدن اور معاشرے کی عورت کی نمائندہ ہیں۔ ان کی گفتگو کے جواب میں بانکے جی رانی وجے وتی کی کہانی سناتے ہیں، رانی وجے وتی:

"سندرتا میں وہ سب سے اتم تھی صرف ناک نکسہ ہی نہیں اس کی چال ڈھال رنگ روپ سبھاؤ سبھی کچھ سندرتا میں بھیگا ہوا تھا پلکیں اٹھاتی تو دیپ جل جاتے ہونٹ کھولتی تو پھول کھل اٹھتے، بانہہ ہلاتی تو ناگ جھولتے بھرپور نجر سے دیکھتی تو رنگ پچکاری بھگو کر رکھ دیتی۔" ۱۰؎

وجے وتی کا حسن قاری میں اضطراب پیدا کرتا ہے کہ یہ حسن خاک میں کیسے ملا؟ اور راج گڑھی میں آدھی رات کے وقت اس کی دردناک آوازیں کیوں سنائی دیتی ہیں یہ خالصتاً داستانوی انداز ہے، وجے وتی کو عورت اور مرد کے درمیان مساوات اور سچ کی تلاش ہے اور اسے اس تلاش سے روکا جاتا ہے کیونکہ اس کا انجام المناک ہوگا۔

"مہارانی سچ کے کھوج کی لگن نہ لگا سچ کوئی میٹھا پھل نہیں وہ جھوٹ جو شانت کر دے اس سچ سے اچھا ہے جو اندر بھٹی سلگا دے، پرنتو مہارانی کو سچ کی ڈھونڈھ کا تاپ چڑھا تھا بولی منش کی رتھ دو پہیے لگے ہیں پُرش اور استری رتھ کیسے چل سکتی ہے جد تو ڑی دونوں پہیے برابر نہ ہوں۔" ۱۲؎

رانی کے جذبات سے قاری کے اندر ایک اور تجسس پیدا ہوتا ہے وہ چہرے پر بھبھوت مل سندرتا چھپائے اپنے سوال کی تلاش میں نکل پڑتی ہے کہیں پھلکاریاں کاڑھتی ہے، کہیں کپاہ کے پھول چنتی ہے، کہیں کھیت میں گندم کے بیج ڈالتی ہے۔ مگر ہر جگہ اس کے حسن کا راز عیاں ہو جاتا ہے، اسے دیوی سمجھ کر اس کی پوجا شروع ہو جاتی ہے تو وہ اس سے آگے چل پڑتی ہے اور آج بھی اس کی روح برابری کی ڈھونڈھ میں بھٹکتی پھرتی ہے۔

اس کہانی میں مفتی نے کمال فنکاری سے جدید عہد کی عورت کی سوچ اور فکر، فلسفۂ تانیثیت، مساوات Women Empowerment, Gender Equality کی تلاش کو ہندی کی اس کہانی میں سمیٹ دیا ہے۔ جتھہ اور فلسفہ کو بڑی فنکاری سے بیان کیا ہے کہ قدرت کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں، کسی مذہب، کسی کلچر، کسی قوم، کسی علاقے میں انہیں چیلنج نہیں کیا جا سکتا اور مفتی نے یہ بھی کمال دکھایا ہے کہ کہیں بھی فن پر اخلاقیات کو حاوی ہونے نہیں دیا۔ "ان پورنی" اور "کھل بندھنا" بھی جدیدیت کے عہد میں تانیثیت کے کیا مسائل ہیں Gender Equality، مساوات اور برابری کی تلاش کی جدوجہد میں وہ کلچک میں کس طرح داخل ہو جائے گی۔ یہ سارے مسائل ان جدید عورتوں کے نام ہیں یہ سارے مسائل ہندو دیو مالا سر اور موسیقی، لوک گیت اور رقص کے خوبصورت پس منظر میں بیان کیے گئے ہیں۔ بقول پروفیسر نذیر احمد:

"ان پورنی جیسا افسانہ فن کار کے گہرے وجدان کا ثمر ہے اور ایسا وجدان اور ایسی معرفت جس کا مقصد زندگی کی اصلیت کی تلاش ہوتا ہے، زندگی کا ظاہری روپ اپنے سے کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہو۔" ۱۳؎

اس کہانی کی ابتدا ان پورنی کے تعارف سے اس طرح ہوتی ہے۔

''پتلی دبلی سوئی سوئی کھوئی کھوئی، ڈولتی، چھوئی موئی خود سے دور لے جانے والی ایک گائیک تھی ان پورنی۔۔۔ گائیکی میں بھی وہ ایسی جاذب نہ تھی کہ سننے والے تڑپ کر رہ جائیں الٹا وہ تو سنانے کے لیے گاتی ہی نہ تھی، نرت لبھانے کے لیے نہ کرتی اپنے قریب لانے کے لیے نہیں الٹا دور لے جاتی گائیکی میں تیرتی نہ تھی ڈوب جاتی تھی، جیسے خود کو سدھ بدھ نہ رہے وہ دوسرے کی سدھ بدھ کیا مارے گی۔'' ۱۴

ان پورنی کی یہ انفرادیت اور انوکھا پن کسی کے ریاست کے مہاراجہ کا لڑکا آنند کمار بڑے حیرت اور تجسس میں مبتلا ہو جاتا ہے اور ان پورنی کے پاس آتا ہے اور اس کی مشرقی تہذیب و تمدن اور مشرقی حسن و ادا کا شاہکار اور اس کی فلسفیانہ گفتگو کا ایک ایک جملہ اس کے دل میں اترتا چلا جاتا ہے۔

''مہارج میں نام کی ان پورنی نہیں جیو کی بھی ان پورنی ہوں اپنے آپ میں پورن نہیں ادھوری ہوں مہاراج آدھی ہوں آدھی نہیں ہوں۔'' ۱۵

ان پورنی کی زندگی کا المیہ یہ ہے کہ عین شادی کے دن جب خوشی میں بندوق چلتی ہے تو اس کی گولی اس کے پتی دیو کو جا لگتی ہے اور وہ مر جاتا ہے ان پورنی سہاگن ہونے کے بجائے ان پورن رہ جاتی ہے پھر کلموں نہیں ''ابھاگن' اور نحس جیسے الفاظ اسے سچ کی تلاش کی طرف لے آتے ہیں۔ یہاں ہمیں مفتی کہیں نہ کہیں گوتم بدھ کے فلسفے سے متاثر نظر آتے ہیں کہ تمام دکھ کا سفر بالآخر نروان پر ہی ختم ہوتا ہے ان پورنی بھی سچے سر اور حقیقت کی تلاش میں نکلتی ہے اور یہی سر کی ڈھونڈ اسے ہی نہیں آنند کی رکھ بر ہم کی تلاش پر لگا دیتی ہے اور جب تھک کر وہ اپنی تکلیفوں کی گٹھری اس کے در پر رکھتی ہے تو ساری بیڑیاں کٹ جاتی ہیں اور سوامی ہمیش کا آسیر واد ملتا ہے۔

''اس پتری کے راستے کا پتھر ہٹ گیا اسے راستہ مل گیا جاؤ پتری اب تم آزاد ہو پاؤں کی بیڑی کٹ گئی دھن بھاگ تمہارے۔'' ۱۶

ان پورنی چوتھی سمت کی تلاش کے سفر کی وہ کہانی ہے جس کے آخر میں وہ راستہ صاف دکھائی

دیتا ہے جس میں نروان اور حقیقت موجود ہے۔ اس افسانے کا اسلوب ہندی اساطیر اور ہندی لب ولہجہ سے مزین ہے جو روحانیت کے تاثر، سچ کی تلاش کی گہرائی اور اثر انگیزی لیے ہوئے ہے۔

ممتاز مفتی کے افسانوں میں غالب رنگ ان کے سوانحی حالات اور ذاتی تجربات و مشاہدات کا ہے۔ انھوں نے سماجی اور خارجی وقوعات کی بجائے افراد کے داخلی وقوعات پر زیادہ نظر رکھی ہے، ان کے بیشتر کردار بھی اپنی باطنی کیفیات اور تضادات کے ساتھ اپنی ذات کا انکشاف کرتے ہیں۔ سماجی سطح پر سانس لینے کے باوجود وہ اپنے اندر زندہ رہتے ہیں۔ مفتی کے افسانوں کا مرکزی تجربہ عورت ہے۔ انھوں نے خاص طور پر عورت کی کئی نفسیاتی جہات بڑی فنکارانہ، ہنر مندی کے ساتھ بیان کی ہیں۔ وہ عورت کو اس کی حساسیت اور تخلیقی جوہر کے باعث اپنی کائنات میں مرد کے مقابلے میں افضل مقام دیتے ہیں۔

انھوں نے زیادہ تر بیانیہ انداز میں موضوعات و واقعات اور کرداروں کی تہہ در تہہ کیفیات کو بے نقاب کیا ہے لیکن کہیں کہیں مکالمہ بھی اس سلسلے میں ان کا مددگار رہا ہے۔ ان کے اسلوب میں روانی بے ساختگی، بے تکلفی، بہاؤ اور اپنائیت ہے، جس کی بدولت قاری کے ساتھ ان کا جذباتی اور ذہنی رشتہ استوار ہو جاتا ہے اور یہی مفتی کے افسانوں کی مقبولیت کا راز ہے۔

ممتاز مفتی کا شمار ان تخلیق کاروں میں ہوتا ہے، جنھوں نے ذریعہ اظہار اور تخلیقی اسلوب کی بنیاد اردو زبان کو بنایا لیکن یہ اہل زبان کی اردو نہیں بلکہ مفتی کی اپنی زبان ہے جو پھیلنے اور جذب کرنے کی صلاحیت سے معمور ہے۔ یہ پنجابی کی کوکھ سے پھوٹنے والی وہ زبان ہے جو نہ صرف لفظ اور لہجے کی تازگی اور دلکشی کے نئے زاویے منعکس کرتی ہے۔ بلکہ اس کی لچکدار کیفیت اپنے سماج اور اس سماج میں زندگی گزارنے والے افراد کی الجھی ہوئی سیال کیفیت کو سہولت اور روانی کیساتھ بیان کرنے پر قادر ہے۔ یہ زبان اپنا داخلی نظام خود مرتب کرتی ہے اس زبان کا اپنا محاورہ ہے اور اپنا روزمرہ ہے، یہ اپنا انداز خود وضع کرتی ہے جس میں سادگی، روانی، شگفتگی، بے ساختگی اور تازگی سب کچھ موجود ہے۔

اردو کی نئی لسانی تشکیل میں مفتی کا نمایاں کردار ہے۔ انھوں نے پنجابی انگریزی کی آمیزش سے زبان کا وہ تاثر وضع کیا ہے، جو فی زمانہ بڑا مانوس اور فطری محسوس ہوتا ہے کیونکہ یہ آج کے پڑھے لکھے طبقے کی زبان کا تاثر ہے، جس میں علاقائی اور بدیسی زبان کی آمیزش نے وسعت کی نئی جاذبیت پیدا کردی ہے۔ یہ زبان ابلاغ کی زبان ہے مفتی ادب میں (Communication) کی عظمت کو مانتے ہیں، اس لیے وہ پیچیدہ علامت کے بھی خلاف ہیں کیونکہ بڑا ادیب کہانی کے پردے میں ایک پیغام رکھتا ہے جو قاری کے وجدان کو اسی صورت میں چھو سکتا ہے جب رمز کے پہلو بہ پہلو وضاحت بھی موجود ہو۔

مفتی کا تخلیقی تخیل اور تخیلی مشاہدہ کسی بھی نفسیاتی جذباتی یا رومانی تجربے کے اظہار کے لیے زبان کے نامعلوم خطوں سے الفاظ کے ایسے ناتراشیدہ جواہرات ڈھونڈ لاتا ہے کہ وہ سجے سنوارے اور تراش وخراش کے مرحلوں سے گزرے لفظوں سے زیادہ بامعنی اور دلنواز محسوس ہوتے ہیں۔ مثلاً چٹ کپڑی، ناعورت، چھلکن، ڈب چھلکے، گھمسن گھیریاں، ان پورنی، ڈکھمن دکھن، اور معنی کے کئی شیڈز رکھنے والا لفظ لت پت۔ یہ الفاظ مفتی کی زبان اور ہمارے وجدان میں ایک حیرت انگیز سہولت کے ساتھ جگہ بنا لیتے ہیں اور مفتی کی پہچان بن جاتے ہیں۔ مفتی کا لفظیاتی نظام Diction خالصتاً اس کا اپنا ایجاد کردہ ہے جس میں ایک خاص قسم کی بے ساختگی اور اپنائیت موجود ہے۔

مراجع ومصادر

۱ ممتاز مفتی، مجموعہ رام دین، ص ۱۸۸، فیروز سنز لاہور ۱۹۸۶ء

۲ ممتاز مفتی مفتیانے (افسانوی کلیات) ص ۵۲، فیروز سنز لمیٹڈ لاہور ۱۹۸۹ء

۳ ممتاز مفتی مفتیانے (افسانوی کلیات) ص ۲۶۴، فیروز سنز لمیٹڈ لاہور ۱۹۸۹ء

۴ ممتاز مفتی غبارے، ص ۱۸

۵ ممتاز مفتی مفتیانے (افسانوی کلیات) ص ۵۱۴، فیروز سنز لمیٹڈ لاہور ۱۹۸۹ء

۶ ممتاز مفتی مفتیانے (افسانوی کلیات) ص ۵۱۷، فیروز سنز لمیٹڈ لاہور ۱۹۸۹ء

۷ ممتاز مفتی مفتیانے (افسانوی کلیات) ص ۵۲۶ ، فیروز سنز لمیٹیڈ لاہور ۱۹۸۹ء
۸ ممتاز مفتی مفتیانے (افسانوی کلیات) ص ۵۴۱ ، فیروز سنز لمیٹیڈ لاہور ۱۹۸۹ء
۹ نذیر احمد فکشن نگار، ممتاز مفتی، ص ۱۳۴ تا ۱۳۶
۱۰ ممتاز مفتی مفتیانے (افسانوی کلیات) ص ۱۱۴۳ ، فیروز سنز لمیٹیڈ لاہور ۱۹۸۹ء
۱۱ ایضاً ص ۱۱۳۵
۱۲ ایضاً ص ۱۱۳۶
۱۳ نذیر احمد فکشن نگار، ممتاز مفتی ، ص ۳۵۷
۱۴ نذیر احمد فکشن نگار ، ممتاز مفتی ، ص ۱۱۲۶
۱۵ ایضاً ص ۱۱۳۹
۱۶ ایضاً ص ۱۱۷۶

پروفیسر سیّدہ نغمہ زیدی

سیاسیات مشرق و مغرب اور اقبالؒ

اقبالؒ ایک ایسے زمانے میں پیدا ہوئے۔ جب کہ مشرق و مغرب میں زندگی اور اس کے مختلف شعبوں میں عجیب و غریب انقلاب نمودار ہو رہا تھا۔ مشرق کی جہاں گیریاں، جہاں ستانیاں ختم ہو چکی تھیں اور مغرب کی سیاسی فتح مندیوں کے قدم بقدم ذہن اور فکر کی فتوحات کا سکہ بھی بیٹھ رہا تھا۔ اہلِ مشرق اور بالخصوص مسلمانوں کی آنکھیں مغرب کے روشن تخیلات سے چندھیائی جاری تھیں ہر سمت زوال اور پستی کا احساس پیدا ہو گیا تھا اور مرعوبیت کی حد یہ تھی کہ ہر شعبۂ زندگی میں مغرب کی تقلید کو ترقی و کامرانی کے لیے لازم و ملزوم سمجھا جانے لگا تھا۔

ایسے میں اقبالؒ نے جو شاعری کی اس میں سیاست ایسے گھلی ملی ہوئی ہے جیسے دانتے کی شاعری اور فلارنس کی سیاسیات۔ اقبالؒ نے اگرچہ مغربی تعلیم بھی حاصل کی اور مدتوں تہذیب فرنگ کے گلستاں سے سیراب بھی ہوتے رہے مگر پیران مشرق کے فیض صحبت سے وہ جس قدر یورپی افکار و خیالات کا مطالعہ کرتے رہے اسی قدر اُن کے ذہن میں مغربی افکار و انداز کی اصلیت وحقیقت واضح ہوتی چلی گئی اور اس طرح مغربی سیاست کے نظری اکتساب اور تجرباتی ادراک نے اقبال کو اس نظر فریب تہذیب کے دام میں پھنسنے سے بچالیا۔ اور انھوں نے اپنے نہاں خانہ دل میں خیالات کی ایک نئی بستی کی بنیاد رکھی۔ یہ نیا فلسفۂ سیاست جو اقبال کے نغموں سے دنیا میں پھیلا وہ صرف افلاطون، ارسطو، میکیاولی ہابس، کانٹ اور روسو کے علم پر ہی مبنی نہیں تھا بلکہ اس کی تیاری میں قرآن و حدیث، غزالی و رازی، نظام الملک، ابن حزم اور ابن خلدون کے خیالات و نظریات سے بھی مدد لی گئی تھی، درحقیت اقبال نے عجمی تفلسف اور تصوف کو بھی مغربی دانش و حکمت کے معیار پر پرکھا اور پھر ان کے مقابلے اور توازن سے ایک معتدل اور زندہ حکمت پیدا کی چنانچہ خود اقبالؒ لکھتے ہیں:

"میرا جو فلسفہ ہے وہ قدیم مسلمان صوفیاء حکماء ہی کی تعلیمات کا تکملہ ہے۔ بلکہ باالفاظ صحیح تر یوں کہنا چاہیے کہ یہ جدید تجربات کی روشنی میں قدیم متن کی تفسیر ہے۔"

اقبالؒ کے سیاسی نظام کا پہلا اصول یہ ہے کہ زمین کسی شخص، کسی خاندان اور کسی قوم کی نہیں ہے۔ بلکہ دنیا میں جو کچھ ہے وہ سب خدا کا ہے۔ فرماتے ہیں

سرگزشتِ آدم اندر شرق و غرب	بہر خاکے فتنہ ہائے حرب و ضرب
یک عروس و شوہر او ما ہمہ	آں فسونگر بے ہمہ ہم باہمہ
عشوہ ہائے او ہمہ فکر و فن است	نے از آں تو نہ از آں من است
حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت	ایں متاعِ بے بہا مفت است و مفت
دہ خدایا ! نکتۂ ازمن پذیر	رزق و گور از وے بگیر او رہ مگیر
تو عقابی طائف افلاک شو	بال و پر بکشاد پاک از خاک شو

گویا زمین ایک ایسی دلہن کی طرح ہے جس کے ہزاروں شوہر ہیں۔ اس نے سب پر جادو کر دیا ہے۔۔ یہ وہ خزانہ ہے جو قدرت نے مفت عطا کیا ہے۔ لیکن دنیا نے ملوکیت کے ذریعے خدا کی زمین پر قبضۂ غاصبانہ کر کے اس کو اپنی موروثی جائداد بنا لیا ہے۔ اقبالؒ ملوکیت کے سخت مخالف ہیں یہی وجہ ہے کہ "ضربِ کلیم" میں انھوں نے سیاسیات مشرق و مغرب کے نام سے جو نظمیں لکھی ہیں اُن میں 'پہلی نظم' اشتراکیت کے نام سے ہے۔ کیونکہ ملوکیت و بادشاہت نے تمام دنیا خصوصاً روس کے بادشاہوں نے عوام الناس پر جو ظلم و تشدد کے پہاڑ توڑ رکھے تھے۔ اس کا ردِ عمل کمیونزم کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اور اقبال اُس سے متاثر ہوئے کیونکہ اسلام بھی ملوکیت اور سرمایہ داری کا دشمن ہے اور انقلاب روس نے بھی ملوکیت اور سرمایہ داری کو اپنا نشانہ بنایا دراصل اشتراکیت نے کمزور عوام اور غریب مزدوروں کے حقوق کے لیے آواز بلند کی گویا دنیا کو ایک نیا نظام حکومت دیا۔ کیونکہ کارل مارکس نے نئے معاشی نظام میں معاشرے کے تمام طبقات کے حقوق کے لیے آواز بلند کی۔ وہ یورپ کے سرمایہ داروں کو للکارتے ہوئے کہتا ہے۔ کہ تم لوگ علم و حکمت

کے مُہرے تو بہتر پھینکتے ہو اور بحث وتکرار کی بھی نمائش کرتے رہتے ہو۔ مگر اس عمل کا کیا فائدہ ہے دنیا کو پُرانے خیالات سے دلچسپی نہیں رہی۔ تمھاری معاشیات کی کتابوں میں ''خطوط خمدار'' کی نمائش اور مزید دیج دار کی نمائش کی صورت ہے یعنی ایسے اصول واحکام ہیں جن کا بجالانا ممکن نہیں۔ یورپ کے بت کدوں میں کلیساؤں میں، مدرسوں میں ہر جگہ عقلِ عیار حرص وہوس اور خون ریزیوں پر پردے ڈال رہی ہے۔ یعنی اہلِ یورپ شاطرانہ چال چل کر مختلف طریقوں سے دولت سمیٹنے کے لیے انسانیت کو تباہ وبرباد کر رہے ہیں۔ اقبال کارل مارکس کو ''کلیم بے تجلی اور مسیح بے صلیب'' کے لقب سے یاد کرتے ہیں اور ان کی کتاب ''سرمایہ'' کے متعلق ایک جگہ فرماتے ہیں کہ.

''نیست پیغمبر ولیکن دربغل دارد کتاب''

اس کا دماغ کافر لیکن دل مومن ہے اگر ہم غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ اقبال کو لینن اور کارل مارکس کی اشتراکیت نے صرف اس لیے متاثر کیا کہ اسلام نے سرمایہ دار اور مزدور دونوں کے درمیان تقسیم مال کا مساویانہ اصول قائم کیا ہے۔ اور اسلام نے بھی ضرورت سے زائد مال کو جمع کرنے سے منع کیا ہے۔ اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ کریں:

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم — بے سُود نہیں روس کی یہ گرمی رفتار

اندیشہ ہوا شوخیِ افکار پہ مجبور — فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار

تری کتابوں میں اے حکیم معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
خطوط خمدار کی نمائش مریز و کج دار کی نمائش
جہانِ مغرب کے بتکدوں میں کلیساؤں میں مدرسوں میں
ہوس کی خوں ریزیاں چھپاتی ہے عقلِ عیار کی نمائش

اقبال اور کارل مارکس دونوں ایک نئی دنیا تعمیر کرنا چاہتے ہیں لیکن بقول خلیفہ عبدالحکیم:

''کارل مارکس عالمِ مادی سے باہر کسی اور خالق اور عالم کا قائل نہیں جب کہ اقبال کے لیے

عادلانہ معاشی نظام آخری نہیں بلکہ انسان کے لامتناہی روحانی ارتقاء کے راستے میں ایک منزل ہے۔"

اقبال کی ایک اور دلچسپ نظم "سیاستِ افرنگ" ہے۔ فرماتے ہیں:

تری حریف ہے یارب سیاستِ افرنگ — مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے — بنائے خاک سے اس نے دوصد ہزار ابلیس

اقبال کے نزدیک یورپ کی ساری سیاست ابلیسیت کی حامل ہے۔ یہ جہاں بھی پہنچی ہے اس نے وہاں کے انسانوں میں شیطانی خصوصیات پیدا کر دی ہیں اللہ نے آگ سے ایک شیطان پیدا کیا۔ مگر مغربی سیاست نے مٹی سے لاکھوں ابلیس پیدا کر دیے اور اس سیاست کے پجاری صرف امیر اور رئیس لوگ ہی ہیں۔ اقبال مغربی نظام سیاست کے مخالف اس لیے ہیں کیونکہ ان کے مسلک میں زندگی، سیاست اور مذہب کو الگ الگ کر کے دیکھنے یا برتنے کی گنجائش نہیں ہے وہ سیاست کو دین و مذہب سے یا دین و مذہب کو سیاست سے الگ رکھنے کو انسانی معاشرے کے لیے تباہ کن سمجھتے ہیں اُن کا نقطہ نظر یہ ہے کہ

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی — ہوس کی امیری ہوس کی وزیری

نظام بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو — جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اقبال کے نزدیک نظامِ حکومت سے روحانی قدروں اور دنیاوی پہلوؤں کی جدائی نے جو کہ یورپین سیاسی طرزِ فکر کی امتیازی خصوصیت ہے بہت سی غیر متوازن اقوام کو جنم دیا ہے جن کے سیاسی نظریات میں انسانی اخلاق کی اعلیٰ اقدار کا کہیں نام و نشاں تک نہیں۔ عیسائیت کا ایک اخلاقی قوت کی حیثیت سے اہلِ مغرب کی سیاسی زندگی سے بے گانہ و بے دخل ہو جانا عیسائیت اور سیاست دونوں کے لیے عظیم نقصان کا سبب ہوا۔ عناصرِ فطرت کی تسخیر نے مغرب کے انسان کو ایک قائم بالذات احساسِ برتری کا تحفہ دیا اور اس انقلاب کے نتیجے میں مادی اشیاء کی ریل پیل نے مادے کو

ہمہ مقتدر قاضی الحاجات اور مرکز کائنات قرار دے ڈالا۔ علاوہ ازیں مذہبی مناقشات نے چرچ اور اسٹیٹ کی علیحدگی کا تصور دیا۔ اس صورت حال میں درج ذیل نتائج مرتب ہوئے۔

۱ مذہب انسان کا پرائیویٹ معاملہ قرار پایا

۲ مذہب کی حیثیت مادی اور ارتقائی ہے۔ یہ منزل من اللہ نہیں

۳ مادہ سب سے بڑی حقیقت ہے

۴ دین اور سیاست جداگانہ تصورات ہیں۔ دنیا ہی حقیقت ہے۔

ان ہی نتائج فکر پر مغربی معاشرے اور سیاسی نظام کی تشکیل جدید ہوئی اقبالؒ ایسے سیاسی نظام کو اس بنا پر پستی فطرت کا مظہر کامل سمجھتے ہیں کہ اس سے انسانی ضمیر مردہ، بے نور ہو کر رہ جاتا ہے۔ اہل یورپ کی لامذہب سیاست ایک آزاد عفریت اور دیو ہوس سے کم نہیں۔ جس کی نگاہ حرص اور ہر وقت دوسری اقوام کے فطری حقوق اور جائز ملکیت کو غصب کرنے پر لگی رہتی ہے۔ دین و سیاست کی بے ربطی و بے گانگی عروج انسانیت سے محرومی و مایوسی کی پیامبر ہے۔ فرماتے ہیں:

میری نگاہ میں ہے یہ سیاست لادین	کنیز اہرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر
ہوئی ہے ترک کلیسا سے حاکمی آزاد	فرنگیوں کی سیاست ہے دیو بے زنجیر
متاع غیر پہ ہوتی ہے جب نظر اس کی	تو ہیں ہراول لشکر کلیسیا کے سفیر

سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں اُن مغربی مفکرین کی دماغی کاوشوں کے پیدا کردہ نظام ہیں جن کی فکر کی بنیاد مادیت ہے۔ یورپ کے معاشرے نے جب اپنی عملی زندگی سے مذہب کو علیحدہ کر دیا تو فرد کو لامحدود آزادی دے دی کہ پیداوار کے ذرائع پر اپنی ہمت اور وسعت کے مطابق قابض ہوتا چلا جائے اس طرح فرد نے ہر جگہ اخلاقی اور معاشرتی اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر زیادہ سے زیادہ پیداواری ذرائع کو اپنی ملکیت بنانا شروع کر دیا۔ اور سرمایہ داری نظام ایک ابلیسی نظام بن کر نمودار ہوا۔ سرمایہ دار محنت کشوں کے حقوق سلب کرنے لگے۔ سرمایہ و محنت کے موضوع پر اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ کریں:

بندۂ مزدور کو جا کر میرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے، ہے پیام کائنات

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

دست دولت آفریں کو مُزد یوں ملتی رہی
اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

نسل قومیت کلیسا سلطنت تہذیب رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اگرچہ کارل مارکس نے مزدور پیشہ لوگوں کی ہمہ گیر مملکت کے ذریعے معاشی مساوات کا خواب دیکھا تھا۔ لیکن مارکس کے بعض اندازے غلط تھے اور زندگی نے وہ رخ اختیار نہیں کیا جس کی اُس نے پیشن گوئی کی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ سرمایہ داری نظام میں سے انسانی اور اخلاقی عناصر ایک ایک کر کے اس طرح خارج ہو گئے تھے کہ اس کے خلاف اشتراکی ردِ عمل کا ہونا فطری امر تھا لیکن یہ اصل مرض کا علاج نہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ اگر مزدور کو اشتراکی اصولوں کے موافق تمدنی زندگی کی باگ ڈور حاصل ہو بھی گئی تو طریق کوہکن میں کچھ دنوں کے بعد وہی پرویزی حیلے پیدا ہو جائیں گے۔ اور آنے والے وقت میں اشتراکی نظام کی ناکامی نے اقبال کے خیال کو درست ثابت کر دیا۔

فکر اقبال کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ وہ مشرق و مغرب کے سابق و حاضر نظاموں اور فلسفوں پر بحث کرتے ہیں مگر ان کے ساتھ زیادہ دیر تک نہیں چل سکتے۔ عہدِ حاضر کے تصورات حکومت میں جمہوریت ایسا نظام حکومت ہے جو یونان کی یک شہری جمہوریتوں سے لے کر امریکہ کی ڈالر ڈیموکریسی تک دنیا کے مختلف خطوں میں جاری و ساری ہے بلکہ امریکی شاعر والٹ وٹمین نے تو جمہوریت کے لیے اپنی نظم میں غیر معمولی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں

''ادھر۔ آ۔ میں اس خطے کو ناقابل شکست بنا دوں گا۔ میں زمین کو پُرکشش بنا دوں گا۔ میں دوست داری کے وہ پودے کاشت کروں گا جن سے امریکی دریاؤں کے کنارے گھنے درخت اُگیں گے۔ اور میں شہریوں کو یوں بہم کر دوں گا کہ وہ اپنے بازو ایک دوسرے کی گردن میں حمائل کر دیں گے۔ اے جمہوریت! میری جانب سے یہ گیت تیری نذر ہے

میں تیری بھی خدمت کر سکتا ہوں۔

(نظم) "For you O, Democracy"

مشہور مفکر ابراہیم لنکن نے مغربی طرز جمہوریت کی تعریف ان الفاظ میں کی تھی
"عوام کی حکومت، عوام کے ذریعے اور عوام کے لیے" اور اسے اس دھرتی کے لیے آخری
بہترین امید قرار دیا۔

جیفرسن نے کہا کہ "جمہوریت انسانوں کی رائے کے احترام کا نام ہے۔"

لیکن اس نظام جمہوریت پر سقراط سے لے کر روسو، نطشے، بلیک، برنارڈ شا، لارنس، رینے
گینوں اور برٹرینڈ رسل جیسے مغربی مفکروں نے بھی تنقید کی کہ جمہوریت سرمایہ دارانہ طبقے کا ایک
لیبل ہے۔ جس میں چرب زبانی اور دولت کے بل بوتے پر ایسے لوگ اقتدار میں آجاتے ہیں جو
اس کے اہل نہیں ہوتے۔ اس میں بھی سیاسی طاقت اور وسائل مخصوص افراد کے ہاتھوں میں ہوتے
ہیں اور وہ عوام کو بے بسی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ حکومت کی باگ ڈور اعلیٰ دماغوں
کے بجائے متوسط اور ادنیٰ ذہن رکھنے والے لوگوں کے پاس ہوتی ہے۔

اقبال نے نظام جمہوریت کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا اور بتایا کہ مغربی جمہوریت ملوکیت ہی کی
بدلی ہوئی شکل ہے۔ جمہوریت میں بھی عوام کو مختلف طریقوں سے دھوکہ دیا جا رہا ہے۔ حکمران طبقہ
اپنے ذاتی اور گروہی مفادات کی خاطر جبر و تشدد اور ناانصافیوں کا مرتکب ہوتا ہے۔ اسی ریاکاری
کے خلاف وہ آواز بلند کرتے ہیں۔ اشعار ملاحظہ کیجیے:

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام — جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب — تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق — طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمی گفتار اعضائے مجالس الاماں — یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری

مغربی جمہوریت کو سرمایہ داروں کی جنگ زرگری اور ملوکیت کی نئی شکل سمجھنے کا یہ تصور اقبالؒ ان کی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں بھی ملتا ہے۔ اس نظم میں ابلیس اور اس کے مشیروں کی زبان میں عصر حاضر کو درپیش مسائل کے حوالے سے ان اساسی اور اقتصادی امور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جن کی بنا پر مغرب طاقتور اور مشرق کمزور ہو گیا۔ اقبال چشم بصیرت رکھتے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں لکھی گئی یہ نظم آج بھی اتنی ہی اہم اور فکر انگیز ہے۔ کیونکہ اس دور میں ابلیسی نظام کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ نظم میں پہلا مشیر دوسرے سے کہتا ہے مجھے فخر ہے کہ میں نے یورپ کے حکمرانوں کو دنیا بھر کے وسائل پر قابض ہو کر وسیع حکومت کا خواب دکھایا ہے اور نئے فلسفوں اور تصورات کے ذریعے مسجد، مندر اور گرجا میں مذہب کے جادو کو توڑ دیا اور لادین سیاست کو فروغ دیا۔ اس محکم ابلیسی نظام سے عوام غلامی کے خوگر ہو گئے ہیں کون ہے جو ابلیس کی لگائی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کر سکے۔ ہماری مسلسل جدوجہد کا کمال ہے کہ آج تمام صوفی، ملا ملوکیت کے بندے بن چکے ہیں اہل مشرق کے لیے ملائیت اور تصوف کی افیون ہی مناسب ہے مسلمانوں کے کردار و عمل کی تلوار کند ہو چکی ہے۔ مسلمان کے لیے نماز، حج، طواف کا ہنگامہ تو باقی ہے مگر وہ عبادت کی غایت سے آگاہ ہیں نہ لذت سجدہ سے آشنا، ہم نے شاہی کو جمہوری لباس پہنا دیا ہے۔ خواہ ملک کی قانون ساز اسمبلی ہو یا کسی خسرو پرویز کا دربار۔ دراصل بادشاہ وہی ہے جو دوسروں کے مال و دولت پر نظر رکھتا ہو۔ بادشاہت ہو یا جمہوریت عوام کے حقوق ہمیشہ غصب کیے جاتے رہے ہیں۔ اور یہ مغرب کا جمہوری نظام۔ اس کی ظاہری چمک دمک پر نہ جاؤ۔ یہ تو اپنے اندر چنگیز خاں کے دل سے بھی زیادہ ظلم و جبر کی تاریکی چھپائے ہوئے ہے۔ جمہوریت کے بجائے اشتراکیت کی تعلیمات کے نتیجے میں غلاموں کے مزاج میں بغاوت پیدا ہو رہی ہے لیکن تیسرا مشیر کہتا ہے کہ مولسینی نے فرنگی سیاست دانوں کی چالاکیوں پر سے پردہ اٹھا کر کوئی اچھا کام نہیں کیا بلکہ یہ تو اس کی عاقبت نااندیشی ہے میں اس کی دور اندیشی کا قائل نہیں۔ میں نے مغربی اقوام کے خون میں حرارت پیدا کر دی ہے مشرق و مغرب کی اقوام اس کے مضر نتائج کا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گی۔ مندرجہ

ذیل اشعار اقبالؒ کے خیالات کی ترجمانی کررہے ہیں۔

ہم نے خودشاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خودنگر

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر

مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو
ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر

دیکھ لیں گے اپنی آنکھوں سے تماشا غرب و شرق
میں نے جب گرما دیا اقوام یورپ کا لہو

کیا امامان سیاست، کیا کلیسا کے شیوخ
سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہُو

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ مُو

الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں

ابلیس مشیر کہتا ہے کہ اشتراکیت سے کوئی خطرہ نہیں۔ اگر خطرہ ہے تو اسلام سے ہے۔ مسلمانوں کے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت سے ہے۔ کیونکہ اس شریعت میں عورت کی عزت محفوظ رہتی ہے۔ اور مرد کی مردانگی آزمائی جاتی ہے۔ ہمارا فائدہ اسی میں ہے کہ دنیا والوں کی نظر سے اسلام کی تعلیمات چھپی رہیں۔ بہتر ہوگا کہ مسلمان کو الٰہیات و تاویلات میں الجھائے رکھیں۔ وہ مذہبی مباحث اور علم الکلام کی پیچیدگیوں میں غلطاں رہے اور وہ مذہب کے نام پر لات و منات کو از سرِ نو تراش کر مذہبی بحثوں کے نام پر ان کی پرستش کرتا رہے۔ مسلمانوں کو ہر لحاظ سے بے عمل اور بے کردار بنا دو تاکہ وہ قیامت تک غلام رہیں۔ امت مسلمہ شعر و تصوف میں ڈوبی رہے اور اس میں بیداری کی لہر پیدا نہ ہونے پائے۔

ارمغان حجاز کی نظم "ابلیس خاکی و ابلیس ناری" میں اقبالؒ نے اقوام یورپ کی چیرہ دستیوں کا خوب پردہ فاش کیا ہے۔ آج کے یورپ یا مغرب نے اپنی تہذیب اور دیگر برائیوں سے دنیا کے لیے ایسی ذلت و رسوائی کا سامنا کیا ہے جو آسمان کے لیے بھی شرم کا باعث ہیں آج انسانیت کم اور حیوانیت و درندگی کہیں زیادہ ہے۔ مغرب کے سوداگر بڑے بڑے گناہ کوڑیوں کے مول فروخت

کر رہے ہیں۔اس لیے کہ وہ سستا سودا بیچنے والے ہیں۔عہد حاضر کے شیطان کی ہر چال الٹی ہے۔وہ اپنے جادو سے آنکھوں کو اندھا کر دیتے ہیں۔مغرب کے علوم وفنون تہذیب ومعاشرت، سیاست، فکر وفلسفہ وغیرہ بظاہر خوشنما اور دلفریب ہیں لیکن بباطن ابلیس کی شیطانیت سے بھی بدتر ہیں جو انسانی قدروں کی تباہی کا باعث بنتا ہے۔عہد حاضر کے ساقی کی شراب زہریلی ہے جو پینے والے کی روح کو مار ڈالتی ہے۔انسان اپنے مقام انسانیت سے جس طور گرا ہے اسے حاصل کرنے کے لئے انسان کی پائیداری کے مطابق کامیابی نصیب ہوگی۔ابلیس ناری نے تو گناہوں میں لذت رکھی ہے مگر شیطان صفت آدمی کے کرائے گئے گناہ بے لذت ہیں۔ابلیس خاکی کی شیطانیت ابلیس ناری کے مقابلے میں گھٹیا تر ہے۔اصل شیطان کمزور یا گھٹیا آدمی سے ٹکر نہیں لیتا بلکہ اُس کو لطف تو اُن لوگوں کے شکار میں آتا ہے۔جو ایمانی قوت رکھتے ہیں۔یعنی اصل شیطان کا جو آتش منصب اور بلند مقام ہے اُس کا مد مقابل مرد کامل ہی ہے۔اشعار ملاحظہ ہوں:

فسادِ عصر حاضر آشکار است	سپہر از زشتی اُو شرمسار است
گراں قیمت گنا ہے بالبشیرے	کہ ایں سوداگراں ارزاں فروش اند
چہ شیطانے! خرامش واژ گونے	کند چشمِ ترا کور از فسونے
چہ زہرا بے کہ درپیانۂ اوست	کشد جاں را وتن بے گانۂ اوست
بشر تا از مقامِ خود فتاد است	بقدرِ محکمی او را کشاد است
گنہ ہم می شود بے لذت و سرد	اگر ابلیس تو خاکی نہاد است

اقبال جس طرح باقی امور میں ”عقلی“ بنیاد پر عمل کے مخالف ہیں اور عقلیت کو عالم انسانیت کے لیے بے حد مضر سمجھتے ہیں۔اسی طرح نظریہ سلطنت میں بھی انہیں عقلی بنیاد سے پرخاش ہے۔کیونکہ جو قوانین عقلیت فرسودہ دماغوں سے وضع ہوں گے ان میں انسان کی خودغرضی اور خود پسندی کی چاشنی ضرور ہوگی۔یہی وجہ ہے کہ آئین سب لوگوں کو مطمئن نہیں کر سکتے اور جو اقلیت غیر مطمئن ہوتی ہے۔وہ ان قوانین کے خلاف آواز بلند کرتی ہے۔پس اقبال کے نزدیک یہ صورت

حال چونکہ عقلیت کی مرہون منت ہے اس لیے اس کے بجائے وحی کے دیے ہوئے قوانین کی اطاعت کرنی چاہیے جاوید نامہ میں فرماتے ہیں۔

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر　　سود خود بیند نہ بیند سود غیر

وحیِ حق بینندۂ سود ہمہ　　در نگاہش سود و بہبود ہمہ

اقبالؒ موجودہ سیاسیات عالم کو بہت حکیمانہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ چنانچہ کبھی مصریوں کو ان کی جنگ آزادی پر نصیحت کرتے ہیں۔ کبھی مسئلہ یہود و فلسطین پر تبصرہ کرتے ہیں فلسطین ہزاروں سال سے ایک اسلامی ملک رہا ہے۔ لیکن فلسطین پر یہودیوں کا حق اس طرح ثابت کیا جا رہا ہے کہ کبھی دو ہزار برس قبل وہاں ان کی حکومت تھی۔ ''مسولینی'' کے عنوان سے ایک دوسری نظم میں شاعر کی سیاسی نکتہ سنجی کا ثبوت ملتا ہے۔ موسلینی اپنے مشرقی اور مغربی حریفوں سے کہتا ہے۔ (حریفوں سے انگریز اور فرانسیسی مراد ہیں) کہ تم میرے سودائے ملوکیت کو کیوں ٹھکراتے ہو۔ تم نے تو اس سے کہیں بڑھ کر مظالم کیے ہیں۔ تم نے غریب قوموں کو لوٹا ہے۔

میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم　　تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج

اقبالؒ کی نظم ''ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام'' ان کے خیالات کی واضح ترجمانی کرتی ہے۔ کہ فرنگیوں نے دین و سیاست میں جدائی ڈال کر گمراہ کن خیالات و نظریات کا پرچار کیا ہے۔ اور وہ چاہتے ہیں کہ عرب و عجم اُن کے یورپی نظامات و افکار کو اپنا لیں۔ اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دیں۔ مسلمان کو جو موت سے نہیں ڈرتا اور مذہب پر پوری طرح قائم ہے اُسے مذہب سے اس طرح دُور کر دیں کہ اس کے دل سے حضور اکرم کا عشق نکل جائے۔ جو اس کے لیے گویا اس کے جسم کی روح ہے اور جس کے بغیر زندگی ممکن نہیں۔ افغانیوں کی غیرت ختم کرنے کا یہ طریقہ اختیار کرو کہ ملاؤں کو وہاں کے پہاڑوں اور وادیوں سے نکال دو۔ یعنی افغانیوں کی دینی تعلیم ختم کر دی جائے۔ کعبہ والوں سے ان کی روایات چھین لو۔ تا کہ ان میں مذہبی جذبے نہ رہیں

وہ ان جذبوں سے اس طرح خالی ہو جائیں جس طرح ختن سے ہرنوں کو نکالنے سے چراگاہیں خالی ہو سکتی ہیں۔ اشعار ملاحظہ کریں:

لا کر برہمنوں کو سیاست کے پیچ میں — زناریوں کو دیرِ کہن سے نکال دو
فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات — اسلام کو حجاز و عرب سے نکال دو
افغانیوں کی غیرتِ دیں کا ہے یہ علاج — ملا کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو
اہلِ حرم سے اُن کی روایات چھین لو — آہو کو مرغزارِ ختن سے نکال لو

غرض اقبالؒ نے سیاسیات مشرق و مغرب کا بغور مطالعہ کیا وہ سرمایہ داری نظام، ملوکیت، اشتراکیت، جمہوریت تمام نظاموں کی خوبیوں پر بھی نظر رکھتے ہیں مگر انھیں عالم انسانیت کے لیے ایک مکمل نظام حکومت نہیں سمجھتے ۔ کیونکہ ان تمام نظاموں نے انسانی اخوت اور عالمگیر بھائی چارے کے اعلیٰ نصب العین کے لیے کوئی کوشش نہیں کی جب کہ کسی اچھے نظام سیاست وحکومت کی بنیادی خوبیوں میں اس مقصد کا حصول شامل ہونا چاہیے۔ اقبالؒ کے نزدیک نظام اسلام ہی وہ واحد نظام ہے۔ جس میں جمہوریت اپنی مکمل روح کے ساتھ موجود ہوتی ہے۔ جہاں معاشی اور معاشرتی مساوات، بنیادی ضروریات کی فراہمی، حریت فکر، آزادیٔ ضمیر، رنگ ونسل سے بالاتری اور قانون کی نظروں میں حاکم ومحکوم میں کوئی تمیز روا نہیں رکھی جاتی۔ خلفائے راشدین کے دور میں حقیقی نظام اسلام کو نافذ کیا گیا تھا۔ کیونکہ ریاست اسلامی میں قرآن وسنت کے حقیقی اصولوں پر عمل کیا گیا! اقبالؒ کی دُوررس نگاہوں نے آنے والے حالات کا اندازہ لگالیا تھا۔ ۱۵ جنوری ۱۹۳۴ء کو راغب احسن کے نام خط میں لکھتے ہیں:

> ”دنیا اس وقت نئی تشکیل کی محتاج ہے۔ جمہوریت فنا ہو رہی ہے سرمایہ داری کے خلاف ایک جہادِ عظیم ہو رہا ہے۔ تہذیب وتمدن بھی ایک کش مکش میں مبتلا ہے۔“

اقبال ساری دنیا کو ایک عالمگیر برادری کی شکل میں امن وسکون کی زندگی عطا ہونے کے خواہش مند ہیں۔ دنیا کو ایک انتہائی منصفانہ اور عادلانہ نظام متعارف کروانے کی ضرورت ہے۔

سیاسیات مشرق و مغرب میں اُن محرکات حیات کی کمی ہے جو انسانی قافلوں کو کشاں کشاں آگے کی طرف بڑھائے جائیں۔ مشرق میں ساقی نہیں۔ اور مغرب کی صہبا بے مزہ ہے۔ جب تک ساقی کی حوصلہ مندیاں اور ذوقِ صہبا ایک جگہ جمع نہ ہو جائیں اس وقت تک میخانۂ حیات آباد و بارونق نہیں ہو سکتا۔ مغربی اہلِ فکر بھی تسلیم کرتے ہیں کہ روحانی اور اخلاقی اقدار کی پامالی کے باعث دنیا کا توازن بگڑ گیا ہے۔ جب تک انسانوں کے اخلاق و کردار بلند نہ ہوں اس وقت تک باوجود مادّی مرفہ الحالی کے ان کی زندگی پست رہے گی۔ اگر سیاست و حکومت کا مطمعِ نظر انسانی خدمت کا جذبہ نہ ہو تو وہ مخلوقِ خدا کی تباہی کا سبب بن سکتی ہے۔

موجودہ دَور میں انسانیت کا قافلہ مادیت کے بیابانوں میں آوارہ گرد ہے۔ اور اُسے کچھ پتہ نہیں کہ وہ کدھر جا رہا ہے۔ اور کیوں جا رہا ہے وسائل پر قابض ہونے کی ہوس نے خون ریزی کا بازار گرم کر رکھا ہے نیشنل ازم کے ناسور سے خود یورپ بھی تنگ آ چکا ہے۔ اور اس جماعت تراشی سے بھاگ کر جمعیت اقوام اور اب یو۔ این۔ او اور یونیسکو وغیرہ کے تصور میں پناہ ڈھونڈ رہا ہے۔ مگر اقبالؒ جمعیت اقوام اور حُسن نیت کے بارے میں متشکک تھے وہ اس اجتماعی نظام کو کفن چوروں کی انجمن کا خطاب دیتے تھے۔ ان کے نزدیک اس "داشتہ پیرک افرنگ" کا منتہا بھی جماعتی شوقِ استیلا ہے۔ جمعیت اقوام غالب ہے نہ کہ جمعیت آدم۔ اقوام متحدہ کے بارے میں اقبالؒ کے خیالات درست ثابت ہو رہے ہیں۔ کیونکہ کمزور قوموں خصوصاً مسلمانوں کو اقوام متحدہ سے انصاف کا حصول نہیں ہو رہا۔

اقبالؒ نے اپنے سیاسی تصورات کا کوئی مربوط نظام قائم نہیں کیا اس لیے کہ ان کے لیے اولین مقصد احیائے احساس تھا۔ اور اس غرض کے لیے انھوں نے سیاسی نظامات پر تنقید کی ہے۔ وہ مشرق و مغرب دونوں کے نظام ہائے سیاسی کے نقاد ہیں اور اس ضمن میں اپنے تصورِ سیاست کے صرف خارجی خط کھینچتے ہیں۔ جزئیات کو اپنے دائرے سے خارج سمجھ کر عموماً نظر انداز کر دیا ہے۔ اس کے باوصف مجموعی نظر ڈالنے سے ان کے یہاں سیاست کا ایک قابلِ فہم نظام سامنے آ جاتا

ہے۔ جو در اصل اسلامی نظام ہے حکومت اور سرداری اقبالؒ کے خیال میں خدمت گری کا دوسرا نام ہے۔ اقبال حکمرانی کے لیے عشق مصطفیٰؐ کو ایک ضروری شرط قرار دیتے ہیں کیونکہ یہی عشق افراد قوم کو ایک نقطے پر جمع کر سکتا ہے۔ دنیا میں وسیع تر انسانی برادری اور قوم جو خیال ملت اسلام نے پیش کیا ہے۔ وہ کسی نظام اور گروہ میں نہیں ملتا جیسا کہ اقبال خود فرماتے ہیں:

''اسلام تمام قیود سے بے زاری کا اظہار کرتا ہے۔ اس کی قومیت کا دارومدار ایک خاص تہذیبی تصور پر ہے۔ جس کی تجسیمی شکل وہ جماعت اشخاص ہے۔ جس میں بڑھتے اور پھیلتے رہنے کی قابلیت طبعاً موجود ہے۔ اسلام کی قومیت کا تصور دوسری اقوام کے تصور سے بالکل مختلف ہے اس کا اصل اُصول مظاہر کائنات کے متعلق ایک ایسا اتحاد خیال ہے جو سب انسانوں کو ایک رشتہ وحدت میں پرُو سکتا ہے۔''

اقبال کے اس خیال کا یورپ میں زیادہ خیر مقدم نہیں ہوا۔ لیکن بایں ہمہ تعصب، یورپ میں ایسے اہل دل موجود ہیں جو اس تصور کے قائل ہیں۔ مثلاً پروفیسر ''ہر خردنیہ'' نے ''اسلام اور مسئلہ نسل'' پر مضمون لکھتے ہوئے ان تمام امور کا اعتراف کیا ہے۔ اور دیگر بے شمار اہل قلم نے بھی اسلام کی اس برتری کا اقرار کیا ہے۔

اقبال کرۂ ارض کی تقدیر بدلنے کے لیے اقوام مشرق کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ بھی اقوام مغرب کی طرح اپنی ایک جمعیت بنالیں۔ اور ان کا مرکز تہران ہو تو شاید اس سے دنیا کے کرے یا حلقے کی تقدیر بدل جائے۔ وہ اپنے معاملات میں اسی طرح خود مختار ہو جائیں جس طرح مغربی اقوام ہیں۔ اس سے دنیا کی تمام قوموں کی آزادی کا سامان ہو جائے گا۔ درحقیقت اقبال ایسی مسلم ریاست کا خواب دیکھتے تھے۔ جس میں حقیقی معنوں میں اسلام نافذ ہو۔ اور وہ دیگر ممالک کے لیے نمونہ عمل ہو۔ ایسی مسلم ریاست اقبال کو ایران کی شکل میں نظر آرہی تھی۔ موجودہ دور سیاست میں مسلم قوم جس انتشار کی شکار ہے۔ اس کا واحد حل علامہ اقبالؒ کے مشورے پر عمل کرنے سے ہی ممکن ہے۔ فرماتے ہیں۔

دیکھا ہے ملوکیت افرنگ نے جو خواب   ممکن ہے کہ اس خواب کی تعبیر بدل جائے
طہران ہو گر عالم مشرق کا جنیوا   شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

مسلم شمیم

علامہ اقبالؒ اور مسلم نشاۃِ ثانیہ

مسلم نشاۃِ ثانیہ جو یورپ میں ظہور پذیر ہونے والی نشاۃِ ثانیہ کے پانچ سو سال بعد برصغیر پاک و ہند میں انیسویں صدی کے وسط میں شروع ہوئی اور جس کی قیادت و سیادت سرسید احمد خاں کے حصے میں آئی، علامہ اقبال اُس کے اہم ترین رکن رکین ہیں۔ واضح رہے کہ سرسید کو یہ روشنی مرزا غالب کے افکار سے حاصل ہوئی تھی۔ مرزا غالب نے اپنے قیام کلکتہ کے دوران مغرب یعنی یورپ کی سائنسی اور تکنیکی شعبوں میں حیرت انگیز کامرانیوں کا اندازہ لگایا تھا اور عہد جدید کے نقوش جو اُن کے دائرہ بصیرت میں ابھرے تھے وہ سرسید کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوئے اور سائنٹفک سوسائٹی کے قیام کے ذریعے سائنسی علوم تک رسائی کے لیے اُن کی کثیر الجہت تحریک جسے نشاۃِ ثانیہ کا درجہ حاصل ہوا، علامہ نے اُس کے پرچم کو مختلف رنگوں کے ساتھ بلند سے بلند تر کیا اُس کی روشنی میں اُنھوں نے بیسویں صدی میں رونما ہونیوالی تبدیلیوں اور انقلابات کا مشاہدہ اور مطالعہ کیا اور اپنے مثبت ردِ عمل کا خلاقانہ اظہار کیا۔ اس باب میں روس میں رونما ہونے والے پہلے اشتراکی انقلاب کا خیر مقدم اپنے اس زبان زدِ خاص و عام شعر کے ذریعے کیا۔

آسماں! ٹوٹے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک　　　آفتاب تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا

مذکورہ انقلاب کے بانی لینن کو متعدد نظموں میں اُنھوں نے اپنے مخصوص انداز میں خراج تحسین پیش کیا اور اس انقلاب کے محرک نظریہ مارکسزم پر آفاقی نقطۂ نظر کا اظہار کرتے ہوئے کارل مارکس کے حوالے سے یہ کہا:

نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب　　　آں کلیم بے تجلی، آں مسیح بے صلیب

اور اہلِ زمیں کو خدا کا یہ فرمان سنایا:

اٹھو! مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو

سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ — جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے، مٹا دو

علامہ اقبال جتنے عظیم شاعر تھے اُسی منصب کے مفکر بھی تھے اور اُن کی فکر و دانش کا سرچشمہ یورپ میں رونما ہونے والے کثیر الجہت انقلابات تھے۔ اُنھوں نے یورپ میں گزشتہ پانچ صدیوں میں پیدا ہونے والی سماجی، اقتصادی، سیاسی اور نظریاتی منفی اور مثبت تبدیلیوں کا غائر مطالعہ اور مشاہدہ کیا تھا۔ یہ سب کچھ اُس نشاۃِ ثانیہ کی دین تھا جو میرا آج کا موضوعِ گفتگو ہے یورپ میں ظہور پذیر ہونے والی مذکورہ نشاۃ ثانیہ کا سرسری جائزہ پیشِ نظر رہنا ضروری ہے، جس کے اثرات و ثمرات فکرِ اقبال میں نظر آتے ہیں۔ علامہ اقبال کی دنیائے فکر و نظر میں روشن خیالی خرد افروزی اور سماجی حقیقت نگاری کے ابتدائی نقوش دیکھے جا سکتے ہیں۔ وہ مرزا غالب کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اُنھیں جرمن شاعر گوئٹے کا ہم منصب قرار دیتے ہیں۔ برصغیر میں نشاۃِ ثانیہ کے محرکِ اوّل جو انیسویں صدی کے دوسرے نصف دورانیے میں ظہور پذیر ہونا شروع ہوئی تھی، مرزا غالب تھے جنھوں نے سر سید احمد خان کی رہ نمائی کی اور خضرِ راہ ثابت ہوئے۔ علامہ کا مرزا غالب کے لیے وہ شعر درج ذیل ہے۔

آہ! تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے — گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

میرے نزدیک ادب اپنی سرشت اور طینت میں سیکولر ہوتا ہے اور آفاقیت اور شرفِ بشر کا نقیب و ترجمان ہوتا ہے علامہ اقبال کو کچھ حلقوں نے میرے نزدیک اُن کی آفاقی فکر کو ایک مخصوص زاویہ نگاہ سے پیش کیا ہے، جو میرے نقطۂ نظر میں علامہ اقبال کی شاعرانہ عظمت اور مفکرانہ بلندیوں کی نفی کرنے کے مترادف ہے۔ اس پس منظر میں مذکورہ نشاۃِ ثانیہ کے تاریخی تناظر کا ادراک ضروری ہے۔

پندرھویں صدی میں یورپ ہزار سالہ عہد تاریک سے نکلا۔ اس عہدِ تاریک سے نکلنے میں یورپ کو کم از کم تین صدیاں لگیں۔ تین صدیوں کی جدوجہد پیا اور کیتھولک چرچ کے زیر اثر اور اُن کی ستم رانیوں کے نتیجے میں لاکھوں انسانوں کو مختلف سزاؤں اور بھیانک طریقوں سے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ کیتھولک احتساب کے ہاتھوں کیا کچھ ہوا وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ بہر حال بارھویں صدی میں یورپ کے مختلف ملکوں میں یونیورسٹیاں قائم ہونا شروع ہوئیں اور ظلمت پرستی کے مقابلے میں علم کی مشعلیں جلنا شروع ہوئیں اور جوہان گٹن برگ (Cohann Guten Bereg) نے ۱۴۵۰ء کی دہائی میں جرمنی میں چھاپہ خانہ قائم کیا جو ایک بڑی ایجاد کا درجہ رکھتا ہے۔ اس چھاپہ خانے نے یورپ میں علم کے اجالے پھیلانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ سچ پوچھیے تو جدید عہد کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے. ورنشاۃِ ثانیہ کا سفر ارتقا بھی یہیں سے شروع ہوا جس کا ظہور سب سے پہلے اٹلی میں ہوا اور پورے یورپ میں مختلف شعبہ ہائے حیات میں نشاۃِ ثانیہ کے نقوش تابندہ دیکھنے کو ملے۔ کیتھولک چرچ کے مدِ مقابل پروٹسٹنٹ چرچ کا یورپ میں ظہور ہوا تو اُس کی جلو میں یورپ میں سیکولر ریاستیں جلوہ گر ہوئیں، یعنی ریاست اور چرچ میں علاحدگی ہوئی۔ اس باب میں مارٹن لوتھر (Martin Luther, 1483-1548) اور جون کال ون John Calvin, 1509-1564) کے کردار کو خصوصی حیثیت حاصل ہے۔ بعد میں نشاۃِ ثانیہ کے اثرات کہیں زیادہ مجتمع ہوتے گئے بڑے بڑے مفکرین اور سائنس داں عہدِ جدید کے بنیادگزاروں میں سامنے آتے گئے اور جمہوری انقلابات کا آغاز ہونا شروع ہوا ۱۷۸۹ء میں انقلاب فرانس اس حوالے سے خصوصیت کا حامل ہے۔

نشاۃِ ثانیہ کے آکسفورڈ ڈکشنری میں کئی معنی دیے گئے ہیں Rebirth, Revival Renewal, New Birth, New Dawn وغیرہ وغیرہ۔ آکسفورڈ ڈکشنری جلدِ دوم میں Rebirth of Learning کہا ہے۔ بالفاظِ دیگر تعقل پسندی اور خرد افروزی کے دور کا آغاز ہوا۔ منقولات پر معقولات اور اجتہاد کی بالادستی قائم ہوئی۔ معروف مارکسی مفکر سید سبطِ حسن کے مطابق:

''حقیقت یہ ہے کہ علم و حکمت کا کارواں بڑی پُر پیچ راہوں سے گزرا ہے یونانی فکر و فن کا اثاثہ پہلے بطلیموسی فرماں رواؤں کے عہد میں (تیسری صدی قبلِ مسیح) اسکندریہ منتقل ہوا۔ اس خزانے سے شام و عراق کے یہودی اور عیسائی علما نے فیض پایا۔ تب عباسیوں کے زمانے میں یونانی تصنیفات اور خلاصوں کے ترجمے عربی میں ہوئے۔ ان ترجموں سے مسلمان حکما اور اطبا نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ عباسیوں کے زوال کے بعد علم و حکمت کا یہ سرمایہ ہسپانوی عربوں کو ورثے میں ملا۔ اُنھوں نے اس دولت کو محفوظ رکھنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی تحقیقی اور تخلیقی کاوشوں سے اس میں بیش بہا اضافے کیے۔ وہ خزانے کے سانپ بھی نہ بنے بلکہ اُنھوں نے اہلِ مغرب کو اس دولت سے مستفید ہونے کے مواقع فراہم کیے اور دیکھتے ہی دیکھتے مغرب کی درس گاہیں عرب تصنیفات کے لاطینی ترجموں کی روشنی سے منور ہو گئیں''۔

مذکورہ بیان ایک مسلم مفکر کا ہے۔ اس کی تصدیق اور توثیق پروفیسر فلپ ہٹی نے اپنی کتاب "History of the Arabs" کے مندرجہ ذیل اقتباس میں کی ہے:

''یورپ کے قرونِ وسطیٰ کی فکری تاریخ میں مسلم اسپین نے انتہائی درخشاں ابواب تحریر کیے۔ آٹھویں اور تیرھویں صدی کے دوران عربی بولنے والے ساری دنیا میں تہذیب و تمدن کے مشعل بردار تھے۔ مزید برآں اُنھی کی کوششوں سے قدیم سائنس اور فلسفے کی بازیابی ہوئی۔ اُنھوں نے اس علم میں اضافہ کیا اور اس کو دوسروں تک اس طرح پہنچایا کہ مغرب نشاۃِ ثانیہ سے آشنا ہوا۔ ان کاموں میں ہسپانوی عربوں کا بڑا حصہ ہے۔ اُنھوں نے یونانی فلسفے کو مغرب میں منتقل کیا۔ مغربی یورپ میں نئے خیالات کا بہاؤ، بالخصوص فلسفیانہ خیالات کا یہ زبردست بہاؤ عہدِ تاریک کے اختتام کی ابتدا کا موجب بنا''

قرونِ وسطیٰ کے جن مسلمان حکما نے مغربی فکر کو سب سے زیادہ متاثر کیا، اُن میں درج ذیل شخصیات کا نام اور کام تاریخ کا حصہ ہے۔

(۱) حکیم ابوبکر رازی، (۲) ابنِ رشد، (۳) الفارابی، (۴) البیرونی، (۵) حکیم ابنِ سینا
(۶) عمر خیام، (۷) ابنِ خلدون، (۸) جابر بن حیان، (۹) الخوارزمی، (۱۰) ابن الہیثم
(۱۱) النفیس۔

مذکورہ مسلم سائنس دانوں اور فلسفیوں نے یونانی سائنس اور فلسفے کے ورثے کو صرف زندہ ہی نہیں کیا بلکہ اُس کی پیش رفت میں نمایاں کارنامے انجام دیے۔ اُنھوں نے اپنے مطالعے کی بنیاد تحقیق اور تفتیش پر رکھی۔ اُنھوں نے یونانی فکر و فلسفہ اور سائنس کو اپنے فکروشعور کے سفرِ تحقیق و جستجو میں رہ نما بنایا اور اس خزانے میں بیش بہا اضافہ کیا، مگر یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا خلافتِ عباسیہ کے زوال کے ساتھ علم و دانش اور سائنس کا کارواں اپنی راہیں اور سمتیں کھو بیٹھا اور بغداد جو تاریخ میں New Athens کا مرتبہ حاصل کر چکا تھا، وہ اب بھی تاریخ کے صفحات میں مدغم ہو کر معدوم ہو گیا۔ ہر چند کہ خلافتِ عباسیہ کے بعد بھی مسلم دنیا میں دو بڑی سلطنتیں قائم ہوئیں یعنی سلطنتِ عثمانیہ اور ہندوستان میں سلاطینِ دہلی کی حکومتیں اور مغلیہ سلطنت یعنی سیاسی طور پر مسلم دنیا کا پرچم سرنگوں نہیں ہوا مگر فکر و دانش کا سورج کرۂ ارض پر اندھیروں میں گم ہو گیا۔ یونانی فکر و فلسفہ اور سائنس کا سورج غروب نہیں ہوا بلکہ یورپ کے ہزار سالہ عہدِ تاریک کے دوران سیاہ بادلوں یعنی کیتھولک چرچ کے پیچھے آنکھوں سے اوجھل رہا اور افقِ عالم پر رفتہ رفتہ نمودار ہوا اور سولھویں صدی میں مہرِ نیم روز بن کر اُن تمام اندھیروں کو نگل گیا جو سماج کے ارتقا کی راہ میں پڑاؤ ڈالے بیٹھے تھے۔ یورپ کا معاشرہ عہدِ غلامی سے عہدِ جاگیرداری تک سفر طے کر چکا تھا۔ یورپ نشاۃِ ثانیہ کی جلو میں مختلف انقلابات، خصوصیت کے ساتھ انقلابِ فرانس (۱۷۸۹ء) اور صنعتی انقلاب (اٹھارویں صدی) کے نتیجے میں سرمایہ دارانہ عہد میں داخل ہوا۔ سیاسی شعبے میں وہ جمہوریت اور سیکولرزم پر قائم رہا اور معاشی ترقی کے میدان میں سائنس اور ٹکنالوجی کے طفیل تیز سے تیز تر مراحل میں داخل ہوا اور بیسویں صدی میں یہ مراحل ارتقا خلاؤں میں پرچم کشائی کے مناظر دکھا رہے ہیں۔

۱۲۵۸ء میں ہلاکو خان کے ہاتھوں بغداد کی بربادی اور خلافتِ عباسیہ کے مکمل زوال کے بعد

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ ہر چند مسلم دنیا سیاسی طور پر زوال پذیر نہیں ہوئی، مگر تہذیب و تمدن کا سفر ارتقا چونکہ علم پر استوار ہے، لہٰذا مسلم دنیا میں نہ تو کسی نشاۃ ثانیہ کا ظہور ہوا، نہ اصلاحی تحریک کہیں نظر آئی، نہ روشن خیالی کی تحریک کہیں ابھری، نہ صنعتی انقلاب وقوع پذیر ہوا اور نہ سیاسی شعبۂ زندگی میں انقلاب فرانس کی صدائے بازگشت مسلم دنیا میں سنائی دی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ مسلم دنیا قبائلی عہد اور جاگیرداری عہد میں کئی صدیوں سے مقید ہے۔ فکری طور پر مسلم معاشرہ قبائلی اور جاگیرداری سوچ کے دائرے میں گھرا ہوا ہے۔ سب سے بڑا کلیدی قانون، قانون ارتقا ہے جس کی دریافت کا سہرا چارلس ڈارون کے سر ہے۔ مسلم دنیا آج سرمایہ داری عہد کے فیوض و برکات یعنی مادی ترقی کے فوائد سے استفادہ کر رہی ہے۔

مذکورہ پس منظر میں جب ہم مسلم تاریخ پر طائرانہ نظر ڈالتے ہیں تو خلافت عباسیہ کے حتمی زوال کے بعد متعدد دینی تحریکیں تاریخ میں ابھریں مگر وہ سب کی سب احیائی تحریکیں تھیں۔ برصغیر میں حضرت شاہ ولی اللہ کی تحریک بھی کچھ مثبت پہلو رکھنے کے باوجود بنیادی طور پر احیائی تحریک تھی۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب نے اپنے کلکتہ کے سفر کے دوران پہلے نئے عہد کے آثار و نقوش دیکھ لیے تھے اور سر سید کو ''آئین اکبری'' کی تدوین و اشاعت کے حوالے سے سرزنش کے فقرے تحریر کیے تھے۔ ''آئین اکبری'' کی منظوم تقریظ میں خصوصیت کے ساتھ مرزا غالب نے مغرب میں رونما ہونے والے تغیرات و ایجادات کی روشنی میں نئے عہد کی نوید سنائی تھی۔ تقریظ کی تمہید میں مرزا غالب سر سید کی تعریف کرتے ہیں کہ ایک دیدۂ بینا نے کہنگی کو نیا لباس پہنایا ہے لیکن برصغیر میں برطانوی نوآبادیاتی تسلط کا نتیجہ کہیے کہ انیسویں صدی میں برصغیر میں مسلم نشاۃ ثانیہ کی داغ بیل ڈالی گئی جس کا سرچشمۂ بالیدگی مرزا غالب کے افکار ٹھہرتے ہیں۔ مذکورہ نشاۃ ثانیہ کے بانی محرک اور مدح رواں یقیناً سر سید احمد خان ہیں جن کو مرزا غالب نے اس راہ پر ڈالا اور اُن کی سوچ کے دھارے میں انقلابی تبدیلی پیدا کی۔ اس ضمن میں مرزا غالب کی اُس منظوم تقریظ کا حوالہ ناگزیر ہے جو اُنھوں نے سر سید احمد خان کی تدوین کردہ ''آئین اکبری'' کے بارے میں لکھی تھی۔ دلچسپ

بات یہ ہے کہ مذکورہ منظوم تقریظ سرسید نے ''آئینِ اکبری'' میں شامل نہیں کی مگر اس میں جو کچھ کہا گیا گویا وہ اُن کے لیے اور اُن کی تحریک کے لیے منشور ثابت ہوا اور انھوں نے ۱۸۶۳۔۶۴ء میں سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی، اُسے تحریک بنانے کے لیے جریدہ جاری کیا اور انگریزی زبان کی ترویج کے لیے سردھڑ کی بازی لگائی اور انگریزی زبان سے سائنسی علوم کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی سعیِ مشکور کی، اور سچ پوچھیے یہیں سے اُس نشاۃِ ثانیہ کا آغاز ہوتا ہے جو آگے چل کر پورے ہندوستان کے حلقہ ہائے فکرودانش میں فکری انقلاب کی پیش رو ثابت ہوئی۔

سرسید احمد خان نے سائنسی علوم کے حصول کے لیے مغرب کی طرف اپنی خاص توجہ مبذول کی اور برطانیہ کا دورہ کیا، وہاں کی شہرۂ آفاق جامعات کو دیکھا اور ہندوستان میں اس طرح کی جامعات کے قیام کے خواب دیکھے اور منصوبے بنائے۔ سرسید کی تحریک یعنی علی گڑھ کی تحریک پر تفصیلی گفتگو یہاں قطعی ضروری نہیں۔ دین اور قرآن کے حوالے سے سرسید نے تعقل پسندی کی روش کی وکالت کی اور سائنسی ایجادات اور دریافتوں کی بھرپور حمایت کی جو ایک فقرے میں کہا گیا کہ قرآن قول اللہ ہے اور فطرت کی عمل داری فعل اللہ ہے۔ لہٰذا ان دونوں میں تضاد کی بات قطعی لغو ہے۔ سرسید کو جہاں مخالفتوں کا سامنا ہوا اُس سے کہیں بڑے پیمانے پر اُنھیں برصغیر کے مسلمانوں کی حمایت حاصل ہوئی اور اہلِ فکرودانش کا ایک کارواں اُن کی جلو میں نشاۃِ ثانیہ کی پیش رفت کے لیے سرگرمِ عمل ہوا۔ اُن میں مولانا الطاف حسین حالی، مولانا محمد حسین آزاد، جسٹس سید امیر علی، علامہ نیاز فتح پوری، مولانا آزاد سبحانی، مولانا حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شبلی نعمانی اور مولانا سید سلیمان ندوی کے علاوہ بہت سارے اکابر اس کاروانِ فکرودانش کا حصہ بنے جسے ہم اس نشاۃِ ثانیہ کا جزو لاینفک جانتے ہیں۔

جہاں تک اس نشاۃِ ثانیہ کی تحریک میں علامہ اقبال کے کردار اور منصب و مقام کا تعلق ہے تو یہ بات کہی جانی چاہیے کہ سرسید جس تحریکِ نشاۃِ ثانیہ کا نقطۂ آغاز تھے علامہ اقبال اُس کا نقطۂ عروج اور حرفِ آخر، کیونکہ علامہ نے کائنات کے حرکی اور ارتقائی تصور پر زور دیا ہے۔ ان کے نزدیک تمام

موجوداتِ عالم جن میں انسان بھی شامل ہے، قانونِ حرکت و تغیر کے تابع ہیں۔ اُنھوں نے اپنی مشہور نظم 'ساقی نامہ' میں لکھا ہے۔

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات　　تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود　　کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
دما دم رواں ہے یمِ زندگی　　ہے ہر اک سے پیدا دمِ زندگی

علامہ اقبال نے انھی خیالات و افکار کا اظہار اپنی متعدد نظموں، بشمول 'ارتقا' اور 'زمانہ' میں بھی کیا ہے۔ دراصل تغیر اور ارتقا کا شعور علامہ اقبال کی فکر کا نہایت اہم جزو ہے، چنانچہ انھوں نے اپنی اہم ترین کتاب "Reconstruction of Religous Thought in Islam" میں اس حوالے سے تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ قرآن کی رو سے کائنات ترقی پذیر حقیقت ہے۔ علامہ اقبال نے اس ضمن میں مزید لکھا ہے کہ خدا کا تخلیقی عمل مسلسل جاری ہے، لہٰذا ایٹموں کا شمار ممکن نہیں۔ ہر لحظہ نئے ایٹم وجود میں آتے ہیں اور کائنات مسلسل بڑھتی اور پھیلتی رہتی ہے اور کوئی شے ثابت و قائم نہیں ہے۔ اُن کے خیال میں تخلیقِ مسلسل کا تصور خالص اسلامی ہے۔ اُن کا یہ شعر اسی زاویہ فکر کا ترجمان ہے۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید　　کہ آرہی ہے دما دم صدائے کن فیکوں

قانونِ ارتقا کا بنیادی تصور تغیر اور ترقی کا ہم سفر ہوتا ہے۔ علامہ قانون ارتقا کے حامی ہونے کے حوالے سے مسلم نشاۃِ ثانیہ کا نشانِ منزل کہلانے کے حق دار ہیں

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں　　ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

سید سبط حسن نے اپنی کتاب 'نوید فکر' کے باب دوم میں اسلامی ریاست کے زیر عنوان لکھا ہے۔

"علامہ اقبال کے ایک خطبے کا عنوان ہی 'اسلامی ڈھانچے میں حرکت کا اصول' ہے۔ اُن کے خیال میں تہذیبی تحریک کے اعتبار سے اسلام کائنات کے پرانے جامد تصور کو رد کرتا ہے۔ اسلام کا تصورِ کائنات حرکی (Dynamic) ہے، چنانچہ اسلام کی نظر میں زندگی کی روحانی اساس اپنے کو تغیر اور تبدیلی میں منکشف کرتی ہے۔ اسلام کی نظر میں فطرت میں حرکت کا اصول کیا ہے؟ یعنی اسلام قانونِ حرکت پر کس طرح عمل کرتا ہے؟ اقبال جواب دیتے ہیں کہ اجتہاد کے ذریعے۔ وہ تُرکوں کی تعریف کرتے ہیں جنھوں نے اجتہاد سے کام لیا اور شخصی خلافت کے ادارے کو ختم کردیا۔

علامہ اقبال کی فکر یعنی بین المذاہب ہم آہنگی اور احترام کی ترجمانی اُن کی متعدد نظموں میں ملتی ہے جن میں اُنھوں نے مذکورہ دو مذہبی ہستیوں کے لیے جذبۂ احترام وعقیدت کا اظہار کیا ہے۔ یہاں اُن کی دو نظموں کے حوالے پر اکتفا کروں گا، ایک نظم بعنوان 'رام' اور دوسری 'نانک' جو اُن کے آفاقی نظریہ حیات اور وسیع المشربی کی ترجمان ہیں۔ علامہ اقبال جیسا کہ پہلے رائے ظاہر کی جا چکی ہے کہ مسلم نشاۃِ ثانیہ کے نقطۂ ہائے آغاز مرزا غالب اور سرسید احمد خان تھے اور نقطۂ عروج کی فضیلت علامہ اقبال کے سر ہے۔ علامہ اقبال کا یہ شعر زندگی کے حوالے سے سائنسی فکر کا علم بردار ہے۔

تُو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ   جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی

"ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم"

(۱۹۳۱ء میں دہلی (انڈیا) میں منعقدہ کل ہند مشاعرہ کی ایک نادر اور یادگار تصویر)
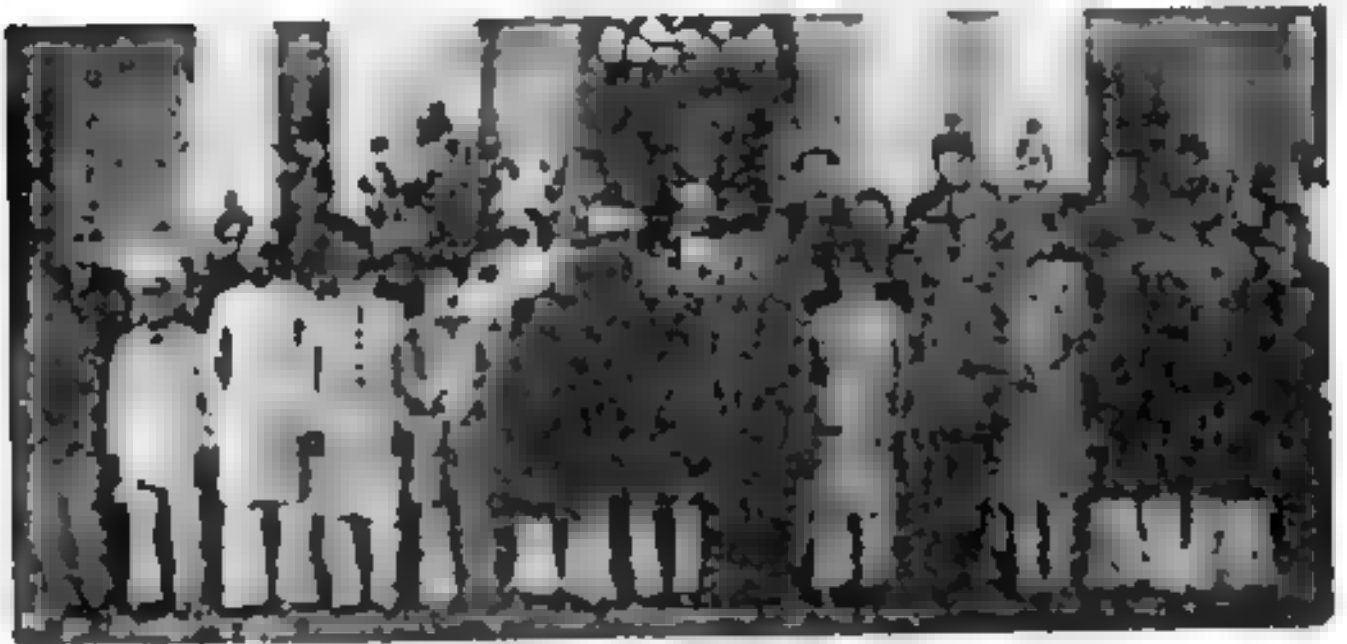
(بائیں سے دائیں) (۱) مجنوں گورکھپوری (۲) احسن بچھرونی (۳) ماہر القادری (۴) مولوی عبدالحق
(۵) حسرت موہانی (۶) سر سلطان احمد (۷) ثاقب لکھنوی (۸) سر رضا علی (۹) سیماب اکبرآبادی
(۱۰) حفیظ جالندھری (۱۱) ڈاکٹر تاثیر (۱۲) جوش ملیح آبادی (۱۳) ساغر نظامی (۱۴) حسن فیروز
(۱۵) بہزاد لکھنوی (۱۶) راجہ صاحب محمود آباد (۱۷) ـــــ (۱۸) تلوک چند محروم (۱۹) ـــــ
(۲۰) جلیل قدوائی (۲۱) رئیس محمد نعیم (۲۲) ـــــ (۲۳) اسد ملتانی (۲۴) ـــــ
(۲۵) کرنل مجید ملک (۲۶) ممتاز حسن (۲۷) غلام ربانی تاباں (۲۸) ڈاکٹر ذاکر حسین (۲۹) عبدالرحمٰن صدیقی
(۳۰) چودھری محمد علی (۳۱) پروفیسر محمد مجیب (۳۲) اے۔ڈی۔اظہر (۳۳) شجاعت علی صدیقی
(۳۴) مشور روپال (۳۵) خواجہ عبداللہ (۳۶) غلام محمد (۳۷) زاہد حسین (۳۸) ـــــ

پروفیسر انوار احمد زئی

یوسف میمن ۔۔ دشتِ امکاں کا گم نام مسافر

میر پور خاص سے نوید سروش نے اطلاع دی ہے کہ یوسف میمن بھی چل بسے۔
موت سے کس کو رستگاری ہے۔

مجھے بھی سب کی طرح ان کے دنیا سے اُٹھ جانے پر افسوس ہے مگر مجھے ان کی موت سے زیادہ ان کی لائبریری کے مر جانے کے خوف نے بے چین کیا ہوا ہے اور میرے اس کرب میں وفاقی اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور دانشور ڈاکٹر ظفر اقبال، سیرت چیئر کے ڈاکٹر عزیز الرحمٰن، وفاقی یونیورسٹی کے ڈاکٹر عبدالرشید اور صدر شعبۂ ابلاغ عامہ، کراچی یونیورسٹی ڈاکٹر محمود غزنوی سب ہی شریک ہیں۔ ہم ایک دعوت پر جمع ہیں مگر اب یہ چھوٹا سا اجتماع ایک بہت ہی بڑے شخص اور اس سے اور زیادہ بڑے ادارے کے لیے تعزیتی جلسہ سا بن گیا ہے۔ باتیں سب مرنے والے اور اس کی وسیع اور نادر لائبریری کی ہی کر رہے ہیں۔ صرف ایک شخص یہاں ایسے ہیں جن کے لیے یہ نام نیا سا ہے اور وہ ہندوستان سے آئے ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق ڈائریکٹر سیرت چیئر ڈاکٹر محمد یاسین مظہر صدیقی ہیں اور ان ہی کو میں مرنے والے کے زندہ رہ جانے والی حکایتیں سنا رہا ہوں۔

ڈاکٹر محمد یوسف میمن کون؟ ۔۔۔ عربی میں پی ایچ ڈی، غریب و نادار طلبہ کے لیے مفت تعلیم کے لیے اپنے ہی قائم کردہ اورینٹیل کالج کے رکن رکیں، ہزار گز کے دو منزلہ مکان کے ہر کمرے میں بھی بے شمار کتابوں سے آراستہ لائبریری کے نگراں اور امیں، کتاب دوست، کتاب یار، کتاب زدہ، کتاب گزیدہ۔ جی ہاں ۔۔۔ یہ تھے ڈاکٹر محمد یوسف میمن ۔۔ ان کی بلڈنگ میں صرف ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جہاں وہ اپنی بیوی کے ساتھ مہاجروں کی سی زندگی گزار رہے تھے، ان کی طبعی اولاد

کوئی نہیں تھی، کتابیں ان کی مائیں تھیں، وہی ان کی بہنیں، وہی ان کی بیٹیاں، وہی ان کی پروردہ اور وہ ان کے پروردہ۔

یوسف میمن، سندھ میں پیدا ہوئے، ان کے آباء یہیں کے تھے نسلوں سے اسی دھرتی کے سپوت۔۔۔ مگر وہ خود کو مہاجر کہتے تھے اور اس کی حکایت بھی مزے لے لے کر سناتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ مہاجر کون ہوتا ہے۔ وہی نا جو ایک مقصد کے تحت اپنے آبائی ٹھکانے کو خیر باد کہے اور اس جگہ آبسے جو اس کے مقصد کے حصول سے قریب ہو یا قریب تر ہو۔ اپنی ہی وضع کردہ اس تعریف کی تشریح بھی خود کرتے تھے۔ ان کا اپنا کہنا کچھ یوں تھا۔

''زئی صاحب! ۱۲۸ اگست کا دن تھا، سال ۱۹۴۷ء کا۔ سہ پہر کا وقت۔ ہمارا آبائی ٹھکانہ نگر پارکر تھا۔۔۔ ہم اپنے ہم عصروں ہمجولیوں کے صبح شام مور کے رقص ہی کو سب سے بڑی تفریح سمجھتے تھے اور اس وقت اسی منظر کا مزا لے رہے تھے ہمارے چونرے کے سامنے ہی یہ میدان تھا جس میں شام ڈھلے دنیا بھر کا حسن آسمٹتا تھا اور ہمارے دل موروں کے ساتھ رقص کناں ہو جاتے تھے۔'' پھر ہمیں سمجھانے کے لیے بات کا رخ موڑ دیا اور کہنے لگے۔ ''زئی صاحب! آپ چونرا جانتے ہیں کسے کہتے ہیں۔'' میں نے کہا ''جی میں تھر میں رہا ہوں۔ میں نے کئی ایسی شامیں اور صبحیں اور راتیں اور صبحیں، اس ریگزار میں گزاری ہیں جہاں رات کا میلہ، دن کے منظر سے زیادہ روشن ہوتا ہے۔ میں نے مٹھی، نگر پارکر، ڈانوں واندل، اسلام کوٹ، ڈیپلو، چھاچھرو، کنری، عمرکوٹ اور جھنجی، سب ٹھکانوں کی خاک چھانی ہے اور اس خاک سے اپنی ذات کو صیقل اور خیال کو پختہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ چونرا ان ہی تھری ٹھکانوں میں رہنے والوں کے اس گھر کو کہتے ہیں، جو آبنوسی رنگ کی تیلیوں اور سرکنڈوں کو خراش کر کے فنکارانہ انداز میں چھوٹے سے گنبد کی صورت میں بنایا جاتا ہے۔ جس میں سے چھن چھن کر دن کے وقت دھوپ اور رات کو چاندنی ان گھروں میں دیوں کا کام کرتی ہے۔ اور بارش میں کہ جو تھر کے لوگوں کی آسائش

کی نوید ہوتی ہے، یہی چوڑے پر سات کے موتیوں سے اندر کی ہر چیز کو بھگوتے ہیں مگر یہاں کے لوگ اسے ابرِ رحمت سمجھ کر ان ہی بوندوں کو موتیوں کی لڑیاں جان کر اپنے گھروں کو بھیج دیتے ہیں اور باہر نکل کر بھیگے بدن سے موسم کا سواگت کرتے ہیں۔ مگر ایسا کبھی کبھی ہوتا ہے ورنہ بے برسات، گرم موسموں میں دھوپ اور تمازت، ریت اور گرد، ان کا مقدر ہے۔ پانی کی بوند بوند کو ترسنے والے یہ لوگ برسات کے پانی کے گدلے ذخیرے سے مہینوں پیاس بجھاتے اور غیر مصفا اس دولت کو سینت سینت کر رکھتے اور سان رسان سے استعمال کرتے ہیں کہ یہی ان کا مقدر ہے۔۔۔ ابھی تک تو!!''

اوہ۔۔۔ بات بہت دور تک چلی گئی۔۔۔ جب میمن صاحب کو علم ہو گیا کہ میں چوڑے کا مطلب جانتا ہوں تو انہوں نے میری دخل اندازی کو نظر انداز کر کے اپنی معقولات کو جاری رکھا۔

''توزئی صاحب! ہم کھیل اور نظارے میں گم تھے کہ ہمیں اپنے چوڑے سے اپنے ابا جان کی چیخ سنائی دی اور پھر بہت سی اجتماعی چیخیں۔ یہ در ہے کہ یہ چوڑا ہمارے ابا کی اوطاق جیسا تھا۔ ۔۔۔ جب آپ چوڑے سے واقف ہیں تو اوطاق بھی سمجھتے ہوں گے یہ تو ہر شہر کی اصطلاح ہے۔ جی ہاں۔۔۔ یہ گھر کے اس حصے کو کہتے ہیں جسے عام شہروں میں یا بڑے محلوں میں ''مردانہ'' کہا جاتا ہے۔ تو اس وقت ہمارے ابا کے اوطاق میں ان کے دوست احباب جمع تھے۔ ہم نے یہ غیر متوقع چیخ سنی تو موروں کے رقص رمیدہ خواب سے چونکے اور بھاگے اس طرف جہاں سے چیخیں ہم تک آرہی تھیں۔۔۔ جی ! ہم اس وقت گیارہ سال کے تھے۔''

''زئی صاحب۔۔۔ ہم اندر آئے تو دیکھا کہ چیخنے والے مرد روایتی سندھی رقص ہو جمالو کر رہے ہیں اور وہ ایسا کرتے ہوئے چوڑے سے باہر آگئے ہیں اور ان کے ساتھ اریب قریب کے چوڑوں سے نکل نکل کر اور لوگ بھی شاملِ رقص ہو رہے ہیں اور عورتیں اپنی بڑی بڑی اوڑھنیوں اور کلائی سے بازو تک پہنی ہوئی سفید سفید موٹی موٹی ہاتھی دانت سے بنی ہوئی چوڑیوں کی اوٹ بنا کر ان عمر رسیدہ دیوانوں کو اس سے موسم کی برسات پر خوش ہوتے اور ناچتے دیکھ رہی ہیں۔ جی

ہاں ہم بے موسم کی برسات کا سواگت بھی اسی طرح کرتے ہیں۔ مگر اُس وقت تو مطلع صاف تھا۔ بادل سے آزاد آسمان بھی ان دیوانوں کی اس حرکت پر ہنس رہا تھا۔ کچھ دیر بعد رقص کی پُراسراریت سب پر واضح ہوئی تو ہمارے ابا جان نے کہ وہ اس بستی کے مکھیا یعنی بڑے تھے، باآواز لوگوں کو مطلع کیا کہ لوگو! ابھی میر پور خاص سے آنے والے دھنی بخش نے اطلاع دی ہے کہ پاکستان بن گیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ہمارا نگر پاکستان کے حصے میں آیا ہے۔ یہ سننا تھا کہ اب تو عورتوں نے بھی اپنا اپنا دائرہ بنا کر گانا شروع کر دیا اور ہم لڑکوں نے نعرے لگانا۔ پاکستان بننے کے دو ہفتے بعد یہ اطلاع اس سرحدی گاؤں تک پہنچی تھی۔ کتنی جلدی زمانہ بدل گیا ہے۔ ترسیل اطلاع کی یہ تاخیر آج کی نسل کے لیے سب سے بڑی حیرت ہوگی۔"

"زکی صاحب! ابا جان نے کہا کہ نیا ملک بن گیا ہے تو ہم اپنے بچوں کو اُس کام میں لگاتے ہیں جو اس ملک کو مضبوط کرے۔ جوان اور لڑکے میرے ساتھ میر پور خاص چلیں اور عورتیں کم سن بچے اور ضعیف یہیں ٹھہریں۔ ہم وہاں جا کر رضا کاروں کا کام کریں گے، سنا ہے کہ لوگ ہندوستان سے ہجرت کر کے میر پور آ رہے ہیں، انہیں مدد کی ضرورت ہے، ہم ان کے استقبال میں پیچھے نہیں رہنا چاہتے۔۔۔ اور زکی صاحب! یوں ہم دوسرے دن نگر سے روانہ ہو کر تین دن کی مسافت کے بعد میر پور خاص پہنچے۔ نگر سے نکلنے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔۔۔ اور پھر زکی صاحب! ہم خود فٹ پاتھ پر سوئے، ریلوے پلیٹ فارم پر رُکے اور آنے والوں کی آجیاں کی۔۔۔ یہ سلسلہ بہت دن تک چلتا رہا۔ پھر سرحد پار سے آنے والے بہت سے لوگ جب اپنے اپنے گھروں میں بس گئے تو ہم میں سے بہت سے نگر لوٹ گئے۔ میں یہیں کا ہو رہا۔۔۔ تو پھر میں بھی ہوا نا، مہاجر؟! کیا کہتے ہیں آپ ؟!"۔۔۔ اور پھر انھوں نے بتایا کہ میر پور خاص آنے کے بعد ہمیں بڑے بڑے سے مکانوں کو دیکھنے کا پہلا تجربہ ہوا۔ ہم نے پوچھا کہ یہ کیا ہیں تو ہمیں بتایا گیا کہ یہ یہاں کے چونرے ہیں۔ اُف توبہ۔۔۔ چونرے اور اتنے بڑے بڑے کئی منزلہ اور کشادہ اور ہوادار جن کی نہ چھتیں دھوپ برساتی ہیں نہ برسات میں بوندیں ٹپکاتی ہیں، مگر یہ محل محروم ہیں رقصِ طاؤس سے۔ کتنا بڑا نقصان ہے نا۔۔۔ کتنا بڑا تاوان!!"

"زکی صاحب! ہمیں میرپورخاص آئے کوئی مہینہ ہو گیا تھا۔ فٹ پاتھ پر سوتے سوتے کمر تختہ ہو گئی تھی۔ تب کسی مہربان نے بتایا کہ آنے والوں میں تقسیم ہونے کے بعد بھی یہاں سے جانے والوں کے بڑے بڑے کچھ مکان خالی پڑے ہیں۔ عارضی طور پر ہم ان میں سے کسی میں رہ سکتے ہیں۔ ابا جان نے اسٹیشن سے قریب ایسے ہی ایک مکان کو چن لیا اور ہم اس میں آ گئے۔ کمروں کی کشادگی تو ہم دیکھ ہی چکے تھے اس لیے کہ بہت سے، ویسے مکان ہم نے سرحد پار سے آنے والوں کے حوالے کیے تھے مگر یہاں آ کر ایک اور طلسم کدے سے آشنائی ہوئی۔۔۔ جی ہاں زکی صاحب! اسے ہم اپنا حمام باد گرہی کہیں گے۔ ہوا یوں کہ کمرے دیکھتے دیکھتے ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں کمرے کے اندر نلکا لگا ہوا تھا اور وہ نلکا پانی بھی بہا رہا تھا۔ ہم نے کہا یہ کیا ہے؟ ہمیں بتایا گیا کہ یہ نہانے کی جگہ ہے اسے غسل خانہ کہتے ہیں۔ یہ رقبے میں ہمارے چوزے سے بڑا تھا۔ ہم نے کہا ہم نہا لیں۔۔۔ قبضہ دینے والوں نے مسکرا کر کہا تو کس نے منع کیا ہے مگر تم یہاں سومت جانا۔ ہم نے دروازہ بند کیا، نلکے کے نیچے رکھی بالٹی میں نلکا کھولا۔۔۔ اور زکی صاحب ہم پانی کی بوند بوند کو ترسنے والے مسرت بخش حیرت سے پانی کوڑ کے بغیر اس طرح آتے دیکھتے رہے اور اپنے بدن پر چٹکیاں لے لے کر خود کو تسلی دیتے رہے کہ یہ خواب نہیں حقیقت ہے اور پھر جب وہ بالٹی پانی سے لبالب بھر گئی تو ہم نے ایک جھٹکے میں اسے بہا دیا اور پھر سے بالٹی نلکے کے نیچے رکھ دی وہ پھر بھری، اس بار بھی ہم نے بالٹی کو الٹ دیا، پانی بہا دیا، تیسری بار کی بالٹی سے، ہم نہائے، کبھی ہم پانی سے برتن بھر کر جسم پر ڈالتے اور کبھی ذرا نیچے ہو کر خود نلکے تلے آ جاتے۔۔۔ اُف کیا سرشاری تھی۔۔۔ زکی صاحب! ہم نے اس کے بعد اس سے زیادہ "عیاشی" کبھی نہ کی!!"

یوسف میمن صاحب نے اس شہر میں رہ کر اپنی تعلیم مکمل کی اور عربی میں پی ایچ ڈی کیا۔ سخت محنت سے پیسہ کمایا مگر سب کا سب کتابوں کے خریدنے اور انہیں سجانے میں صرف کر دیا۔ ان کی لائبریری میرپورخاص کی ذاتی لائبریریوں میں شاید سب سے بڑی تھی اور اگر نہیں تھی تو تنظیم اور ترتیب میں تو اس کا ثانی نہ تھا۔

میں جب اپنے دورانِ قیام میرپور خاص کہ وہاں مجھے حکومت نے پہلا تعلیمی بورڈ قائم کرنے کے لیے بھیجا تھا ان کی لائبریری میں پہلی بار گیا تو کئی گھنٹے گزرانے کے بعد بھی میں ان کی لائبریری کو مکمل طور پر نہ دیکھ سکا۔ انہیں لائبریری سے عشق تھا اور کتابوں سے اپنے بچوں کی طرح محبت ۔۔اس کی ترتیب خود ان کی اپنی تھی۔۔انہوں نے لائبریری کے شعبے بنائے ہوئے تھے سیاسی، اقتصادی، ادبی، سماجی، مذہبی، مسلکی، تحریکی وغیرہ وغیرہ بے شمار، ان گنت، لاتعداد شعبے اور ان میں حسن یہ تھا کہ ایک طرف مسلم لیگ کا شعبہ اور اس کے سامنے ردِ مسلم لیگ کا۔ایک جانب کانگریس کا ہے اور دوسری طرف ردِ کانگریس کا۔۔۔وہ دیوبندی مسلک کا یہ اس کے مخالفین کا وہ بریلوی، وہ شیعہ، وہ بہائی، وہ قادیانی۔۔۔۔اور پھر۔۔۔آتے آتے۔۔انہوں نے بتایا کہ یہ دنیا بھر کے ادبی رسائل کے مختلف نمبروالا شعبہ ہے۔آپ کسی نمبر کا نام لیں میں نکال کر آپ کے سامنے رکھ دوں گا۔ یہ سن کر ہمیں بھی جوش آ گیا، ہم نے میمن صاحب کو اپنی دانست میں مشکل میں ڈالنے کی نیت سے کہا ''اچھا تو جناب ہمیں نکال کر دیجئے نگار کا ماجد ولین نمبر''۔۔انہوں نے حیرت سے ہمیں دیکھا۔ہم اندر ہی اندر اپنی فتح پر مسکرائے مگر جلد ہی ہماری مسکراہٹ معدوم ہو گئی، وہ چھوٹی سی سیڑھی پر چڑھے اور نگار کا ماجد ولین نمبر نکال کر ہمارے سامنے رکھتے ہوئے بولے ''یہ لیجئے یہ ہے آپ کا مطلوبہ نمبر۔۔۔مگر یہ بتایئے کہ آپ کو اس کا علم کیسے ہوا۔ یہ تو آج تک کسی نے طلب نہیں کیا تھا اور میرا خیال تھا کہ اس نمبر کے بارے میں کوئی نہیں جانتا''۔۔ہم نے نمبر کو ہاتھ میں لیتے ہوئے انہیں بتایا کہ ہم نے اس رسالے کو اس وقت پڑھ لیا تھا جب ہم انٹر کے طالب علم تھے۔

ڈاکٹر میمن کا وصف یہ بھی تھا کہ وہ ہر ہفتے کراچی آتے۔ یہاں سے فٹ پاتھ پر بظاہر کم داموں میں فروخت ہونے والی مگر کیفیت کے اعتبار سے نادر کتابوں کو خریدتے۔سنا ہے کہ اس کارِ کمال میں ان کے سب سے بڑے حریف ڈاکٹر ظفر اقبال ہوا کرتے تھے۔خود ڈاکٹر ظفر اقبال نے ہمیں بتایا کہ ہم کتابوں کے لینے میں ایک دوسرے کے حریف ہو جاتے تھے۔کبھی وہ جیتتے تھے اور کبھی ہم۔۔میمن صاحب یہ کتابیں لے کر میرپور خاص جاتے جہاں انہوں نے آٹھ دس ٹھیلے خرید

کرر کھے ہوئے تھے اور آٹھ دس کتاب دوست اور نادار طلبہ کو چنا ہوا تھا جنھیں وہ یہ کتابیں اور ٹھیلے دے دیتے تھے جو جمعہ اور اتوار کو میرپور کے شاہی بازار کے چوراہے پر ان ٹھیلوں پر سجا کر یہ کتابیں فروخت کرتے۔ میمن صاحب بے کرایہ ٹھیلے فراہم کرتے تھے اور منافع کا ۲۵ فیصد ان طلبہ کو اپنے تعلیمی اخراجات نکالنے کے لیے دے دیا کرتے تھے۔ مجھے خبر ہے کہ ان محنت کش طلبہ میں سے کم از کم دو طلبہ ایسے ہیں جو اس وقت خود پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔

جب صاحب طرز نوجوان شاعر ذیشان ساحل مرحوم نے کتاب دوست اور جمہوریہ لائبریری کے محسن اپنے والد سید محمد خضر مہدی کی پچیسویں برسی پر مجھے فون کر کے کہا تھا "انوار بھائی! آج خضر صاحب اور جمہور لائبریری دونوں کو مرے ہوئے پچیس سال ہو گئے ہیں۔ کیا ہم ان مرحومین کو یاد کرنے کے لیے کوئی تقریب کر ڈالیں"۔۔۔ تو میں نے فوراً ہی حیدر آباد کے تعلیمی بورڈ کی سماعت گاہ میں ان دونوں مرنے والی ہستیوں کو یاد کرنے یا یاد رکھنے کے لیے ایک تقریب سجائی تھی جس میں بے شمار کتاب دوست اور خضر دوست افراد آئے تھے، خود خضر صاحب کے فرزندان اور دختران بھی تھے اور اس محفل کی صدارت میں نے ڈاکٹر یوسف میمن سے کرائی تھی، اس لیے کہ وہی اس محفل کی صدارت کا حق رکھتے تھے، حالانکہ وہ ایسے محجوب سے کرسی صدارت پر بیٹھے تھے جیسے وہ سید محمد خضر مہدی کی کرسی پر بزور بیٹھ گئے ہوں۔۔۔ بڑے لوگ بڑے نظر آتے ہیں، خود کو بڑا ظاہر نہیں کرتے۔

نوید سروش! تم نے کیا خبر دے دی کہ وہ زندہ شخص بھی آج مر گیا۔ مگر نوید سروش! تم نے یہ نہیں بتایا کہ ڈاکٹر محمد یوسف میمن کو تو دفنا دیا گیا مگر ان کی لائبریری کا کیا ہوا۔۔۔ اگر ان کا کتب خانہ زندہ ہے تو کون کہتا ہے کہ یوسف میمن مر گئے اور اگر لائبریری مر گئی تو پھر نوید سروش۔۔۔ ہم میں سے کون زندہ بچا۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی   دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

پروفیسر حسن عسکری کاظمی

''داستاں کہتے کہتے''

اشفاق احمد خاں سے میری ملاقات ان کے انتقال سے چند مہینے پیشتر سردار سوز کی دو کتابوں کی تقریب رونمائی میں ہوئی۔ سردار سوز امریکہ سے آتے ہیں تو احباب کو کسی نہ کسی بہانے جمع کر لیتے ہیں پرل کانٹی نینٹل میں وہ شام بھی ایسی تھی جس میں نمایاں شخصیت اشفاق احمد خاں کی تھی اور ان کی اہلیہ بانو قدسیہ بھی سٹیج پر موجود تھیں، دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ اور بلا کا اعتماد یہ ظاہر کر رہا تھا کہ زندگی کے سفر میں ایک جیسے تجربوں سے گزر رہے ہیں، اس اعتبار سے وہ آئینہ یک دگر تھے، دونوں کے ہاں ایک جیسے الفاظ کا ہونا احباب کے لیے ایک جیسی گنجائش محبت اور مروت کا ہونا قابل رشک زندگی گزارنے کی روشن دلیل تھی، بانو قدسیہ کا اشفاق احمد خاں کے سفر آخرت پر روانہ ہونے کے وقت یہ کہنا کہ ایک نہ ایک دن تو ساتھ چھوٹنا ہی تھا، اشفاق بہترین ہمسفر تھے خدا کا شکر ہے کہ ان کے ساتھ پچاس سال بسر کیے۔ ان چند لفظوں میں بہت بڑی بات کہی گئی ہے جہاں اس جملے میں بنیادی حقیقت کو تسلیم کیا گیا ہے کہ ایک نہ ایک دن جدائی کا ذائقہ کسی ایک کو چکھنا ہے وہاں اپنے شوہر کو بہترین ہمسفر قرار دینا کامیاب زندگی بسر کرنے کا اعلان بھی ہے۔ یہ خوش نصیبی ہے کہ پچاس سال کی رفاقت میں کہیں کوئی حرف شکایت زبان پر نہیں آیا اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کا حوصلہ اسی شخص میں ہو سکتا ہے جو زندگی میں رجائیت کے فلسفے کا علمبردار ہو اور غم کی حقیقت کو سمجھتا ہو کہ

ایک بھی پتی اگر کم ہو تو وہ گل ہی نہیں   جو خزاں نادیدہ ہو بلبل وہ بلبل ہی نہیں

———

غم و خوشی کے تانے بانوں سے زندگی کا لباس بنایا گیا ہے اس لیے اشفاق احمد خاں کے

انتقال پر ہم سب غمزدہ ہیں، وہ ایسے انسان تھے جو بہت کچھ کہنا چاہتے تھے انہوں نے بہت کچھ لکھا اور کہا لیکن اتنا لکھنے اور کہنے کے باوجود کچھ باتیں ان کہی رہ گئیں وہ بحیثیت پاکستانی ادیب جتنا کچھ لکھ سکے اسے پڑھنے کی ضرورت ہے، ان کی موت پر کئی باتیں ہوئیں مگر مجھ سمیت کتنے لوگ ہیں جو یہ دعویٰ کرسکیں کہ اپنوں نے بالاستیعاب وہ سب کچھ پڑھا جو اشفاق احمد نے لکھا۔ یقیناً ان کا گھرانہ بہت پڑھا لکھا ان کا گھر داستان سرائے، ان کی گفتگو ورثہ اور ان کا زاویہ نظر معنویت سے بھرپور پایا۔ مگر وہ جو کچھ کہتے رہے ہم نے سنا اور لطف اٹھایا ہم سے وہ جس نوع کا تقاضا رکھتے تھے وہ پورا نہ ہوسکا، انہیں وسعت نظری کشادہ دلی اور عالی ظرفی عزیز تھی مگر افسوس ہے کہ ہم اور ہمارے معاشرے میں یہی تین خصوصیات کمیاب ہیں، تنگ نظری، گھٹن اور کم ظرفی جیسی منفی صفات در آئیں ہم نے اپنے قومی تشخص کو اپنے کردار سے مسخ کردیا اشفاق احمد خاں پرانی قدروں کو زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ مہمان نوازی، بزرگوں کا احترام، فنون لطیفہ سے شغف اور کہانی کے حوالے سے بدی اور نیکی کی آویزش میں خیر کی خوبصورتی کو نمایاں کرنا ان کا بہترین مشغلہ تھا، وہ عہد شباب میں شاعری اور موسیقی سے گہرا شغف رکھتے تھے، ان کے خیال میں شاعری انسانی پاکیزہ جذبوں کا اظہار اور موسیقی نہ صرف روح کی غذا تھی بلکہ آداب زندگی سکھانے، محفل میں زانوئے ادب تہ کرنے اور فنکار میں چھپی صلاحیتوں کو ذوق سماعت کی بدولت نکھارنے کا وسیلہ قرار پائی مگر آج کل اچھل کود، جسمانی خطوط کی نمائش، سطحی شاعری بلکہ تک بندی کی بھونڈی صورت نظر آتی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ محفل موسیقی میں بھی لوگ باوضو بیٹھتے یا کم از کم شائستگی اور قرینے کو ملحوظ خاطر رکھتے۔ اشفاق احمد خان نے جس محفل موسیقی کی طرح ڈالی اسے دوبارہ زندہ کیا جانا چاہیئے۔ ارباب نشر واشاعت کا فرض ہے کہ اشفاق احمد خاں کے ساتھ اپنی عقیدت کے پیش نظر ان کے پروگراموں کو دوبارہ ٹیلی کاسٹ کریں اور جو بنیاد انہوں نے فراہم کی اس پر عظیم عمارت اٹھائی جائے۔ پاپ گانے سن کر ذوق سماعت پست ہوچکا ہے، غزل کی گائیگی اور اس سے وابستہ فنکاروں کی حق تلفی کا ازالہ بھی ہونا چاہیئے اور اشفاق احمد خاں کی نظامت کی یاد تازہ کرنے

کے لیے فرشی نشست کا اہتمام کرنا بھی ضروری ہے۔ خصوصاً پاکستان ٹیلی وژن نیز لاہور کو اپنی درخشندہ روایت سے انحراف زیب نہیں دیتا۔

ہم اپنے ملک کے دانشوروں کو رسمی طور پر خراج عقیدت پیش کرتے نہیں تھکتے، اشفاق احمد خاں کے انتقال پر بھی یہی صورت احوال دیکھنے میں آئی خیر یہ بھی غنیمت ہے لیکن پاکستان میں دانشوروں، ادیبوں، شاعروں اور قلم کاروں کی جتنی قدر و منزلت ہے وہ ہم سب جانتے ہیں، اہل علم سے روابط کا فقدان اس لیے بھی کھٹکتا ہے کہ یہاں طاقت، اقتدار اور اختیار کو سلام کرنے کی روایت پختہ ہو چکی ہے جس ملک میں عام سطح غربت اور سطح جہالت انتہا کو چھو رہے ہوں وہاں صاحبان علم کی کسمپرسی کی شکایت کرنا فضول ہے۔ اشفاق احمد خاں کے رخصت ہونے پر یہ سوال اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ معیار زندگی کی طلب میں ہر فرد مبتلائے عذاب ہے، دانشوروں اور قلم قبیلے کی حالت یہ ہے وہ اپنی زندگی میں احساس محرومی کا شکار رہتے ہیں انہیں کسی منصب یا عہدے کی خواہش نہیں ہوتی لیکن ان سے کام لینے میں بہت سی مصلحتیں حائل ہو جاتی ہیں۔ وہ حرف حق بلند کرتے ہیں ایک طرف کر دیے جاتے ہیں اشفاق احمد خاں کا وصف خاص یہ تھا کہ وہ قصے کہانی اور واقعے تمثیلی انداز اظہار کے پردے میں بہت کچھ کہنے کا ہنر رکھتے تھے ان کے ڈرامے 'ایک محبت سو افسانے' میں ان کے موضوعات تلخ حقائق پر مبنی ہوتے تھے کہ ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا کہ وہ بڑے پتے کی بات کر گئے ہیں، اسی طرح 'زاویہ' میں وہ اپنے دلچسپ بیانیہ انداز میں جتنی باتیں کرتے ان میں زندگی کے تلخ و شیریں تجربے، مشاہدے اور واقعات سمو کر جو استنباط کرتے وہ بہت معانی خیز ہوتے وہ سیاست دان نہیں تھے لیکن ان کا سیاسی وژن اور حقائق پر گہری نظر ایسی ہوتی کہ ہم انہیں صرف ادیب یا افسانہ نگار سمجھ کر سرسری نہیں گزر سکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے بہت پہلے امریکہ کے توسیع پسندانہ عزائم کو بھانپ لیا تھا اور ان کے میڈیا سے متعلق دو لفظوں میں یہ کہہ کر ہمیں چونکا دیا تھا کہ وہ ہمارے گھروں کے روشن دانوں سے جھانکنا شروع کر چکے ہیں اسی طرح ان کا ایک کردار بابا جی ایسا فرد باشعور ہے جو باصفا

بھی ہے اور جس کے پاس ہر درد کی دوا ہے، دراصل وہ بابا جی ان کا ہمزاد ہے جو قدم قدم پر ان پر انکشاف کے مراحل طے کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے وہ ایک استعارہ ہے جسے آدمی کی وجدانی قوت کا مظہر قرار دیا جا سکتا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اشفاق احمد خاں پاکستان کے ممتاز ترین ادیبوں میں سے تھے، انہوں نے اردو افسانے اور ڈرامے کو پاکستانی سماج کے ادبی اظہار کا وسیلہ بنایا اور اپنی تخلیقات میں اعلیٰ اخلاقی اور تہذیبی قدروں کی نمائندگی کی، ان کے ہاں فکر کی گہرائی اور خیال کی پہنائی کے ساتھ واقعاتی حقائق نے افسانوں اور ڈراموں کو عوام میں مقبول بنایا اور وہ اپنے کرداروں سے کام لینے کا ہنر آزمانے میں کامیاب رہتے یہی وجہ ہے کہ جن اداکاروں کو یہ کردار سونپے گئے وہ اشفاق احمد خاں کی تحریروں کی بدولت زندگی پا گئے، خصوصاً فردوس جمال نے نہایت عمدہ اداکاری سے ان کرداروں کو زندۂ جاوید بنا دیا۔ اشفاق احمد خاں کے بعض ڈرامے ایسے بھی پڑھنے اور دیکھنے کو ملے جو علامتی ہونے کے باعث قدرے عوامی تفہیم کے معیار سے بلند ہیں، ایسے ڈراموں کی گرفت مستقبل کے قاری اور ناظر پر مضبوط ہوگی اس کی مثال غالب کی شاعری سے دی جا سکتی ہے کہ غالب کو ان کی زندگی میں جتنی پذیرائی ملی اس سے کہیں زیادہ مستقبل میں ملی، غالب فہمی کا زمانہ وہ نہیں تھا جو غالب کو میسر آیا بلکہ وہ یہ کہہ کر رخصت ہو گئے کہ:

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج　　　میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

کچھ یہی کیفیت اشفاق احمد خاں کے بعض افسانوں، کہانیوں اور باتوں میں نظر آتی ہے کہ وہ ایسی گفتگو بھی کرتے رہے جو ان کے سامعین سمجھ نہ پائے ہم یقیناً ایک صوفی، صاحب طرز افسانہ نگار، عظیم دانشور اور ٹیبل ٹاک کے ماہر سے محروم ہو گئے۔ وہ داستان طراز تھے، ہماری دھرتی کے سپوت، وفا پرور انسان دوست اور دردمند انسان تھے، انہیں موت کے قدموں کی چاپ صاف سنائی دے رہی تھی ان کا شعلہ حیات بجھنے کے قریب تھا لیکن ان کی حوصلہ مندی کا یہ واقعہ یادگار رہے گا کہ اپنے بیٹے انیق احمد کو یہ کہہ کر امریکہ بھجوا دیا کہ میں بالکل تندرست ہوں وہ اپنے والد کی خرابی صحت کی خبر سن کر پاکستان آئے ہوئے تھے اور گزشتہ کئی دنوں سے یہاں لاہور میں قیام کیے

ہوئے تھے وہ ۶ ستمبر کو یہاں سے روانہ ہوئے اور اگلے روز صبح ۹ بجے اشفاق احمد اللہ کو پیارے ہو گئے۔

ان کی تمام زندگی داستان گوئی میں گزری، ان کی مثال محفل میں قصہ سنانے والے اس شخص کی سی تھی جو ماہر نفسیات بھی تھا اور لوگوں کو ہمہ تن متوجہ رکھنے کا ہنر جانتا تھا، وہ کہانی کے تار و پود بنتا رہا یہاں تک کہ وہ قصہ در قصہ بیان کرنے اور مرکزی کہانی کو آگے بڑھانے لگا ابھی سننے والے جاگ رہے تھے کہانی ناتمام رہ گئی کردار خاموش ہو گئے، بابا کس ویرانے میں تنہا سر جھکائے بیٹھا رہا، رات ڈھلنے لگی ستارہ سحری جھلملانے لگا، خواب بے تعبیر ہو گئے، ''زاویہ'' ''خاک بسر'' اور ''گڈریا'' اپنی بھیڑوں سے بے خبر ہو گیا۔ وہ کہانی جسے بڑے شوق سے سنا جا رہا تھا ادھوری رہ گئی اور کہانی کار اشفاق احمد کی آنکھ مُند گئی

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا　　　ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

داستان سرائے کے پردوں پر ایک تصویر آویزاں ہے جو ہم سے پوچھ رہی ہے مجھے بھول تو نہ جاؤ گے!

خالد صدیقی

تربیت

آج میں صبح کے وقت اپنے کمرے سے باہر ایک دلچسپ منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میرے کمرے سے باہر لان میں موجود ایک درخت پر ایک چڑیا نے اپنی رہائش کے لیے ایک گوشۂ سکون بنا رکھا ہے۔ جس میں وہ اپنے ننھے سے بچے کے ساتھ رہائش پذیر ہے۔ آج وہ اپنے بچے کو گھونسلے سے باہر نکل کر آزاد فضا میں آنے کی ترغیب دے رہی تھی۔ وہ اُس کے سامنے اُڑ اُڑ کر اُس کی ہمت بڑھا رہی تھی۔ آخر ننھے پہلوان کو جوش آ ہی گیا۔ اُس نے گھونسلے سے چھلانگ لگائی اور ہلکی سی پرواز کے بعد وہ زمین پر آ رہا۔ چڑیا نے پھر اُس کی ہمت بڑھائی اور اُسے مزید پرواز کے لیے رضامند کیا۔ ننھے پہلوان نے اپنی ماں کی آنکھ میں آنکھ ڈالی اپنے پروں کو تولا اور فضا میں اُڑتے ہوئے ایک درخت پر جا بیٹھا۔ اُس کی ماں خوشی سے اُس کے گرد چکر لگانے لگی۔ چڑیا کے لاڈلے نے اپنی ماں کو مُسکرا کر دیکھا۔ ارد گرد کے منظر کو گھورا، پھر ایک ہی جست میں اپنے پروں کو پھیلا کر فضا کی لطافتوں سے کھیلنے لگا۔ یہ چڑیا کی ممتا سے بھرپور تربیت کا اثر تھا کہ اُس کا لاڈلا اُڑنے کی صلاحیت سے متعارف ہو گیا۔ یہ پُرسکون منظر دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں بھی چڑیا کے بچے جیسا ہی تو ہوں جو اپنے کمرے سے باہر فضا کی وسعتوں میں اُڑنے کے لیے نکلا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہم سب اپنے آشیانوں سے غذا کی تلاش میں نکلتے ہیں اور اپنی سمتوں میں محو پرواز ہو جاتے ہیں۔ شام ڈھلتے ہی واپسی کا رُخ اختیار کرتے ہیں۔ اپنے آشیانوں میں پہنچتے ہی سکون کا سانس لیتے ہیں۔ اس پس منظر میں جب میں سوچ کی گہرائیوں میں گم ہوتا ہوں تو مجھے اپنا بچپن یاد آ جاتا ہے۔ جب میں چڑیا کے بچے کی طرح ہر ایک کا لاڈلا ہوا کرتا تھا۔ مجھے وہ چہرے یاد آنے لگتے ہیں جو میری معصوم باتوں پر خوشی کا اظہار کرتے تھے

اُن کی اچھی باتوں میں چھپی ہوئی تربیت کی پری میرے گرد منڈلایا کرتی تھی اور مجھ سے پیار کرتی تھی خاص طور پر مجھے اپنے پڑوس میں رہنے والی خاتون بہت یاد آتی ہیں جنھیں محلے والے چھوٹی بھابی کہتے تھے۔ وہ مجھے روزانہ دلچسپ کہانیاں سناتی تھیں۔ مجھے اُن کے کہانی سنانے کے انداز میں اپنائیت اور پیار کی ایسی جھلک نظر آتی تھی جو مجھے اپنا بنا لیتی تھی۔ وہ نصیحت آموز کہانیوں کے ذریعے چپکے چپکے میری تربیت میں خاص دلچسپی لیتی تھیں۔ جس کا مجھے گمان تک نہیں ہوتا تھا۔ اُن کے لہجے کی مٹھاس اور اپنائیت مجھے ابھی تک محسوس ہوتی ہے۔ اب وہ چاہنے والے چہرے میری نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ یوں میں اپنی ذات میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہوں اور آنکھیں بند کر کے سوچ کے سفر پر نکل جاتا ہوں۔ میں اُن چہروں کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ جونہی وہ چہرے میرے ذہن کی اسکرین پر نمودار ہوتے ہیں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ چہرے میرے لیے تو گائیڈ ڈیوائنز ہیں اور میرے نزدیک رہتے ہیں۔ مجھے آنے والے خطرات سے آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ یقیناً اُن کی یہ چاہت میری نگاہوں سے اوجھل رہتے ہوئے میری تربیت سے بہ دوام پیوستہ رہتی ہے۔

بچپن کے حوالے سے مجھے تربیت کا سب سے نرالا اور خوبصورت انداز ماں باپ کی اُنگلی تھام کر چلنے میں نظر آتا ہے۔ بچے کے اُنگلی تھامتے ہی تربیت اپنا گداز پن اور اپنائیت لیے ہوئے خاموشی سے اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگتی ہے۔ اُسے تحفظ کا احساس دلاتی ہے۔ بچہ جونہی اپنے ماں باپ کی انگلی تھامے ہوئے گھر سے باہر کی دنیا میں قدم رکھتا ہے وہ باہر کی بلاؤں اور بچھڑنے کے خطرات سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ خود اعتمادی اور مسرت و انبساط اُس کے چہرے سے جھلکنے لگتی ہیں جو اُس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو حوصلہ دیتی ہیں۔ یوں وہ اپنے ماں باپ کا بے تکلف دوست بن جاتا ہے۔ یہ بے تکلفی اُس کے رگ و پے میں اس طرح سرایت کر جاتی ہے کہ وہ راستہ چلتے ہوئے اکیلے پن کے احساس سے آزاد ہو جاتا ہے۔ باہر کی دوڑتی بھاگتی ہوئی زندگی، بے ہنگم ٹریفک اور مختلف انواع کی شکلیں بچے کی آنکھوں کو متحیر کرنے لگتی ہیں۔ وہ ان کے بارے میں

سوال کرتا ہوا اور آگاہی حاصل کرتا ہوا اپنے ماں باپ کا ہمرکاب رہتا ہے۔ چلتے پھرتے ہوئے سفر کرتے ہوئے یا آوارہ گردی کرتے ہوئے کسی چیز کے بارے میں کچھ جاننا یا سیکھنا تربیت ہی کی ایک شکل ہے جس سے آپ علیحدہ نہیں رہ سکتے۔ بچہ جونہی اپنے ماں باپ کی انگلی سے علیحدہ ہوتا ہے وہ باہر شور مچاتی ہوئی زندگی میں یک دم اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ یوں وہ احساس محرومی کا شکار ہو کر راہ چلتی ہوئی شکلوں سے خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے مجھے وہ بچے اچھے نہیں لگتے جو اپنے بزرگوں کی انگلی تھامنے میں یا ساتھ چلنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں اس طرح وہ کچھ سیکھنے اور پانے کے عمل سے دور ہو جاتے ہیں۔ آخر ہمارے اجداد نے بابائے قوم کی مخلص قیادت کی انگلی تھام کر ہی تربیت اور آگاہی حاصل کی اور اپنا علیحدہ وطن حاصل کیا۔ اسی طرح نیلسن منڈیلا کی قوم آزادی کی چاہت میں اس کی انگلی تھام کر طویل راہوں سے گزری اور صبح آزادی سے متعارف ہوئی۔ یہ تربیت کا ایسا چلن ہے جو قوموں کی تقدیر بدل دیتا ہے۔

اس ضمن میں مجھے نپولین بونا پارٹ کا یہ قول یاد آ جاتا ہے کہ مجھے اچھی مائیں دو میں ایک اچھی قوم دوں گا۔ کیوں کہ ماں کی گود انسان کی پہلی تربیت گاہ ہے ماں کی گود سے تو محبت کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ ماں کی محبت بھری نگاہوں اور لوریوں میں تدریس کی مٹھاس پوشیدہ ہوتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ آپ ماں کی گود سے پنگوڑے میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ اس پنگوڑے میں آتے ہی اپنائیت کا پیار کا احساس لیے ہوئے جھونٹے آپ کو اپنے اردگرد موجود لوگوں سے متعارف کروانا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ تعارف آپ کی تربیت کی زینت بنتا ہے اور آپ کو پاؤں پاؤں چلنا سکھاتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ مادر علمی پنگوڑے کی شکل ہی تو ہے جس میں ہم پاؤں نکالتے ہی منتقل ہو جاتے ہیں۔ منتقلی کا سلسلہ ایک پنگوڑے سے دوسرے پنگوڑے تک جاری رہتا ہے۔ تربیت اور اپنائیت کا یہ سفر یوں مدام جاری رہتا ہے۔ یہ زندگی کا ایسا حسین امتزاج ہے جو آپ کو پل پل زندگی سے پیار کرنا سکھاتا ہے اور آپ کو اپنے قدموں پر کھڑا ہونے میں مدد دیتا ہے۔ اگر آپ غور کریں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ تربیت ایک ایسے دائرے کی مانند ہے جو

آپ کے اس ہوشربا دنیا میں آتے ہی آپ کو اپنی پناہ میں لے لیتی ہے یوں آپ گردش کے ایک مُسلسل سلسلے میں آجاتے ہیں۔ اگر آپ اس دائرے سے ارادتاً نکلنے کی کوشش کرتے ہیں تو سمجھ لیجیے کہ آپ احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں اور کچھ پانے کی بجائے کچھ کھونے کی سمت چل پڑتے ہیں۔

میں جب بھی اخبار کا مطالعہ کرتا ہوں تو مجھے تربیتی کورس کے اشتہارات کا جمِ غفیر دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ تربیت اب گھر کی چاردیواری سے نکل کر اپنا کمرشل اور ٹیکنیکی روپ دھار چکی ہے۔ وہ اپنے بارے میں کس قدر آزاد اور سوشل ہو چکی ہے کہ وہ آپ سے اپنا تعارف بے جھجک کرواتی ہے اور آپ کی نظریں اپنی طرف اُچک لیتی ہے۔ اس کا کمرشل بناؤ سنگھار لوگوں کو متواتر اپنی طرف متوجہ کیے رکھتا ہے۔ اپنے گردشی پروانہ گردش کرنے والوں کو اپنے حُسن اور ٹیکنیکی اداؤں سے مُستفیض کرتا رہتا ہے۔ یہ اس کے کمرشل پن کا بوقلمونی انداز ہے جو ہر لحہ اس کی ویلیو کو چار چاند لگائے رکھتا ہے۔ بیوروکریٹک انداز میں حکمرانی کرنے کے لیے اس کے دلربا ناز نخرے اٹھانا اس کی پہلی ضرورت ہے۔ بیوروکریٹس جونہی اس کے ناز نخروں کے ماحول سے باہر آتے ہیں وہ اس کے زیرِ اثر رہتے ہوئے اپنے قلم کی زد پر ایک دنیا کو نچائے رکھتے ہیں۔ ایک دفعہ مجھے اپنے ڈیپارٹمنٹ کی جانب سے ایک ٹریننگ کورس میں شرکت کا موقع ملا۔ ٹریننگ کورس میں دیئے جانے والے ہوم ورک کے دوران جب میں کسی ٹیڑھے مسئلے پر سوچ کی کیفیت سے گزرتا تو میں لاشعوری طور پر پنسل کو سگریٹ کا رُتبہ دیتے ہوئے ایک عادی سگریٹ نوش کی طرح بھرپور کش لگاتا اور پھر خیالی دھویں کے مرغولے چھوڑتا ہوا اُسی لطف کا مزا حاصل کرتا جو میرے دوست مختلف برانڈ کی سگریٹوں کا دھواں پھونک کر حاصل کرتے ہیں۔ سگریٹ کے لطف کی اس کیفیت کے دوران اُس مسئلے کا حل عُریاں ہو کر میرے سامنے آجاتا اور میں کورس کے شرکاء اور انسٹرکٹرز کے سامنے سُرخرو ہو جاتا۔ لیکن میرے اس طرح سُرخرو ہونے میں شاید اُس خمیرے کا بھی کمال تھا جس کا استعمال میں نے ٹریننگ کورس سے پہلے ہی شروع کر دیا تھا۔ اس خمیرے نے تو میرے دماغ کے جوہریوں کھول دیئے تھے کہ کورس کے شرکاء میری دوستی کا دم بھرنے لگے تھے۔

اس کورس میں ہر سوچ اور ہر خمیر کا بار لیش قلندر رنگ موجود تھا۔ درویش حضرات تو چائے کے وقفے میں اپنے اندر کی دنیا سے باہر نکل کر ہماری دنیا میں آجاتے اور ایسی بامعنی شگفتہ بیانی کا پرتو دکھاتے کہ میں حیرت سے ان کا منہ تکنے لگتا اور ان کے ذوقِ سلیم کی داد دیتا۔ اُن کی شگفتہ مزاجی اور بذلہ سنجی میرے ذوقِ مزاج کو اتنی بھائی کہ یہ میرے اپنے وجود کا حصہ بن گئی۔ جس کا پُر لطف نتیجہ یہ نکلا کہ میں بھی بحرِ ظرافت میں گھوڑے دوڑانے لگا۔ یہ بھی تربیت کا ایسا مظہر ہے جس کی لطافت اور چاشنی میں ابھی تک محسوس کرتا ہوں۔

ہر اچھی چیز کے تعاقب میں رہنا میری کمزوری ہے۔ میں جب کسی اچھی کتاب کی تلاش میں گھر سے نکلتا ہوں تو یہ جس جگہ بھی موجود ہو میرے قدموں کو اپنی سمت کھینچ لیتی ہے۔ میری توجہ حاصل کرنے کے لیے بار بار میرے سامنے آنے کی کوشش کرتی ہے۔ جونہی وہ میرے ہاتھ میں آتی ہے ہمیشہ کے لیے میری ہو جاتی ہے۔ اُس کو اپناتے ہی مجھے گوناگوں شادمانی ہوتی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں نے اپنی محبوبہ کو پا لیا ہے۔ کتاب جونہی میرے کمرے میں شیلف کی زینت بنتی ہے میری تسلی و تشفی قابلِ دید ہوتی ہے۔ اس بات کا اظہار میں اکثر اپنے دوستوں سے کرتا ہوں۔ میں اپنے فارغ اوقات میں ان کتابوں سے استفادہ کرتا ہوں اور اپنے ذوقِ ادب کی تسکین حاصل کرتا ہوں۔ میں جب محوِ کتاب ہوتا ہوں تو یہ مجھے اردگرد سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ مجھے کیف و مستی میں لا کر اپنے اندر کے راز میرے سپرد کرنا شروع کر دیتی ہے یوں میں 'محرمِ رازِ درونِ میخانہ' ہو جاتا ہوں۔ ان کتابوں نے چپکے چپکے مُعلّم کا روپ دھار کر میری اس انداز سے تربیت کی ہے اور میرے اندر کی کیفیتوں کو بدلا ہے کہ میں زندگی کے کسی بھی معاملے میں بھٹکنے سے محفوظ رہتا ہوں۔ میں اردو ادب کے ایک ایسے ادیب اور دانشور کو جانتا ہوں جس کی شخصیت میں حضرت داتا گنج بخش کی کتاب ''کشف المحجوب'' نے حیرت انگیز انقلاب برپا کر دیا۔ اُسے باطل نظریات سے نجات دلا کر اُس کی سوچ کی دُنیا یکسر بدل دی۔ یہ ایک طرح سے ''کشف المحجوب'' کا اس ادیب کے لیے تحفۂ مسیحائی تھا۔ جس نے اُس ادیب کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ کتاب کی تربیت

بعض اوقات فرد کے علاوہ قوموں کا قبلہ بھی درست کر دیتی ہے۔ ہماری الہامی کتاب روزِ آخر تک انسان کی رُشد و ہدایت اور تربیت کے لیے بہترین سرچشمۂ حیات ہے۔ اس لحاظ سے کتاب انسان کی بہترین مُعلم ہے۔

دنیا ایک تربیت گاہ ہے جس میں میں ہر لمحہ اپنے آپ کو تربیت کی گود میں پاتا ہوں۔ میرے اردگرد وقتاً فوقتاً رونما ہونے والی ماحولیاتی اور جمالیاتی تبدیلیاں مجھے اپنے آپ کو اپ ڈیٹ کرنے پر اُکساتی رہتی ہیں۔ میں وقت کے لحاظ سے اپ ڈیٹ ہوتے ہی معاشرے کا چلتا پھرتا وجود نظر آنے لگتا ہوں۔ میرا برتاؤ اور رفتار و گفتار تربیت کے معیارِ حُسن کی غمازی کرنے لگتے ہیں۔ جو لوگ گلوبل ویلیج کی موجودگی میں ان تبدیلیوں پر جُز بُز ہوتے ہیں اور اپنے اندر تبدیلیاں لانے پر ہچکچاتے ہیں وہ زمانے سے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ بعض دفعہ تو آپ اپنی روزمرہ کی زندگی میں کسی ایسے دلچسپ تجربے سے گزرتے ہیں جو آپ کی بند آنکھیں ہمیشہ کے لیے کھول دیتا ہے بلکہ آپ کو آئندہ کے لیے چوکنا کر دیتا ہے۔ مجھے اس قسم کے تجربات سے اکثر واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ ایک دفعہ بس میں سفر کے دوران ایک تربیت یافتہ جیب تراش نے میری پینٹ کی جیب سے بٹوہ اس مہارت سے نکالا کہ مجھے شائبہ تک نہ ہوا۔ گویا جیب تراش کی طرف سے یہ میرے لیے تنبیہ اور ایک لحاظ سے میری تربیت تھی کہ میں دورانِ سفر محتاط اور چوکنا رہا کروں۔ میں اس جیب تراش کا شکر گزار ہوں جس نے میری آنکھیں کھولنے کے لیے مجھے عملی طور پر ایسا سبق سکھایا اور تربیت دی۔ اب تو دورانِ سفر نیند کے مزے میں بھی میری آنکھیں جیمز بونڈ کی طرح کھلی رہتی ہیں اور پیٹھ پیچھے کے مناظر بخوبی دیکھتی رہتی ہیں۔ کان ہر قسم کی آہٹ سننے کے لیے انٹینا کی مانند کھڑے رہتے ہیں۔ یوں میں اپنے بٹوے سمیت بخیر و عافیت منزلِ مقصود پر پہنچ جاتا ہوں۔

میں جب گھر کے ماحول کی یکسانیت سے اُکتا جاتا ہوں تو اپنے آپ کو تروتازہ رکھنے اور کچھ سیکھنے کی خاطر گھر کے ماحول سے فرار اختیار کرتا ہوں۔ گھر سے باہر آتے ہی میرے اندر چُھپا ہوا آوارہ گرد فوراً برآمد ہو جاتا ہے اور مجھے اپنے جیسا بنا لیتا ہے۔ میں آوارہ گرد کے روپ میں آتے

ہی آوارہ گردی سے لُطف اندوز ہونے لگتا ہوں۔ اردگرد کے مناظر مجھے خوش آمدید کہتے ہوئے میرے ہم سفر ہو جاتے ہیں۔ میں باہر کے رومان پرور ماحول میں رہتے ہوئے خود کو ہر پابندی اور ذہنی دباؤ سے آزاد محسوس کرتا ہوں۔ مجھے لوگوں کا ہجوم ایک سمندر دکھائی دینے لگتا ہے جس میں میں ایک آزاد مچھلی کی طرح گھومتا پھرتا ہوں۔ لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے مجھے ان کے رویوں اور چہرے کے اُتار چڑھاؤ کے زاویوں سے آگاہی حاصل ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ یہ ایسی تربیت ہے جو آپ گھر کے ماحول میں رہتے ہوئے حاصل نہیں کر سکتے۔ آوارہ گردی نے مجھے وہ اعتماد بخشا ہے جو مجھے کسی اور نے نہیں بخشا۔ اس لیے میں اُس آوارہ گرد کا ممنون ہوں جو میرے اندر رہتا ہے۔ موقع پاتے ہی باہر آجاتا ہے۔ مجھے اُن راستوں اور مقامات سے میری شناسائی کروانے کی مُہم پر چل پڑتا ہے جو اس سے پہلے میرے لیے اجنبی تھے۔ آوارہ گردی کے دوران بعض اوقات میرا اسامنا اُن ایٹی پاکٹ عناصر سے ہو جاتا ہے جنھیں میں ناپسند کرتا ہوں۔ ان عناصر کو شائد میری کمزوریوں کا علم ہوتا ہے۔ جبھی وہ انتظارِ عشق میں میری راہ تک رہے ہوتے ہیں۔ اس قبیل کے لوگوں سے میں جتنا چُھپنا چاہوں چُھپ نہیں سکتا۔ یہ مجھے دیکھتے ہی اپنی کامیابی کے لیے مجھے آڑے ہاتھوں لینے کی پوری سعی کرتے ہیں۔ مگر میں بروقت اپنی حوصلہ مندی اور حاضر دماغی کے سبب ان کے دام میں آنے سے محفوظ رہتا ہوں۔ یہ شُتر بے مہار اس معاشی افراتفری کے دور میں بغیر کسی تربیت کے خودرو پودوں کی طرح اُگتے چلے جا رہے ہیں کہ ہر معصوم اور ناواقف شخص کو ان سے اپنا دامن بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں ایک دفتر کے کلرک کو جانتا ہوں جو اپنی معاشی رام کہانی اس درد بھرے لہجے میں سناتا ہے کہ سننے والے کا دل پسیج جاتا ہے اور آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ وہ بے چارہ رقیب جیب کے کامیاب ناٹک کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا ہے اور اپنی جیب بغیر کسی حیل وحجت کے اُس کے سامنے ڈھیلی کر دیتا ہے۔ وہ فنکار اپنی کامیابی پر پھولے نہیں سماتا۔ کسی اچھے ریسٹورنٹ میں جا کر بہترین کھانا تناول فرماتے ہوئے اپنی کامیابی کا جشن مناتا ہے۔ مجھے وہ کلرک اسٹیج کے کسی ڈرامے کا ایسا کردار دکھائی دیتا ہے جو ہر وقت ہمارے درمیان موجود

ہوتا ہے۔ضرورت پڑنے پر اپنے اندر کا چہرہ اتنے اعتماد سے دکھاتا ہے کہ آپ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس سیلف ٹرینڈ کردار کے دامِ ضرورت میں با آسانی آجاتے ہیں اور اُس کی ضرورت کا لقمہ بن جاتے ہیں۔ اگر آپ غور سے جائزہ لیں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ اس جیسا پُر مغز کھیل دوستی کی آڑ میں آپ کے اردگرد مسلسل کھیلا جا رہا ہے اور آپ کی ہر اُس تربیت کو چیلنج کر رہا ہے جس پر آپ کو ناز ہے۔

بعض اوقات دیکھنے میں ایک معمولی سی چیز آپ کی ایسی تربیت اور راہنمائی کرتی ہے اور آپ کے اندر ایسی حیرت انگیز تبدیلی لاتی ہے جس کی آپ کو مطلقاً اُمید نہیں ہوتی۔ آپ امیر تیمور لنگ ہی کو دیکھ لیجیے جس نے ایک معمولی سی چیونٹی سے پیہم کوشش کا ایسا سبق سیکھا کہ شکست کو فتح میں تبدیل کر کے اُس چیونٹی کو عظیم کر دیا جس سے اُس نے راہنمائی حاصل کی تھی۔ اسی طرح طالب علمی کے زمانے میں جب میں دن کے ہنگاموں سے آزاد ہو کر رات کے پچھلے پہر نیند کے مزے لوٹ رہا ہوتا تھا تو پڑوس کا بیوی بچوں سے بے نیاز اصیل مُرغا جو شائد مُجھ سے کسی بات کا اُدھار کھائے ہوئے تھا وہ اپنی بے سُری بانگ کا جادو جگانا شروع کر دیتا۔ اس کی کڑک دار آواز ڈھلتی ہوئی رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی میرے کانوں کی حُسنِ سماعت سے اٹھکیلیاں کرنے لگتی۔ یوں میری نیند فوراً فو چکر ہو کر میری آنکھوں کے سحر سے آزاد ہو جاتی۔ کچھ دنوں تک مجھے مرغے کی اس نازیبا حرکت پر غصہ تو بہت آیا۔ لیکن جب میں نے غور کیا تو مجھے یہ اصیل مُرغا درویش صفت نظر آیا۔ جو شائد پڑوسی ہونے کے ناطے میری نیند کی کمزوری کے بارے میں پوری طرح باخبر تھا۔ وہ مجھے پڑھائی میں مُستعد رکھنے کے لیے شب کے اسرار و رموز سے آگاہی دلانا چاہتا تھا۔ تاکہ شب کی رومانوی ساعتوں میں میں ریاضی کے کورس میں شامل اُن تھیورمز اور سوالوں سے آنکھیں ملاؤں جو دن کی روشنی میں مجھے بلائنڈ رننگ کرتے تھے۔ یوں اس درویش صفت مُرغے کے طفیل لیلائے شب سے میری دوستی ہونے لگی۔ اُس کے اسرار و رموز سے آگاہی ہونے لگی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھ پر ذہنی رفعتوں کے راستے وا ہونے لگے۔ میں جونہی سوچ کی کیفیت سے گزرتا ریاضی کا ہر پیچیدہ تھیورم اور سوال میری گہری اور عقابی نظروں کی تاب نہ لا کر میرے سامنے

بے بس ہو جاتا اور اپنے پیچیدہ پن کا سراغ بتا دیتا۔ اس مُرغے نے تو اپنی الارمنگ آواز سے مجھے اپنا ہمنوا بنا لیا۔ میرے کان اس کی آواز کے منتظر رہنے لگے۔ جونہی اس کی آواز گہری شب کی خاموشی کو توڑتی ہوئی بلند ہوتی، نرم گداز بستر میرے لیے یکدم اجنبی بن جاتا۔ میں بستر سے دور اپنی سٹڈی میں مصروف ہو جاتا۔ اس طرح مجھے وقت کی اہمیت کا اندازہ ہوا جو اس سے پیشتر نہیں تھا۔ میرے اساتذہ اور کلاس فیلوز میرے اندر پیدا ہونے والی اس غیر معمولی تبدیلی اور صلاحیت کو دیکھ کر انگشت بدنداں ہو جاتے اور چہ مے گوئیوں میں گم ہو جاتے۔ اُن کو کیا معلوم تھا کہ اس چیز کا راز اُس باوصف مُرغے کے درویشانہ کردار میں چھپا ہوا تھا جس نے میری ذات کی اکائی کو گم ہونے نہیں دیا۔ اس لیے میں اُس درویش باوصف مُرغے کے درویشانہ کردار میں چھپا ہوا تھا جس نے میری ذات کی اکائی کو گم ہونے نہیں دیا۔ اس لیے میں اُس درویش صفت مُرغے کا انتہائی ممنوں ہوں جس نے ایک راہنما اور محسن بن کر میری ایسی تربیت کی اور اُس آگاہی سے نوازا جس کا مجھے اس سے پہلے ادراک نہیں تھا۔ جب میں اس مُرغے سے ہٹ کر اپنے اردگرد لوگوں کی طرف نظر دوڑاتا ہوں تو مجھے کوئی بھی اس مُرغے جیسا صاحب کردار نظر نہیں آتا۔ جو دردمندوں کے ساتھ دوسروں کے مسائل سے واقفیت رکھتا ہو۔ وہ اُن مسائل کے سامنے نپولین بوناپارٹ بن کر کھڑا ہو جائے اور اُنھیں شکست دے دے۔ اس روشن ضمیر مُرغے کی بے مثال تربیت نے وقت کی اہمیت کو میری ذات کا ایسا جزوِلاینفک بنا دیا کہ میں آفس سمیت ہر اُس تقریب میں مقررہ وقت پر موجود دکھائی دیتا ہوں جہاں میں مدعُو ہوتا ہوں۔ بلکہ بعض اوقات تو بڑے بڑے ہوٹلوں میں منعقد ہونے والی شادی وغیرہ کی تقاریب میں سب سے پہلے پہنچ کر میزبانِ تقریب کا بہ نفسِ نفیس یوں استقبال کرتا ہوں جیسے میں خود اس تقریب کا میزبان خصوصی ہوں۔

جب میں برصغیر کے ایک صدی قبل کے معاشرے کے کلچر پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے وہ نوابین یاد آجاتے ہیں جو اپنے نوابزادوں کو مجلسی آداب سیکھنے اور اُن کی تربیت کے لیے طوائفوں کے کوٹھوں پر بھیجا کرتے تھے۔ کیونکہ اُس دور کی طوائفیں رقص و موسیقی کے علاوہ کلاسیکل شاعری سے

بھی شغف رکھتی تھیں اور اُس کے دور کے معاشرتی رکھ رکھاؤ سے مکمل آگاہی رکھتی تھیں۔ مرزا ہادی رُسوا کے ناول ''اُمراؤ جان ادا'' میں اُس دور کی جھلک بخوبی دکھائی دیتی ہے۔ اُس دور کے بگڑے ہوئے نوابزادے بٹیر بازی اور بٹیر لڑوانے میں کافی شغف رکھتے تھے۔ اُن بٹیروں کو شیر کوہ، شیر افگن جیسے نام دیئے جاتے تھے۔ اُن کو ایسی خوراک اور میوہ جات کھلائے جاتے تھے جو آج کل عام آدمی کی دسترس سے باہر ہیں۔ اُن کو اکھاڑے میں لانے کے لیے بڑے چاؤ چونچلوں سے خاص تربیت دی جاتی تھی اور دنگل والے روز ایسے جشن کا سماں پیدا کیا جاتا تھا جس طرح کا سماں رومن تہذیب کے دور میں شیر کے آگے کسی مجرم کو ڈالتے وقت پیدا کیا جاتا تھا۔ نوابزادے کے بٹیر کے جیتتے ہی مٹھائی اور خاص پکوان کا بندوبست کیا جاتا تھا۔ اسی طرح دیہاتی کلچر میں مُرغے لڑوانے اور کتے لڑوانے کا چلن عام ہے۔ دنگل کے لیے خاص اہتمام کیا جاتا ہے اور اُس کی منادی کروائی جاتی ہے۔ پھر دنگل میں بڑے غرور اور چاؤ کے ساتھ اپنے تربیت یافتہ پلے ہوئے اور سدھائے ہوئے پٹھے آمنے سامنے لائے جاتے ہیں۔ دنگل شروع ہوتے ہی اپنے پٹھوں کو بیک اپ کیا جاتا ہے۔ اُن کے لڑنے کا تماشا بڑی دلچسپی اور انہماک سے دیکھا جاتا ہے۔ اپنے اُلقابی شیروں کی بڑے جوش وخروش سے حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور اُن کو داد دی جاتی ہے۔ کبوتر بازی بھی ایسا گھمبیر مشق شوق ہے جس نے ایک عرصے تک شوقین مزاج عام آدمی سے لے کر نوابزادوں تک کو اپنا غلام اور متوالا بنائے رکھا۔ اس شوق نے محبوب تک پیغام رسانی کے لیے نامہ بری کا راستہ بھی ڈھونڈ نکالا۔ سدھائے ہوئے کبوتر دلِ زار کی کیفیت محبوب تک پہنچانے لگے یوں عشق کی گرمئی بازار میں رقعہ بازی کو خاصا فروغ ملا۔ عطر کی خوشبو میں ڈوبے ہوئے رقعے عشق کی سچائی کی گواہی دینے لگے۔ بدلتی ہوئی ٹکنالوجی کے بانکپن نے جب بھرپور انگڑائی لی تو موبائل فون اور کمپیوٹر نے یہ کام چیٹنگ کے ذریعے سنبھال لیا۔ یوں مرضِ عشق کا علاج ٹیلی ملاقاتوں کے ذریعے ہونے لگا۔ اس سولو ٹریننگ نے شادی بیاہ کے معاملے میں والدین کی مشکلات کو اتنا آسان کر دیا کہ ان کا کام صرف اپنی منہ دکھائی تک رہ گیا۔

انسان کی سب سے پہلی ایجاد پہیہ جب منظر عام پر آیا تو اُس نے اپنا جادو جگایا۔ اُس نے آئندہ کے لیے غور وفکر اور تربیت کے دروازے کھول دیے۔ یوں پہیہ نت نئی شکلوں میں ترقی کے منازل طے کرتا رہا۔ اس وسیلے سے نئی نئی ٹکنالوجیاں وجود میں آتی رہیں اور انسانی سوچ کے دائرے وسیع کرتی رہیں۔ تربیت نے زندگی کے گھٹاٹوپ اندھیروں کو روشنی کے اُجالوں میں بدل دیا۔ فضاؤں کی وسعتوں کا سینہ چیر کر انسان کو اُڑنا اور سمندر کے کشادہ سینے کو چیر کر غوطہ زن ہونا سکھایا۔ یہ تربیت ہی کا اعجاز ہے کہ انسان کی زندگی کے ڈھب کے ساتھ رہن سہن بھی بدل گیا۔ ایجادات نے اپنا کام کر دکھایا۔ اُن کے منظر عام پر آتے ہی تربیت نے اُس کام کو بڑی خوش اسلوبی سے آگے پھیلا کر بنی نوع انسان کی خدمت کرنی شروع کر دی اور انسان کی زندگی کو سختیوں سے نجات دلا کر سہل بنا دیا۔ تربیت ایسی چیز ہے جو آپ کو کبھی نچلا نہیں بیٹھنے دیتی۔ یہ آپ کو کچھ نہ کچھ کرنے کے لیے تڑپاتی رہتی ہے اور آپ کو مہذب بنانے کے لیے کمربستہ رہتی ہے۔ جیسے ایک ٹرینڈ خاندانی حجام آپ کے سر کے بے ترتیب اور بے ہنگم بالوں کو خوبصورتی سے تراش کر آپ کی شخصیت میں پُر وقار تبدیلی لے آتا ہے۔ یہ تبدیلی آتے ہی آپ رومانٹک موڈ میں آجاتے ہیں۔ باہر کے رومان پرور مناظر آپ کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے آپ کی طرف لپکتے ہیں اور آپ کو اپنا ہمنوا بنانے کے لیے آپ کے ہم سفر ہو جاتے ہیں۔ آپ اِن رومان پرور مناظر سے اپنا دل بہلاتے ہوئے سیٹیاں بجاتے ہوئے خراماں خراماں اپنے گھر کا راستہ ناپتے ہیں۔

تربیت جہاں انسان کے گنوار پن اور جاہل پن کے میل کو اتارتی ہے وہاں وہ جانوروں کو بھی سدھا کر انسان کی غلامی میں لے آتی ہے۔ گلی، محلے میں بندر کا تماشا ہو یا سرکس میں شیر کا کرتب یہ سب تربیت کا اعجاز ہے جس کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ اس معاملے میں آج کے زمانے کے تربیت یافتہ وفادار جاسوس کتے کسی طور کسی تربیت یافتہ انسان سے کم نہیں ہیں جو چھپے ہوئے دشمن اور مجرموں کو اُن کی بُو سونگھتے ہی تلاش کر لیتے ہیں۔

کچھ سیکھنا ضرورت کی پہچان ہے۔ میں کسی بچے کو اسکول اور کتابوں سے بے نیاز کسی موثر

مکینک کی دوکان پر کام سیکھتے ہوئے اور اُستاد سے تربیت لیتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ معاشی ضرورت نے اس بچے کو یہاں کا راستہ دکھایا ہے۔ وقت کی روانی کے ساتھ اس بچے کی تیکنیکی مہارت آپ کی ضرورت بن جاتی ہے۔ یہ بچہ آپ کی گاڑی میں موجود خرابی کا بڑی تیکنیکی مہارت سے جائزہ لیتا ہے اور ایک کامیاب سرجن کی طرح اس کا آپریشن کرتے ہوئے دُرست حالت میں لے آتا ہے۔ آپ استعجاب وخوشی کی حالت میں اس مکینک بچے کی عمر کا جائزہ لیتے ہوئے اُس کو ٹپ سے نواز دیتے ہیں۔ یہ بچہ زندگی کے نشیب وفراز سے گزرتا ہوا جوانی کے سبزہ زاروں میں قدم رکھتا ہے تو اپنے کام میں گرو اور اُستاد ہوتا ہے۔ نئے آنے والے چھوٹے بچے اس کی شاگردی میں کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تربیت کی یہ مائیکرو لیول کی ایسی معاشی تصویر ہے جسے آپ روزانہ اپنے اردگرد دیکھتے ہیں اور اس سے آنکھیں نہیں چُرا سکتے۔

آپ فنونِ لطیفہ سے دل بہلانا چاہیں یا کسی اور شعبہ میں اپنی ہمت واستعداد کی جولانیاں دکھانا چاہیں تربیت قدم قدم پر آپ کی راہنمائی کرنے کے لیے آپ کی منتظر رہتی ہے۔ آپ اُس سے راہِ فرار اختیار نہیں کر سکتے۔ جونہی آپ اس کے نزدیک آتے ہیں یہ آپ کو خوش آمدید کہتی ہے اور اپنا ہمنوا بنا لیتی ہے۔ آپ اس کے جتنا قریب ہونے کی کوشش کرتے ہیں یہ اُتنا ہی آپ کے قلب وذہن میں جگہ بناتی ہے۔ یہ آپ کو حاضر دماغ اور مستعد دیکھنا چاہتی ہے۔ اسی لیے آپ پر بھرپور نگاہ رکھتی ہے۔ اگر آپ اس سے منہ موڑنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ بھی اجنبی بن کر آپ سے دور ہو جاتی ہے۔ اس کے بنا تو آپ اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہتے ہیں اور زمانے کے سنگ چلنے کی بجائے پیچھے کی طرف چلنا شروع کر دیتے ہیں۔ جن لوگوں یا قوموں نے اس کا اہتمام کیا اور اس کا ساتھ نبھایا وہ آج ہر جگہ اپنے برینڈ نام کے ساتھ پہچانی جاتی ہیں اور پذیرائی کا شرف حاصل کرتی ہیں۔

تربیت کا ہر دور اور ہر تہذیب میں اپنا مزاج اور ڈھنگ رہا ہے۔ ایک زمانے میں گھڑسواری، نیزہ بازی، شمشیرزنی کی تربیت اور اس میں کمال ومہارت اُس دور کی ضرورت اور

بہادری کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ دوشیزائیں ایسے بہادروں کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتی تھیں اور اپنا دل اُن کے لیے فرشِ راہ رکھتی تھیں۔ تربیت ہر معاشرے کے بدلتے ہوئے مزاج اور سوچ کے سنگ اپنا راستہ خود متعین کر لیتی ہے۔ اس بہانے وہ نئی ٹکنالوجی اور فیشن کو متعارف کرواتی ہے۔ یوں وہ ہر شخص کو ترقی یافتہ دائرے میں مہذب اور جاذبِ نظر دیکھنا پسند کرتی ہے۔ خواتین اس معاملے میں دو قدم آگے رہتی ہیں۔ ہر نئے فیشن کی خوشبو کے پیچھے اس طرح سرگرداں رہتی ہیں جیسے پھولوں کے پیچھے شہد کی مکھی۔ اسی وجہ سے فیشن ڈیزائننگ اور بیوٹی سے متعلق کورسز اور پارلرز خواتین کو فیشن میں اِن کرنے کے لیے اپنے دام میں لگائے رکھتے ہیں۔ خواتین بدلتے ہوئے فیشن میں اِن کرنے کے چکر میں اپنے مجازی خدا کی جیب سے کھیلنے کے لیے اپنی اداؤں کی جادوگری کا حربہ بڑی خوبصورتی سے آزماتی ہیں۔ یہ وہ کارگر حربہ ہے جو ہر گھر میں بطورِ خاص دیکھا جا سکتا ہے۔

انسان اپنی صحبت سے پہچانا جاتا ہے۔ اچھی صحبت گمراہیوں کے اندھیروں سے بچاتی ہے اور اُجالوں کی طرف لے جاتی ہے۔ نیک اور پارسا بزرگوں کی صحبت کا جامِ شیریں پیتے ہی آپ کی بند آنکھیں خود بخود کھلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ آپ کی ایسی روحانی تربیت شروع ہو جاتی ہے جس کے تسلسل سے آپ کے باطن کا میل خود بخود صاف ہوتا چلا جاتا ہے۔ آپ کو اپنے اردگرد کے وہ مظاہر نظر آنے لگتے ہیں جو اس سے پیشتر آپ کی نظروں سے اوجھل تھے۔ اس تربیت کی موجودگی میں آپ کے وجود میں موجود تراشے ہوئے بُت آہستہ آہستہ گرنا شروع ہو جاتے ہیں اور ایک نئی عمارت وجود میں آنے لگتی ہے۔ جس کے اندر داخل ہوتے ہی آپ کو اپنی ذات کی نفی محسوس ہونے لگتی ہے۔ اس دنیا میں جتنے بھی پیغمبر آئے وہ اپنی بگڑی ہوئی قوم کی رُشد و ہدایت اور تربیت کے لیے آئے اور اللہ کا پیغام اپنی قوم تک پہنچا کر رخصت ہو گئے۔ جن لوگوں نے ان کی بات سننے سے انکار کیا وہ طوفانِ نوح جیسے عذاب سے دوچار ہوئے۔

میں روزانہ اپنے اردگرد دوڑتی بھاگتی اور شور مچاتی ہوئی زندگی کے چلن میں لوگوں کی حرکات وسکنات اور ٹریفک سگنلز کی خلاف ورزی سمیت لوگوں کی نفسیات کا جائزہ لیتا ہوں تو مجھے ہر شخص

جلدی میں دکھائی دیتا ہے۔ گویا نظم وضبط اور تحمل سے چلنا اس کے مزاج اور دستور میں شامل نہیں ہے۔ شائد اس کے مزاج کو تربیت سے شناسائی نہیں ہو سکی۔ جس کی وجہ سے وہ اُس سسٹم کے لیے اجنبی دکھائی دیتا ہے جو اس کو رکنے کا اشارہ کرتا ہے۔ جب میں اپنے آپ کو ٹٹولتا ہوں تو مجھ پر عیاں ہوتا ہے کہ بعض اوقات میں بھی نہ چاہتے ہوئے اُصول و ضوابط سے فرار اختیار کرتا ہوں اور اُس معاشرتی کلچر کا حصہ بن جاتا ہوں جس میں میری زندگی کے لیل و نہار بسر ہو رہے ہیں۔

اس موقع پر مجھے اپنا بچپن یاد آ جاتا ہے۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر جب کھانا تناول فرمانے کا اعلان ہوتا تھا تو ایکدم بھگدڑ مچ جاتی تھی۔ ہر شخص اپنے اسٹیٹس سے بے نیاز اس بھگدڑ میں شامل ہو جاتا تھا۔ میں جب ڈشوں تک پہنچتا تو خالی ڈشیں میرا منہ چڑا رہی ہوتی تھیں۔ نتیجہ میں گھر آ کر کھانا کھاتا تھا۔ گزرتے ہوئے وقت نے مجھے تربیت کے ایسے چینل سے گزارا ہے کہ اب تو میں ایسی ضیافتوں میں آگے آگے دکھائی دیتا ہوں اور اپنا راستہ خود بناتا ہوں۔ چکن کی نہایت ہنر مندی اور مُستعدی سے لیگ پلنگ کرتے ہوئے لطف اُٹھاتا ہوں۔ رقیب مجھے یوں گھورتے ہیں جیسے میں پیشہ ور اور تربیت یافتہ لیگ پکڑ ہوں اور اُن کو حقِ لیگ پلنگ سے محروم کر رہا ہوں۔ ویسے بھی لیگ پلنگ کرنا ہمارا سماجی اور معاشرتی مشغلہ ہے اور ہمارے تشخص کا ایک حصہ ہے جس کا مظاہرہ میں اکثر اپنے گردوپیش دیکھتا رہتا ہوں۔ لیگ پلنگ اتنی ہوشیاری اور مہارت سے کی جاتی ہے کہ آپ کو محسوس تک نہیں ہوتا کہ لیگ پلنگ کرنے والا آپ کا اپنا دوست ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ "دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا"

تربیت نظم و نسق اور سلیقہ سکھاتی ہے۔ جب میں کائنات کی وسعتوں کی طرف نظر ڈالتا ہوں تو مجھے کائنات کا سارا نظام ایک ترتیب سے تربیت کے دائرے میں گردش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ قدرت کے وسیع و عریض نظام میں ہر ذرہ اُس کی حکمتِ عملی کے تحت خاموشی سے اپنے فرائض اس حُسنِ اُسلوب سے انجام دے رہا ہے کہ عقل انگشت بدنداں رہ جاتی ہے۔

تربیت تو انسان کو دُلہا بنا کر چاند پر لے گئی جب میں جب چاند کی طرف دیکھتا ہوں تو مجھے

اُس پر ترس آتا ہے۔ اُس کے حُسن کا صدیوں سے پوشیدہ راز انسان کے ہاتھوں ایسا فاش ہوا کہ اب وہ انسان کو اپنا منہ دکھاتے ہوئے شرماتا ہے۔ دوسرے سیارے بھی انسان سے چھپتے پھرتے ہیں کہ وہ کہیں اُس کی تربیت یافتہ دوربین نگاہوں کی زد میں نہ آجائیں۔ یوں اُن کی حقیقت کا راز چوری ہو جائے۔ تربیت ہر وقت حالتِ سفر میں رہتی ہے۔ یہی منتہائے تربیت ہے۔ اسی میں انسان کی عظمت کا راز مُضمر ہے۔ میں اپنے گھر کی اُس چڑیا کا ممنون ہوں جس نے اپنے بچے کے ساتھ مجھے بھی زندگی کی فضاؤں میں کامیاب پرواز کے لیے مسلسل کوشش کی تربیت دی۔

افسانہ

احمد اعجاز الدین رحمت علی ماریشس (بحرِ ہند)

جواری بابو

وہ شبانہ روز گھر پر لعن طعن سنتا لیکن اپنی لت سے کبھی باز آیا تھا نہ کبھی اس سے باز آنے کا ارادہ کیا تھا اور نہ کبھی ماں کی باتوں کا اُس پر کوئی اثر پڑا تھا ماں نے بارہا اُس سے کہا تھا "بیٹا تاش کھیلنا چھوڑ دے۔ اس گھر میں ہرگز برکت نہ آئے گی۔ خدا کے عذاب سے ڈر! سارا دن گاؤں کے لفنگوں کے ساتھ جُوا کھیلنے کے بجائے کھیت میں کچھ محنت مشقت کرتا تو آج ہمیں یہ بُرا دن دیکھنا نہ پڑتا۔"

وہ گھر کا اتنا ہی کام کرتا تھا جتنا کہ گھر والوں کے صبر کا پیمانہ لبریز نہ ہو جاتا یعنی کہ دو وقت کا کھانا کھاتے وقت کوئی اُسے لعنت ملامت نہ کرتا تھا اور اسے اس بات کی بڑی تسلی تھی کہ کوئی اُسے یہ نہ کہتا تھا کہ وہ مفت کی روٹی توڑتا ہے۔ طویلے میں جو گائے تھی اس کی دیکھ ریکھ اُسی کی ذمہ داری تھی۔ ابھی اُس نے طویلہ صاف کیا، جانور کو چارہ دیا اور دودھ دوہنے کے بعد چائے کا آخری گھونٹ بھی حلق سے نہیں اُتارا تھا کہ اُسے اپنے پاجامہ میں تاش کا پلندا چھونے کا عجیب و غریب اشتیاق ہوتا۔ گویا تاش کی پتیوں کے لمس سے ہی اُسے ایک حیرت انگیز قسم کا سرور محسوس ہوا تھا۔ کیفیت وہی تھی جو کسی شرابی کو شراب کو بوتل چھو کر ہوتی ہے۔ ماں سے نظریں بچا کر تاش کا پلندا اس طرح پاجامے کے اندر چھپا دیتا کہ عقاب کی آنکھ بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

اِدھر ماں گھر کے کام کاج میں منہمک ہوتی کہ اُدھر وہ گھر سے غائب ہو جاتا۔ دن ڈھلنے تک وہ گاؤں کے پرے سرسوں کے کھیت میں ایک سایہ دار کافور کے درخت کے نیچے دیگر اوباش نوجوانوں کے ساتھ تاش کھیلنے میں وقت گزار دیتا تھا۔ غروبِ آفتاب کے بعد کافور کے درخت پر کوئی فانوس جلا دیتا یا کوئی اس کا کھانا وہیں لے آتا تو شاید وہ شام کو بھی گھر نہ جاتا۔ لیکن سُرمگیں

شام میں جب تاش کی پتیوں کا اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا تو جواریوں کو مجبوراً اپنا کھیل ختم کرنا پڑتا۔
گھر پہنچتے ہی اُسے ماں کی جلی کٹی سننا پڑتی۔ دل میں یہ خدشہ ضرور ہوتا تھا کہ کہیں کسی روز باپ بھی طیش میں آکر برملا اُس کی خبر نہ لے لے۔ سارا دن کھیت میں تھک ہار کر باپ کھٹیا پر پڑا رہتا تھا اور سارا کچھ سنتا رہتا تھا۔ ماں کو بھی اس بات کا خوف تھا کہ کہیں اس کا شوہر جوان بیٹے کو اِدھر اُدھر کچھ نہ کہہ دے جس کی وجہ سے وہ زیادہ بگڑ جائے۔ دراصل ماں کی تُرش روئی میں اُس کی ممتا اور محبت ہی پوشیدہ تھی کیونکہ غصہ اُتارنے کے فوراً ہی بعد پل باورچی خانہ میں رُوکھا سُوکھا جو ہوتا تھا وہ بیٹے کے لیے لگا دیتی تھی۔ انڈے کے شہزادے کی طرح جو کچھ اُسے دیا جاتا اُسے نعمت مترکہ سمجھ کر کھاتا اور چپکے سے کھاٹ پر دراز ہو جاتا تھا۔ پھر ٹکٹکی باندھے کچے مکان کی گھاس پھوس والی چھت میں پتہ نہیں کیا دیکھتا تھا۔ ہاں! اس دوران وہ یہ ضرور سوچتا کہ اگلے روز کیسے مدن، سوہن، گوپال، فرید اور مناف کو تاش میں ہرا سکے گا۔ کچھ دنوں سے پتہ نہیں کیوں وہ مدن کی باتوں کو بار بار سوچنے لگا تھا۔ جب وہ نیند کی آغوش میں چلا جاتا تو خواب میں بھی اُسے وہی باتیں نظر آتی تھیں۔ اُسے سمندر کی موجیں پار کرتے ہوئے بڑے بڑے بحری جہاز نظر آتے تھے۔ اُسے ایسا لگتا تھا اُن بحری جہازوں میں سے کسی ایک پر وہ بھی سوار ہے اور کسی انجانی منزل کی طرف موجوں کے تھپیڑوں کو چیرتا ہوا اُس کا جہاز آگے بڑھ رہا ہے۔
طلوع آفتاب سے قبل گھر کی کھٹ پٹ سے وہ جاگ جاتا۔ اگر کبھی باپ اُسے گاؤں کے کنویں سے پانی لانے کے لیے یا کھیت میں اُس کی مدد کے لیے کہتا تو وہ کبھی انکار نہیں کرتا۔ طوعاً و کرہاً وہ حکم کی تعمیل کرتا۔ باپ بیٹے کے نحیف جسم کو دیکھتا تو اُس کا دل پسیج جاتا۔ اسی لیے وہ بیٹے کو کھیت پر اپنے ساتھ لے جانے کے لیے زیادہ اصرار نہیں کرتا تھا اور نہ اُس کی کوتاہیوں کو گنواتا۔ تاش کی بازی کے دوران بابو کھلاڑیوں کے درمیان خاموشی کو بہت پسند کرتا تھا۔ اس خاموشی سے ہی اندازہ لگانا آسان تھا کہ ان جواریوں کی ایک الگ دنیا تھی جس میں تاش کے اصول اور اُس کی دغابازیوں سے واقف ہونا ضروری تھا اور جوان باتوں کا علم رکھتا تھا نیز جس پر تقدیر مہربان ہوتی وہی بازی لے جاتا۔

بازی لے جانے والے کو چار پانچ آنے مل جاتے تھے۔ کبھی شام تک بابو کو تاش میں ایک دو روپے مل جاتے تو کبھی دو ایک روپے وہ گنوا بھی دیتا تھا۔ اس طرح ایک سال کی مدت میں بابو کے پاس چھ روپے جمع ہو گئے تھے۔ انیس سال کا بابو کبھی اپنے گاؤں سے باہر نہیں گیا تھا۔ گاؤں والے اُسے گھر والوں کی طرح پیار سے بابو ہی بلاتے تھے اور سب اُسے مذاقاً جواری بابو کہتے تھے لیکن وہ بُرا نہیں مانتا تھا۔ اُس پر ایک دُھن سوار تھی۔ وہ کالا پانی دیکھنا چاہتا تھا۔ اُس نے شہریں اور ندیاں دیکھی تھیں لیکن سمندر نہیں دیکھا تھا۔ اُس نے مدن اور گوپال سے سُنا تھا کہ چھپرا، آرا، بلیا اور مظفر پور گاؤں سے کچھ لوگ کالا پانی پار کر کے دُور کہیں کسی دوسرے مُلک میں کام کرنے گئے ہیں جہاں گنے کے کھیتوں میں پتھر سے سونے کے سکے نکلتے ہیں۔ ابھی چند روز قبل مدن اُس سے کافور کے درخت کے نیچے بیٹھے بیٹھے کہہ رہا تھا کہ اُس کے ماموں زاد بھائی مگدھ سے کلکتہ اپنے کسی رشتہ دار کے یہاں گیا تھا جہاں اُس نے بندرگاہ پر اتنا بڑا دخانی جہاز دیکھا جو اُن کے کھیت سے بھی بڑا تھا۔ اُن جہازوں پر شکر کی بوریاں لادی جا رہی تھیں۔ وہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ انگریزوں کے جہاز پر کام کرنے والے لوگوں کو اچھی اُجرت ملتی ہے۔ جب سے بابو نے مدن کی یہ باتیں سنی تھیں تب سے گویا اُس کے دماغ میں کلکتہ کی بندرگاہ کا منظر پھر رہا تھا۔ اُس کو اس بات کا علم تھا کہ اُس کے والدین کبھی بھی اُس کو کلکتہ جانے کی اجازت نہیں دیں گے کیونکہ شہر کی چمک دمک نے بہتوں کو اپنی جڑوں سے دور تو کیا ہی تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ اُن کو اتنا مادہ پرست بنا دیا تھا کہ اُن کی نظروں میں پیسہ اور دولت ہی سب کچھ تھا۔ پھر اُن کی اپنی ضعیف الاعتقادی بھی تو تھی۔ کالا پانی پار کرنے کا مطلب برادری اور ذات پات سے الگ ہو جانا سمجھا جاتا۔ اگر چہ بابو کے والدین کو یہ خطرہ لاحق نہیں تھا لیکن اُنہیں یہ خدشہ ضرور ہو سکتا تھا کہ وہ شہر کے دوسرے لچّوں سے دوستی کر سکتا تھا اور جوے کے علاوہ وہ دوسرے بُرے کاموں میں ملوث ہو سکتا تھا بابو یہ سب باتیں خود اپنے گریبان میں جھانک کر سوچ رہا تھا جس کے نتیجے میں اُس نے تہیہ کر لیا کہ کلکتہ جانے کے لیے گھر والوں سے اجازت مانگنا فضول تھا۔ شاید اسی انجانے خطرے کے پیشِ نظر باپ بیٹے کی آوارگی اور کج روی کو نظر انداز کر دیتا اور ماں کی ذات میں بھی محبت اور شفقت پوشیدہ تھی۔

آج رات بستر پر لیٹے لیٹے جب وہ چھت کی جانب دیکھ رہا تھا تو وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اسے کچھ روپے مل جاتے تو وہ اسی ہفتہ کلکتہ کے لیے بھاگ نکلتا۔ اُسے راستہ معلوم نہیں تھا لیکن وہ اتنا دلیر ضرور تھا کہ وہ اپنے شعور کی اس للکار کو تسلیم کرنے کے لیے تیار تھا۔ وہ دل ہی دل میں اس بات پر کڑھنے لگا تھا کہ کب تک اس کے گھر والے فلاکت زدگی کی زندگی گزاریں گے۔ ماں کے پاس صرف دو لہنگے تھے۔ ایک دھوتی تھی ایک پہنتی تھی۔ باپ کے پاؤں میں تو اب تک چپل تھی نہ جوتے۔ کھانے میں روزانہ وہی چاول اور دہی یا چپاتی اور پیاز۔ کبھی کبھار سالن سبزی نصیب ہوتی تو وہ دن عید سے کم نہیں سمجھا جاتا۔ اگر گاؤں میں کسی کے یہاں شادی کے موقع پر کھانے کی دعوت ہوتی تو اُس دن کا بے صبری سے انتظار کیا جاتا۔ غریبی ایک بڑی لعنت ہے جس کی زد میں مظفر نگر کے کم و بیش سبھی لوگ زندگی بسر کر رہے تھے۔ اُس سے نجات حاصل کرنے کے لیے بابو کے سامنے ایک ہی راستہ تھا اور وہ تھا کالا پانی۔

ایک دن جب ماں بستر اُٹھا رہی تھی تو بابو کو اُس کے نیچے کچھ روپے نظر آئے تھے۔ اُس کے دماغ میں جیسے بجلی سی کوند گئی تھی۔ اُس کو لگا کہ اگر یہ پیسے صاف کر لیے جاتے تو اُس کا خواب حقیقت میں تبدیل ہو جاتا۔ لیکن اگلے ہی پل اُس نے یہ خیال اپنے دماغ سے جھٹک دیا کیونکہ وہ اپنے والد کے مزاج سے واقف تھا۔ وہ یہ بخوبی جانتا تھا کہ اُس کے والد اُسے چوری کے لیے معاف نہیں کریں گے۔ آج شام کو کھانا کھاتے وقت وہ اپنی ماں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ ماں کو لگا تھا جیسے بیٹا اُس سے کچھ کہنا چاہتا ہو لیکن اُس نے بھی کچھ نہیں کہا۔ شاید اسی وجہ سے کہ اُسے بابو پر بہت غصہ آ رہا تھا کیونکہ آج بھی وہ سارا دن گھر سے باہر ہی رہا۔ بابو کو پتہ نہیں کیوں آج ارہر کی دال اور چپاتی میں کوئی عجیب و غریب ذائقہ معلوم ہو رہا تھا اور اس کا دل کرتا تھا کہ وہ کھاتا جائے لیکن پھر خیال آیا کہ اُس کے حصہ میں جو تین چپاتیاں تھیں اُس نے تو وہ سب نگل لی تھیں۔ کھانے کے بعد وہ اپنے باپ سے معلوم کرنے گیا کہ کیا کھیت میں کوئی ایسا کام تھا جو وہ کر سکتا تھا۔ اُس کے والد کو ذرا تعجب تو ہوا کیونکہ یہ خلافِ معمول حرکت تھی۔ ادریس میاں نے دل ہی دل میں سوچا کہ شاید

اب اُس کے بیٹے کے یہاں بلوغت آ گئی ہو گی اور اُنھوں نے بابو سے اگلے روز کھیت میں ہل چلانے کے لیے اُن کی مدد کی بات کی۔ بیٹا دراصل باپ کو آخری بار دیکھنے گیا تھا کیونکہ رات جب سبھی لوگ میٹھی نیند سو رہے تھے تو بابو نے چپکے سے دروازے کی کنڈی سرکائی اور وہ گھر سے کھسک گیا۔

رات تاریک تھی۔ آسمان پر تارے جگمگا رہے تھے۔ چاند کبھی بادلوں میں چھپ جاتا تو کبھی باہر آ جاتا جیسے اُس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ جب چاند بادلوں سے باہر آتا تو رات کی تاریکی ذرا کم ہو جاتی اور چاند کی مدھم روشنی میں گاؤں کا سکوت زیادہ دلفریب لگتا۔ وہ چلتا جا رہا تھا اور پیچھے مڑ مڑ کر دیکھ بھی رہا تھا۔ باز و کے کھیتوں سے ٹڈی کی آواز آ رہی تھی۔ دور سے کتّے کے بھونکنے کی آواز اُسے ستا رہی تھی کیونکہ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی مفرور قیدی ہے جس کے تعاقب میں پولیس اور کتّے تھے۔ جب چاند بادل میں چھپ جاتا تو اُس کے دل کی دھڑکنیں زیادہ تیز ہو جاتیں اور قدموں کی رفتار بڑھ جاتی۔ وہ سنسان سڑک پر چلتا جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ صبح ماں پر کیا گزرے گی جب وہ اُسے گھر میں نہیں پائے گی۔ وہ اپنے والد اور جواری دوستوں کے بارے میں زیادہ فکر مند نہیں تھا۔ وہ ماں کے لیے زیادہ پریشان تھا۔ ان ہی خیالوں میں وہ مستغرق تھا کہ دور ایک گاڑیبان کی لالٹین نظر آئی۔ اُسے بیل کے قدموں کی آہٹ کے ساتھ ساتھ بیل کے گلے میں بندھی ہوئی چھوٹی سی گھنٹی کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ اُسے اس بات کا خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں گاڑیبان اُس کے گاؤں ہی کا کوئی شخص تو نہیں۔ لہٰذا وہ جھاڑیوں میں چھپ گیا اور بیل گاڑی کو جانے دیا۔ اس طرح پوری رات وہ چلتا رہا اور چلتا رہا۔ اُس کے پاؤں دکھنے لگے تھے۔ تلوؤں میں آبلے بھی پڑنے لگے تھے۔ اس طرح اگلے روز وہ چھپتے چھپاتے چلتا جا رہا تھا۔ اگر اُسے کوئی خودرو قسم کا کوئی پھل ملتا تو وہ اُس سے اپنی پیاس اور بھوک دونوں کو بجھانے کی کوشش کرتا۔ وہ اپنے آپ کو نیم جان محسوس کرنے لگا تھا جب شام کے سرمئی افق میں اُسے دور کوئی جگمگاتی ہوئی جگہ نظر آئی جس کی وجہ سے اُس کی جان میں جان آ گئی۔ مسلسل دو ڈھائی گھنٹوں کے بعد جب وہ ٹامک ٹوئیاں کھاتے ہوئے اُس جگہ پہنچا تو وہ نڈھال ہو چکا تھا۔ لیکن اتنی تسلی ضرور تھی

کہ کم سے کم یہاں اُسے کھانے کے لیے کچھ مل سکتا تھا۔ کسی دکان کے سامنے کچھ خستہ حال لوگ بیٹھے تھے۔ وہ بھی اُن کے ساتھ بیٹھ گیا اور بازو میں بیٹھے فقیر سے معلوم کیا کہ یہ جگہ کون سی ہے۔ جواب ملنے پر اُسے اندازہ ہوا کہ کلکتہ کے بجائے وہ بنارس کے مضافات میں پہنچ گیا تھا۔ وہ ابھی قرب و جوار کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ کسی نے اُس کے ہاتھ میں دو روٹیاں تھما دیں۔ شاید خدا کا کوئی نیک بندہ ڈھابے کے مالک کو غریبوں کو کھانا کھلانے کے لیے کہہ گیا تھا اور پیسہ بھی دے گیا ہوگا۔ بابو کو بنارس کے بارے میں گوپال نے بھی بتایا تھا کہ یہ شہر اُن کے لیے بڑی مقدس جگہ ہے اور جہاں کم سے کم ہر ہندو اپنی زندگی میں ایک بار آنے کا ارادہ کرتا ہے۔ ادھر اُدھر نظر دوڑانے سے اُسے اندازہ ہوا کہ مقامی لوگوں کے مقابلے میں دوسرے شہر کے لوگ بھی یہاں اچھی خاصی تعداد میں آئے ہوئے تھے۔ اُسے فوراً خیال آیا کہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے لوگ یہاں تیرتھ کے لیے آئے ہوں گے۔ شکم سیر ہونے کے بعد بابو کو خیال آیا کہ کلکتہ جانے کے لیے اُس نے الٹا راستہ لے لیا اور وہ بلاواسطہ طریقہ سے یہاں پہنچ گیا تھا۔ ادھر اُدھر ٹہلنے کے بعد اُسے کسی مندر کے صحن میں کچھ ناگا سادھو فرش پر پڑے گانجا پیتے ہوئے دکھائی دیے۔ بابو سکتے سکتے ان ہی کی طرح مندر کے صحن میں لیٹ گیا۔ تکان سے اُس کا بدن چور چور ہو رہا تھا اور پاؤں میں بھی درد تھا۔ شاید بابو کو اس بات کا احساس نہیں تھا کہ پچھلے دو دنوں میں اُس نے کم و بیش سو کلومیٹر کی مسافت پیدل طے کی تھی۔ اس تکان کی وجہ سے اُسے جلد نیند آ گئی تھی۔ رات کو وہ نیند سے چونک کر جاگ اُٹھا تھا۔ اُسے لگا تھا جیسے اُس نے ماں کی میٹھی سرگوشی سُنی تھی اور جیسے وہ کہہ رہی تھیں کہ "بیٹا تو ہم سے کیوں روٹھ گیا ہے؟ گھر واپس آجا۔ اب میں تجھے کچھ نہیں کہوں گی۔ اگر سارا دن بھی تو تاش کھیلے گا تب بھی میں تجھے کچھ نہیں کہوں گی۔"

ماں کے یہ الفاظ جیسے اُس کے دل کو پاش پاش کر رہے تھے۔ وہ کچھ دیر کے لیے سوچنے لگا کہ کیا اسے گھر واپس لوٹ نہیں جانا چاہیے؟ لیکن اُسے پھر خیال آیا کہ گھر والوں کی نظر میں تو وہ پہلے ہی سے گرا ہوا تھا اب اس حرکت سے وہ اور زیادہ گر گیا تھا۔ اُسے بار بار اپنے دوستوں کا

خیال بھی ستا رہا تھا جن کے ساتھ وہ اپنی چھوٹی سی دنیا کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں بانٹتا تھا۔ کبھی کبھار اُن سے تُو تُو میں میں کی نوبت آجاتی تھی اور رنجشیں بھی ہو جاتی تھیں لیکن اگلے ہی روز تاش کی پتّیوں میں گویا ایسا جادو تھا جو سب کے دلوں کو دوبارہ جوڑ دیتا تھا۔ صبح مندر کی گھنٹیوں سے وہ جاگ اُٹھا تھا۔ مندر کی گھنٹیاں اس طرح سے بج رہی تھیں جیسے کبھی وہ رُکنے والی نہیں تھیں۔ دراصل تلسی مانس مندر کے علاوہ بنارس میں اس قسم کے متعدد مندر تھے اور صبح سبھی گھنٹیاں طلوعِ آفتاب کے وقت بجتی تھیں۔ بابو کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اُس نے مڑ کر اُس جانب دیکھا جس طرف سے وہ اس شہرِ نگاراں میں آیا تھا کہ آنسو کی دو بوندیں اُس کے سانولے رخسار پر لُوھک گئی تھیں۔ آنسو پونچھنے پر اُس کے سامنے مَل مَل اور ریشمی کپڑوں کی بڑی دکانیں تھیں۔ عطار اور دستکار بھی اپنی اپنی دکانیں کھول کر پرارتھنا اور پوجا پاٹھ میں لگے تھے۔

اس سے پہلے بابو نے اتنی بڑی دکانیں نہیں دیکھی تھیں۔ اُن کے گاؤں کے لوگوں کے مقابلے میں یہاں لوگ زیادہ خوش لباس تھے۔ چاروں طرف پھیری اور طرح طرح کی مٹھائیاں بیچنے والے موجود تھے۔ اس نے پہلی بار یہاں انگریز سپاہیوں کو دیکھا تھا۔ اُن کی پوشاک اور جوتے دیکھے۔ لیکن وہ ان چیزوں کے علاوہ انگریزوں کے رنگ روپ سے زیادہ متاثر تھا۔ اُس کے گاؤں میں تو اُسی کو خوبرو سمجھا جاتا تھا جس کی رنگت زیادہ گوری یا گندمی ہوتی تھی۔ لیکن یہ انگریز سب کے سب گورے تھے۔ کچھ کی آنکھیں نیلی تو کچھ کی بھوری تھیں بابو اُن کو دیکھ کر دل ہی دل میں سوچتا رہا کہ اتنے خوبصورت لوگ پھر ہمارے ملک کو کیوں ہڑپ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم لوگوں پر اتنا ظلم کیوں کرتے ہیں۔ فرنگیوں کی کلائیوں میں گھڑی دیکھ کر وہ مسکرایا اور دل ہی دل میں اُس نے سوچا کہ کیا انگریز مرد بھی چوڑیاں پہنتے ہیں ابھی بابو ان ہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ کوئی اُس سے مخاطب ہوا ''ابے شرم نہیں آتی۔ اتنا ہٹا کٹا نوجوان بھیک مانگتا ہے۔ محنت مزدوری کیوں نہیں کرتا؟ وہی تو کرنے آیا ہوں صاحب! بابو نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔ کیا کام کر سکتا ہے تو؟ ویسے تیرے حُلیے سے تو مجھے لگتا ہے کہ تو کسی اچھے گھر سے تعلق رکھتا ہے۔ تیری صحت بھی اچھی لگتی ہے، مجھے کلّن

کہتے ہیں۔ اگر تو واقعی کام کرنا چاہتا ہے تو جمعہ کے روز اسی وقت مجھ سے وہاں عالمگیری مسجد کے سامنے ملنا۔ جی! جی صاحب اور کلن وہاں سے چلا گیا۔ بابو ٹہلتے ٹہلتے گنگا ندی کے گھاٹ پر پہنچ گیا جہاں وہ بیٹھ کر ندی میں آتی جاتی کشتیوں کو دیکھنے لگا۔ بابو کو بہت بھوک لگ رہی تھی۔ اُس نے سوچا کہ بھیک بھی یہاں مل سکتی تھی لیکن اس ذلت سے بچنے کے لیے کھانا خریدنا بہتر تھا۔ اُس کی جیب میں تاش کے پلندے کے ساتھ وہ چھ روپے ابھی موجود تھے۔ قریب کسی پھیری والے سے اُس نے کچھ پکوڑے خرید لیے۔ ابھی اُس نے آلو کا پکوڑا منہ میں رکھا ہی تھا کہ اُسے لگا کہ کوئی اُسے دیکھ رہا ہے۔ پکوڑا چباتے ہوئے جب اُس نے نظر اٹھائی تو دوسری جانب ایک عورت اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بابو نے فوراً اپنی آنکھیں نیچی کر لیں لیکن اگلے ہی پل جب اُس نے تجسس میں نظر دوڑائی تو عورت نے اشارتاً اس سے کھانا طلب کیا۔ بابو نے اُسے اشاروں سے اپنی طرف بلایا اور کچھ پکوڑے اُس کے ہاتھ میں رکھ دیے۔ صاحب میں بُری عورت نہیں ہوں۔ دو دن سے میں نے کچھ نہیں کھایا۔ مجھے بہت بھوک لگی تھی۔ ایشور آپ کا بھلا کرے۔ بس آرام سے کھا۔ جب بابو نے اسے تسلی دے دی تو اُس نے اپنے چہرے سے ذرا سا گھونگٹ سرکایا۔ بابو نے اچھی طرح سے اُس کو دیکھا۔ ناک میں نتھنی تھی۔ اُس کی مانگ سے ایسا لگ رہا تھا جیسے سندور صاف کیا گیا تھا۔ ماتھے پر بھی لال بندی کا ہلکا نشان تھا۔ بابو کو فوراً اندازہ ہو گیا کہ یہ کوئی ہندو عورت تھی۔ نام معلوم کرنے پر اُسے یقین بھی ہو گیا کہ سُریکھا اُس کے مذہب کی نہیں تھی۔

اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد جب بابو نے سُریکھا سے معلوم کیا کہ وہ بنارس میں کیا کر رہی ہے تو اُس نے اپنے پیٹ کی ساری باتیں سنا دیں۔ سُریکھا مشکل سے اٹھارہ بیس سال کی ہوگی، لیکن اپنی عمر کے لحاظ سے زیادہ سیانی دکھتی تھی۔ وہ اس بات کے لیے راضی نہ تھی کہ شوہر کی لاش کے ساتھ ستی جیسی رسم کے لیے وہ بھی جل مرے۔ سُریکھا نے بابو سے کہا ”اب آپ ہی بتائیے کہ یہ دنیا جہان کا کیسا قانون ہے؟ میں تو اس شادی کے لیے راضی نہ تھی۔ لیکن میرے ماں باپ نے مجبوراً مجھے گاؤں کے دکاندار سے رشتۂ ازدواج میں جوڑ دیا۔ یہ اُس کی چوتھی شادی تھی۔ لیکن

بے بس لڑکی کا غریب اور مجبور سات لڑکیوں کا باپ پنساری کا مقروض ہو کر بھی کیا کر سکتا تھا؟
صاحب میں محنت مزدوری کروں گی لیکن اب کبھی اپنے گاؤں واپس نہ جاؤں گی اور زندگی کا مقابلہ اگر نہیں کر پائی تو ادھر ہی کسی کنویں میں یا گنگا میں اپنی جان دے دوں گی۔
میں بھی گھر سے بھاگ کر یہاں آیا ہوں۔ میں کلکتہ جانا چاہتا ہوں اور وہاں سے ماریچ۔
کہاں ہے یہ ماریچ صاحب؟ مجھے صاحب مت بُلا۔ میرا نام بابو ہے سب مجھے بابو بُلاتے ہیں۔ تو بھی مجھے بابو بُلا سکتی ہے۔ میں کلکتہ ہی کے قریب فُرفرا شریف گاؤں کی رہنے والی ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو آپ یہاں سے کلکتہ ریل گاڑی سے جا سکتے ہیں۔ میں کلکتہ سے اتفاقاً بنارس کی ریل گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔ یہ بات سنتے ہی بابو کے چہرے پر رونق آ گئی۔ اُس نے پاجامے کی جیب میں پیسے ٹٹولے۔ روپیہ اور تاش کا پلندا دونوں اپنی جگہ موجود تھے۔
نہیں بابو میں آپ کے ساتھ کلکتہ تک نہیں آ سکتی۔ اگر کسی نے مجھے وہاں دیکھ لیا تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔ بابو کو اس بات کا خوف تھا کہ انجانے شہر میں تنہا اُس کے راستے میں کئی رکاوٹیں ہو سکتی ہیں۔ اُس نے بہت اصرار کیا جس کے بعد سُریکھا نے اُس کے ساتھ جانے کی حامی بھر لی۔
ریل گاڑی دھواں سے ماحول کو آلودہ کرتی ہوئی اور سیٹی بجاتی ہوئی کلکتہ کے سٹیشن پر آ کر رُکی۔ دونوں بنارس سے دن میں چلے تھے اور کلکتہ رات میں پہنچے تھے۔ رات کے دو بج رہے تھے لیکن ریلوے سٹیشن پر لوگوں کا جمِ غفیر تھا۔ اس چہل پہل اور شور و غوغا میں بھی کچھ لوگ وہاں خراٹے لے رہے تھے سُریکھا کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ کوئی اُسے یہاں پہچان نہ لے۔ لہٰذا اُس نے دوپٹے سے اپنا چہرہ اچھی طرح ڈھک لیا۔ چونکہ ان کو معلوم نہیں تھا کہ جانا کہاں ہے اور کرنا کیا ہے۔ لہٰذا ریلوے سٹیشن پر ہی دوسرے مسافروں، فقیروں اور لاوارثوں کی طرح کسی کونے میں پیٹ میں پاؤں ڈالے بیٹھ گئے۔ ادھر اُدھر کی باتوں میں آنکھوں آنکھوں میں سحر ہو گئی۔
ابھی دن اچھی طرح سے چڑھا بھی نہیں تھا کہ ریلوے سٹیشن کے ایک کونے میں کچھ نوجوان فرش پر بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ بابو اپنی جگہ سے فوراً متحرک ہوا اور چشم زدن میں اُن کے پاس

پہنچ گیا۔ دو اُسی چابکدستی سے اس جانب پہنچ گیا تھا جیسے اپنی جبلت کے تحت کوئی جانور بغیر سوچے سمجھے کوئی عمل کرتا ہے لیکن جب تاش کی بازی ختم ہوئی تو بابو کو اندازہ ہوا کہ یہ نوجوان قمار بازی میں وقت صرف نہیں کر رہے تھے بلکہ وقت گزارنے کے لیے اپنا دل بہلا رہے تھے۔ بابو بے نیل و مرام سُریکھا کے پاس لوٹ آیا۔ گرمی، دھواں، ٹرین کی پٹریوں کی غلاظت اور لوگوں کے پسینے سے ایک عجیب و غریب باس اُٹھ رہی تھی جس سے بابو کو متلی سی ہو رہی تھی۔ سُریکھا کی قوت شامہ نے تو گویا جواب دے دیا تھا کیونکہ بنارس پہنچنے سے قبل کلکتہ کے ریلوے سٹیشن پر وہ دو راتیں گزار چکی تھی۔ بابو اور سُریکھا ریلوے سٹیشن سے نکل ہی رہے تھے کہ بابو کو کچھ فاصلے پر ایک درمیانی قد کا کوئی شخص نظر آیا۔ سر ذرا سا گنجا تھا۔ توند نکلی ہوئی تھی۔ ہاتھ میں کچھ کاغذات لیے ہوئے اور دھوتی سنبھالتے ہوئے وہ تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے سٹیشن کے اندر جا رہا تھا۔ بابو نے سُریکھا کو ہمراہ لیا اور دونوں اُس شخص کی طرف بڑھنے لگے۔ اس دوران بابو نے سُریکھا کو بتایا کہ یہ وہی آدمی ہے جس سے اُس کی ملاقات بنارس میں ہوئی تھی اور جس نے اُس سے ملنے اور کام دلانے کا وعدہ کیا تھا۔ ابھی وہ کلّن سے کچھ ہی گز پر تھے کہ اُسے دیکھتے ہی تاش کھیلنے والے لڑکے سب کے سب اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ بابو اور سُریکھا اپنی جگہ پر کھڑے رہے۔ کلّن لڑکوں کو فرداً فرداً ایک کاغذ دے رہا تھا اور پتہ نہیں اُن کو کیا کہہ رہا تھا۔ البتہ سبھی نوجوان کاغذ پاتے ہی بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ اسی دوران ایک ریل گاڑی ہاہا کار مچاتی ہوئی پلیٹ فارم پر آ کر رُکی۔ اُس کے ڈبوں سے جیسے لوگ اُمڈ رہے تھے۔ کلّن کی نظر بار بار پلیٹ فارم کی طرف دوڑ رہی تھی جیسے کہ وہ کسی کی راہ دیکھ رہا تھا۔ جونہی وہ نوجوانوں سے فارغ ہو کر آگے بڑھا بابو دوڑ کر اُس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔
صاحب! صاحب! آپ نے مجھے نوکری دلانے کا وعدہ کیا تھا۔ میں کام کرنا چاہتا ہوں لیکن تم سے تو میری ملاقات بنارس میں ہوئی تھی۔ جی صاحب میں کلکتہ نوکری کی تلاش میں آ گیا ہوں۔ اسی دوران ریل گاڑی سے کوئی پندرہ بیس لوگ اپنے گندے ملبوسات میں ہاتھ میں بستہ یا گٹھری لیے کسی صاحب کے ہمراہ کلّن کے پاس آ گئے۔ اُن کو دیکھتے ہی کلّن بہت خوش ہوا اور اُن سے یہیں انتظار کرنے کو کہا۔

دیکھو برخوردار نوکری تمھیں مل جائے گی لیکن اس کا انحصار مجھ پر نہیں ہے صاحب میرے ساتھ یہ عورت بھی ہے۔ یہ بھی کام کرنا چاہتی ہے۔ اچھا چلو! تم دونوں وہاں ریلوے سٹیشن کے اُس کونے میں ایک گودام ہے جا کر قیام کرنا۔ شام کو تم کو کھانا بھی مل جائے گا۔ میرا انتظار کرنا۔ کل صبح میں آپ دونوں کے لیے کوشش کرتا ہوں۔

بابو اور سُریکھا خراماں خراماں اُس جگہ پہنچے جہاں کلّن نے انھیں رات گزارنے کے لیے کہا تھا۔ یہ ریلوے سٹیشن میں ہی ایک بڑا سا کمرہ تھا جس کو ڈپو کہا جاتا تھا اور جہاں چالیس پچاس لوگ پہلے سے پڑے تھے۔ اُن کے کپڑے اور حلیے سے اندازہ لگانا آسان تھا کہ یہ سماج کے کس طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اکثر فرش پر سو رہے تھے جن پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ مرد ایک کونے میں تو عورتیں دوسرے کونے میں پڑی تھیں۔ کچھ نوجوان کنول کے پھول کی مانند غول بنائے بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ بابو کچھ دیر کے لیے اُن کے پاس کھڑا رہا پھر برداشت نہ کر پانے پر وہ کھیل میں شامل ہو گیا۔ آج کئی دنوں کے بعد جیسے اُسے اطمینان اور سرخوشی محسوس ہو رہی تھی۔ پتہ نہیں کس وقت تک وہ تاش کھیلتے رہے ہوں گے لیکن سبھی لوگ صبح ایک دم سپاہیوں کے جوتوں اور اُن کی گرجدار آواز سے جاگ اُٹھے تھے۔

چلو چلو قطار میں کھڑے ہو جاؤ

گرجدار آواز کسی انگریز افسر کی تھی

سبھی لوگ دو قطار میں کھڑے ہو گئے اور ہر قطار کے سامنے کوئی انگریز میز کے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔ نام؟ عمر؟ کیا تُو نے معاہدے پر دستخط کیا ہے جس پر تو نے اقرار کیا ہے کہ تو ماریشس میں گنے کے کھیتوں میں مزدوری کرنا چاہتا ہے؟ تجھے مہینہ کے لیے پانچ روپے ملیں گے۔ رہنے کے لیے گھر۔ کھانا علاوہ سال میں تجھے دو جوڑے کپڑے بھی دیے جائیں گے۔ اس کاغذ پر تو نے پانچ سال گنے کے کھیتوں میں کام کرنے کے لیے دستخط کیا ہے؟

جی صاحب!۔۔۔ جی حضور!

انگریز نے کراہت بھری نظروں سے سامنے کھڑے ہندوستانی مہاجر کو دیکھا اور اُس سے مخاطب ہوا۔ بیوقوف یہ بستہ کہاں لے جا رہا ہے؟ گنے کے کھیت میں بستہ سے کیا کرے گا؟ جہاز پر مزدوروں کو بستہ لے جانے کی اجازت نہیں۔ تو اپنا سامان کی گٹھری یا تھیلی میں رکھ سکتا ہے۔ پانچ سال کے بعد اگر تو ہندوستان لوٹنا چاہے تو تو ایسا کر سکتا ہے لیکن واپسی کا کرایہ تمہیں خود برداشت کرنا ہوگا۔

بیوقوف تمہیں معلوم نہیں تمہیں وہاں کیا کام کرنا ہوگا۔؟

بلڈی فول! ماریچ نہیں کہتے۔ تُو ماریشس جا رہا ہے جو یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے اور تو گنے کے کھیتوں میں مزدوری کریگا۔ گنے کے کھیتوں میں وہاں بہت پتھر ہیں۔ تو پتھر پلٹے گا اُس کے نیچے سے تمہیں سونے کے سکّے ملیں گے۔ انگریز نے اپنے دوست کی طرف دیکھتے ہوئے قہقہہ لگایا۔ معصوم سا چہرہ لیے انگریز کے سامنے بے بس ہندوستانی کھڑا تھا۔ اُسے اس بات کا علم تھا کہ خربوزہ چھری پر گرے یا چُھری خربوزے پر، نقصان ہر حال میں خربوزے ہی کا تھا۔ اس عرصے میں بابو قطار میں سُریکھا کے ساتھ کھڑا تھا۔ اُسے یہ خوف کھائے جا رہا تھا کہ وہ انگریز سے کیا کہے گا کیونکہ اُس کے پاس کوئی کاغذ نہیں تھا جو وہ اُسے دکھا سکتا تھا۔ ابھی دو تین لوگ بابو کے سامنے قطار میں کھڑے ہی تھے کہ کلّن آ گیا۔ بابو اُسے دیکھتے ہی اچھل پڑا۔ کلّن نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں ابھی صاحب سے بات کروں گا۔

انگریز اسی طرح تلخ انداز میں قطار میں کھڑے باقی لوگوں سے بات کرتے تھے اور غریب و بے بس لوگوں کی مجبوری اور بیوقوفی پر طنز کے ساتھ ساتھ اُن کا مذاق بھی اڑا رہے تھے جب بابو کی باری آئی تو کلّن اُس کی جگہ انگریز سے مخاطب ہوا۔

صاحب یہ لڑکا بھی ماریشس جانا چاہتا ہے۔ اُس کی جورو بھی ساتھ جانا چاہتی ہے۔

بابو ذرا جھینپ سا گیا۔ سُریکھا لرزاں براندام سی ہو گئی۔

کلّن یہ طریقہ اچھا ہے۔ میاں بیوی دونوں اگر ایک ساتھ وہاں جائیں گے تو آئے دن وہاں جو

ہمیں واردا تیں سننے کو مل رہی ہیں وہ کچھ کم ہو جائیں گی۔ انگریز نے بابو اور سُر یکھا سے باری باری اُن کا نام اور عمر پوچھی۔ پھر کلّن سے مخاطب ہوا ''کیا تم نے ان لوگوں کو کام کے بارے میں بتا دیا؟'' ''جی صاحب' دونوں راضی ہیں اور معاہدے پر دستخط کرنا چاہتے ہیں۔ کلّن نے فرماں بردار نوکر کی طرح جواب دیا۔ ٹھیک ہے! انگریز نے میز پر رکھے کاغذ کو آگے بڑھایا اور دونوں کو اس پر دستخط کرنے کا کہا۔ بابو اور سُر یکھا دونوں دستخط نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا انگریز نے اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں اور اشارے سے معاہدے پر انگوٹھا لگانے کو کہا جس کے بعد اُس نے دس روپے کے دو نوٹ دونوں کو دے دیے۔ بابو اور سُر یکھا کے لیے یہ بہت بڑی رقم تھی جس کی وجہ سے اُن کے چہرے کھل گئے تھے۔ بابو یہ رقم پاتے ہی سوچنے لگا تھا کہ اتنی بڑی رقم سے وہ ریلوے سٹیشن پر تاش کھیل کر زیادہ روپے کما سکتا تھا۔ انگریز سے رخصت ہوتے ہی کلّن نے دس روپیوں میں سے اپنا حصہ طلب کیا اور دونوں سے تین تین روپے وصول کیے۔

دیکھو اگلے ہفتے منگل کی دوپہر تم لوگوں کو بندرگاہ پر پہنچ جانا چاہیے۔ یہ پیسے جو دیے گئے ہیں اس سے نہ صرف تم کھانا خرید سکتے ہو اور اگر چاہو تو کچھ گرم کپڑے بھی خرید سکتے ہو۔ بعدازاں کلّن ان لڑکوں سے بھی ملا جن کو اُس نے ریلوے سٹیشن پر اُن کے معاہدے کا کاغذ تھما دیا تھا۔ دراصل وہ سب سے تین تین روپے اپنا کمیشن وصول کر رہا تھا۔

۱۷ اگست ۱۸۶۳ء کلکتہ کی بندرگاہ

صفحۂ قرطاس کی مانند ہموار سمندر میں ''اطلس'' مستول بردار جہاز لنگر انداز ہے۔ آسمان کا نیلا رنگ ہلکے بادلوں کی وجہ سے ذرا پھیکا اور اداس لگ رہا ہے۔ رہ رہ کر بندرگاہ میں جہازوں کی آمدورفت اور اُن کے ہارن سے ماحول زیادہ سنجیدہ لگنے لگا ہے۔ ''اطلس'' دوسرے بحری جہازوں کے مقابلے میں زیادہ بڑا اور عالیشان دکھتا ہے۔ بندرگاہ پر کھڑے لوگ ''اطلس'' پر سفید وردی میں ملبوس ملاحوں کو سفر کی تیاری میں اِدھر اُدھر آتے جاتے دیکھ سکتے ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ بجے ماریشس جانے والے مسافر بندرگاہ پر آنے لگے تھے۔ کرنل ویلنگٹن وہیں چند انگریز سپاہیوں سے

گفتگو کر رہے تھے۔ ایک سرے سے جہاز پر سامان لادا جارہا تھا تو دوسرے سے مسافر سوار ہو سکتے تھے۔ جہاز پر سوار ہونے سے قبل انگریز افسران مسافروں کا نام، حلیہ وغیرہ کی تسلی کر رہے تھے۔ سامان کے ساتھ ساتھ اُن کی صحت پر بھی نظر تھی۔ بابو نے اس موقع کے لیے کپڑے بدل لیے تھے۔ اُس کے پاؤں میں چپل بھی تھی۔ بال بھی بنوا لیے تھے۔ اور دوسرے مسافروں کی طرح ایک گٹھری لیے بندرگاہ کی جانب سُریکھا کے ہمراہ آرہا تھا۔ سُریکھا بھی صاف ستھری لگ رہی تھی اور اُس کے ہاتھ میں بھی ایک تھیلا تھا۔ دونوں سنجیدہ چہرہ لیے جہاز کی جانب بڑھ رہے تھے۔ جب کسی نے دور سے اُسے بابو بابو کہہ کر آواز دی۔ اُس کو لگا کہ یہ کوئی فریب یا اُس کے تحت الشعور کا کھیل ہے۔ لہٰذا وہ آگے بڑھتا گیا۔ لیکن آواز دینے والا کوئی ایک شخص نہیں تھا بلکہ تین چار تھے۔ چونکہ آوازیں مختلف تھیں اور جانی پہچانی لگ رہی تھیں اسی لیے وہ رُک گیا اور مڑنے پر مجبور ہوا۔ مدن، موہن، گوپال اور فرید دوڑ رہے تھے۔ رُک جا بھائی ہم ہیں تمہارے دوست۔ بابو! وہ نہیں سمجھ پارہا تھا کہ عین اُس وقت اُسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن اس کے دوستوں کی فغاں نے جیسے اُس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں۔ سُریکھا وہیں بازو میں کھڑی ہو گئی اور سمجھ نہیں پارہی تھی کہ معاملہ کیا ہے کہ اسی اثنا میں آواز دینے والے اُس کے پاس پہنچ گئے۔ پہلے تو سب گلے ملے اور آنسو پونچھے۔ پھر مدن نے کہا ''بابو تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے گھر سے غائب ہونے کے بعد تمہارے گھر والوں کی کیا حالت ہے؟ تمہاری ماں تو جیسے ٹوٹ چکی ہے۔ وہ سارا دن گھر کی دہلیز پر بیٹھ کر تمہاری راہ تکتی ہے۔ تمہارے والد نے بھی تمہاری تلاش میں زمین آسمان ایک کر دیا ہے۔ لیکن دوست اب گھر لوٹنا میرے لیے ناممکن ہے۔ یہاں تک پہنچنے کے لیے تقدیر نے میرا بڑا ساتھ دیا ہے۔ پھر مناف نے بابو کو بتایا کہ وہ مدن اور موہن کو بندرگاہ تک پہنچانے آئے ہیں کیونکہ وہ مزدوری کے لیے ماریچ جارہے ہیں۔ یہ سُن کر بابو کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ دراصل موہن مگدھ اپنے ماموں کے یہاں گیا تھا جہاں اُس کے ماموں زاد بھائیوں نے اُس کی ملاقات کسی ''مستری'' سے کرائی تھی جو مزدوروں کی تلاش میں ان کے گاؤں آیا تھا۔ انھیں ایام میں مدن نے موہن کا نام بھی

لکھوالیا تھا۔ گوپال اور مناف دونوں کو کلکتہ چھوڑنے آئے تھے۔ جب بابو نے اپنے دوستوں کو بتایا کہ وہ بھی اسی جہاز پر ماریشس جا رہا ہے تو سب کو تعجب ہوا کیونکہ آج تک بابو نے کسی سے اس کے بارے میں ذکر نہیں کیا تھا۔ بابو پھر گوپال اور مناف سے مخاطب ہوا۔ برادر میرے ماں باپ کو بتانا کہ میں صحیح سلامت ہوں اور اگر میں نے اُن کا دل دکھایا ہے تو وہ مجھے معاف کردیں۔ میں محنت مزدوری کر کے اُن کی زندگی بہتر کرنا چاہتا ہوں۔ پانچ سال کا وقت جلد ختم ہو جائے گا۔ میں لوٹ کر ضرور آؤں گا تب میرے والد کو کام نہیں کرنا پڑے گا۔ ابھی بابو اپنے دوستوں سے بات کر ہی رہا تھا کہ کلّن بھی وہاں پہنچ گیا۔ مدن نے بابو کو بتایا کہ یہی شخص ''مستری'' ہے۔ سب کو ایک ساتھ بات کرتے ہوئے دیکھ کر کلّن کو بھی کچھ تعجب ہوا پھر اُن سے مخاطب ہوا ''جن لوگوں کو ماریشس جانا ہے وہ اپنے کاغذات دکھا کر اب جہاز پر سوار ہونا شروع کر دیں۔''

اس کے بعد وہ کرنل ویلنگٹن جو چند انگریز سپاہیوں سے جو دیں جہاز کے سامنے بات کر رہے تھے سے ملنے چلا گیا۔ ویلنگٹن صاحب حسب معمول اپنے نیلے فوجی پوشاک میں ملبوس تھے۔ اُن کے جوتے چمک رہے تھے۔ بال سلیقے سے بنے تھے اور شیو بھی بالکل صاف تھی۔ من حیث المجموع اُن کی شخصیت سے سرتاپا انگریزیت ٹپک رہی تھی۔ ویلنگٹن صاحب کو دیکھتے ہی کلّن اُن سے مخاطب ہوا۔

سلام صاحب!

سلام! سلام۔ کلّن میں نے تمہیں بارہا کہا ہے کہ مجھے صاحب مت بلاؤ۔ یہ لقب تم اپنے نوابوں اور مہاراجوں کے لیے رکھو۔ مجھے سر ویلنگٹن کہہ سکتے ہو اور کہو کیسے ہو؟ کیا خبر ہے؟ ویلنگٹن نے کہا۔ دونوں مسکرائے۔ کلّن نے کہا ''سر میں نے وعدے کے مطابق آپ کی بیگم کو گلاب کی قلمیں دے دی ہیں۔ بہت جلد آپ کی کوٹھی کے صحن میں خوبصورت کالے گلاب کھلیں گے۔''

کلّن میں پھولوں کی بجائے پردیس جانے والے ہندوستانی مزدوروں کے بارے میں فکرمند ہوں۔ ویلنگٹن نے سنجیدگی سے کہا۔

تم کو پتہ ہے پچھلے مہینہ ہم کلکتہ سے صرف ۸۷ مزدوروں کو ماریشس بھیج پائے تھے۔ اگر اسی

طرح سے تم کام کرتے رہے تو بہت ممکن ہے ہمیں یہاں کا ڈپو بمبئی کی طرح بند کرنا پڑے گا اور برطانیہ میں جو حکام بیٹھے ہیں وہ اس بات سے ناخوش ہوں گے۔ ڈیلنگٹن نے کلن کی بات کاٹتے ہوئے یہ جملہ کہا تھا جس کے دوران اُس کا گورا چہرا دہکتی ہوئی آگ کی طرح سُرخ ہو گیا تھا۔

دراصل کلن بہار کے امر پور ضلع گمدھ، مشرقی یوپی اور بنارس میں کافی مشہور تھا کیونکہ وہ ان ہی علاقوں سے انگریزوں کے لیے ماریشس کے گنے کے کھیتوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو مہیا کرتا تھا۔ ان پچھلے دو تین سالوں میں اُس نے اس کام کی بدولت کافی پیسے کما لیے تھے۔ وہ انگریزوں کی طرح امیر نہ تھا اور نہ ہی اُس کا مکان ملکہ وکٹوریہ کے خدام کی طرح تھا لیکن اُس کا شمار اب کلکتہ کے آسودگان میں ہونے لگا تھا۔

اس دوران بابو اپنے دوستوں سے گلے شکوے کرتا رہا اور سُریکھا کو بالکل بھول گیا تھا جب اچانک اُس کی نظر سُریکھا پر پڑی تو اُس نے اپنے دوستوں سے اُس کا تعارف کرایا۔ ڈیلنگٹن اور کلن اپنی گفت وشنید کو جاری رکھ رہے تھے اور انگریز اس بات پر زور دے رہا تھا کہ اگلے سفر کے لیے کلن کو زیادہ نسائی مزدور ڈھونڈنے کی ضرورت تھی کیونکہ ماریشس سے گورنر سر ولیم سٹیونسن نے اپنی ایک رپورٹ میں اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ اب جزیرے پر عورتوں کی کمی محسوس کی جا رہی ہے جس کی وجہ سے آئے دن وہاں معاملہ وارداتِ خفیف سے وارداتِ سنگین تک پہنچنے لگا ہے۔ کلن فرمانبردار نوکر کی طرح سر جھکائے ڈیلنگٹن کی بات سُن رہا تھا اور اپنی طرف سے پوری کوشش کرنے کا وعدہ بھی کر رہا تھا۔

ابھی دونوں بات کر رہی رہے تھے کہ کوئی مسافر جہاز پر سوار ہونے کے لیے بندرگاہ پر آیا تھا کہ اُس نے کرنل ڈیلنگٹن کو دیکھ لیا۔ اس مسافر کے لباس اور سامان سے لگ رہا تھا کہ یہ مزدوری کے لیے نہیں بلکہ کسی اور کام کے لیے ماریشس جا رہا تھا۔ علیک سلیک کے بعد ڈیلنگٹن نے اُس سے معلوم کیا کہ پچھلا سفر کیسا رہا؟ اُس کے جواب سے کلن کو معلوم ہوا کہ یہ جہاز کا طبیب تھا۔ اُس نے بتایا کہ پچھلے سفر میں چوہوں کی بہتات سے جہاز پر وبا پھیل گئی تھی جس کی وجہ سے کئی مسافر

منزلِ مقصود تک صحیح سلامت پہنچ نہیں پائے تھے۔ اگر چہ اُس نے اپنی طرف سے اُن کو بچانے کی پوری کوشش کی تھی۔

مناف اور گوپال مدن اور موہن کے لیے گھر سے دہی لائے تھے۔ اُن کا یہ اعتقاد تھا کہ سفر پر جانے سے قبل جو دہی کھاتا ہے وہ گھر ضرور لوٹتا ہے۔ مناف اور گوپال نے نہ صرف مدن موہن اور بابو کو بلکہ سُریکھا کو بھی دہی کھلایا اور اُن کے سفر کے لیے دعا کی۔ بابو نے موہن کو اپنے بازو میں بندھے تعویذ دینا چاہا تا کہ وہ ماں کو دکھا سکیں کہ واقعی اُس سے ملاقات ہوئی تھی نہیں بابو تو ایسا نہیں کر سکتا۔ یہ تعویذ تیری حفاظت کرے گا۔ ہم سب ماں کو سمجھا دیں گے لیکن تم سب ہمیں خط ضرور لکھنا گوپال نے لرزتی آواز میں کہا۔

شام کے پانچ بج رہے تھے۔ کرنل ویلنگٹن اور کلن بندرگاہ سے جانے لگے تھے۔ بندرگاہ میں ''اٹلس'' جہاز پر سفید پرندوں کی ایک جھنڈ منڈلا رہی تھی اور اپنی کائیں کائیں سے جیسے مسافروں کو الوداع کہہ رہی تھی یا نہیں چڑا رہی تھی جیسے اُن سے کہہ رہی تھی کہ اب یہ لوگ واپس کبھی نہیں آئیں گے۔

ویلنگٹن اور کلن بندرگاہ سے رخصت ہو چکے تھے مناف اور گوپال پتھرائی ہوئی نظروں سے جہاز کو جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ سورج ایک گول لال شیشے کی مانند سمندر میں ڈوب گیا اور جہاز اُن کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ بابو، مدن، موہن جہاز کی تہہ میں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ اُن کے درمیان وہی خاموشی تھی جو کافور کے درخت کے نیچے ہوا کرتی تھی۔ سُریکھا دوسری عورتوں کے ساتھ فرش پر خاموش بیٹھی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو کی لڑیاں جاری تھیں۔ پتہ نہیں اپنوں سے جدا ہونے کا یہ غم تھا یا خوشی کے آنسو تھے۔ جہاز موجوں کے تلاطم میں ہچکولے کھاتے ہوئے ماریشس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

شمع سیّد

محبت موم کی صورت

رات دھیرے دھیرے ڈھل رہی تھی واپڈا ہاسپٹل کے سرد کمرے میں دو لڑکیاں پریشانی کے عالم میں ایک دوسرے سے نظریں چرائے ہوئے کسی ناہونی کے ڈر سے سہمی سمٹی ہوئی بیٹھی تھیں۔ اُن کے سامنے بیڈ پر ایک عورت کسی نیم جان ڈھانچے کی مانند دھری ہوئی تھی نہ جانے اُس کی سانس چل رہی تھی یا۔۔۔۔دونوں لڑکیوں میں اتنا حوصلہ تھا نہ ہی اتنی سکت کہ وہ اُٹھ کر اُس کی نبض پر ہاتھ رکھ کر زندگی کو محسوس کر سکیں۔

گذشتہ چھ ماہ سے ریشم اور موت کے درمیان جنگ جاری تھی۔ ابتداء میں تو اُس نے موت کو شکست دینے کی بھرپور کوشش کی۔ اور اسی کوشش کے نتیجے میں وہ ہاسپٹل اور گھر کے درمیان اُلجھتی رہی۔ اب شائد اُس نے موت کی چاپ بہت قریب سے محسوس کرنی شروع کر دی تھی۔ یا پھر اُس کے ڈھانچہ سے وجود میں زندگی کی حرارت دم توڑنے کو پھڑ پھڑا رہی تھی۔ بائیس سال پہلے یوں ہی اچانک وہ عذیر سے ٹکرا گئی تھی۔ اس کا بھائی واپڈا آفس میں ملازمت کرتا تھا۔ ایک روز اسے انتہائی پریشانی کے عالم میں بھائی کی ضرورت اُس کے آفس تک کھینچ لائی۔ وہ فیلڈ کے کام سے باہر تھا اور آفس میں موجود نہ تھا عذیر نے ریشم کو آگے بڑھ کر بتایا کہ وہ اُس کے بھائی نبیل کا دوست ہے اگر کوئی پریشانی کی بات ہے تو وہ اُسے بتا سکتی ہے۔ ریشم چند لمحے تذبذب کا شکار رہی کہ اُسے بتانا چاہیئے یا نہیں۔۔۔؟ معاملہ ایسا تھا کہ بتائے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ برسوں پہلے اُس کی ماں اور باپ میں علیحدگی ہو چکی تھی۔ وہ دو ہی بہن بھائی تھے۔ ماں کو سانس کی تکلیف تھی آج بھی اُس کی طبیعت بگڑنے پر وہ ہاسپٹل تک تو آ گئی تھی مگر ڈاکٹر کے دیئے گئے نسخے کے مطابق جو دوائیں میڈیکل اسٹور سے خریدنی تھیں ان کے لیے گھر میں موجود قلیل رقم ناکافی تھی یہ ہی وجہ تھی

کہ اس نے بھائی کے گھر لوٹنے کا انتظار کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا اور خود چلی آئی ماں کے معاملے میں دونوں بہن بھائی ہی حد درجہ حساس تھے وہ یہی ان دونوں کا کل اثاثہ تھی عذیر نبیل کے حالات اور جذبات سے بس کچھ ہی حد تک واقف تھا اُن دونوں کی دوستی تھی مگر عجیب بات تھی کہ اپنی نوکری کے ان چار سالوں میں آج تک اُنہوں نے ایک دوسرے کی ذاتی زندگی کے حوالے سے بہت کم بات کی تھی۔ خاص طور پر اپنے خاندان کے دیگر افراد کے معاملے میں دونوں انجان ہی تھے۔ عذیر نبیل سے عُمر میں بڑا ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ سنیئر بھی تھا شاید یونہی دونوں بہت زیادہ بے تکلف نہ تھے۔ آج ریشم سے یُوں اچانک ملاقات اور اُس کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے وہ فوراً اس کی مدد پر آمادہ ہو گیا تھا۔

اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ میرے پاس جیپ ہے۔ نبیل تو جانے کب تک واپس آئے میں ماں جی کو دیکھ لیتا ہوں اور دواؤں کا بندوبست بھی ہو جائے گا آپ پریشان نہ ہوں عذیر کی تسلی پر ریشم کی آنکھیں برسنے لگیں وہ بھی اُس کی تکلیف پر تڑپ سا گیا۔ بس اب آپ مزید فکر مند نہ ہوں پروردگار اپنا کرم کرے گا بس آپ چلیے۔۔۔۔ اُسے مزید کچھ کہنے کا موقعہ دیئے بغیر عذیر نے باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے ریشم بھی اپنے وجود کو گھسیٹتے ہوئے اور اپنے حوصلے کو جمع کرتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

اس ایک ملاقات کے بعد کچھ ہی عرصے میں ان کے درمیان اجنبیت کی دیوار گرنے لگی۔ ماں جی گھنٹوں عذیر کے ساتھ اپنے دونوں بچوں کے مستقبل کی ڈھیروں باتیں کیا کرتیں خاص طور پر وہ اپنی بیٹی کے حوالے سے بہت پریشان تھیں۔ ریشم کی ضد تھی کہ وہ شادی نہیں کرے گی اور اگر کرے گی تو اُس انسان سے جو گھر داماد رہنے پر آمادہ ہو گا کیونکہ وہ اپنی ماں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتی اس بے تکی ضد پر عذیر نے پہلے پہل تو ریشم کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اپنی ماں کے دکھ کو بڑھا رہی ہے پھر اُس نے بھی اُس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال کر اُسے سمجھانا ترک کر دیا۔

نبیل نے بھی اُسے یقین دلایا کہ اُس کی شادی کے فوراً بعد وہ بھی شادی کرے گا تو گھر میں

بہو آجائے گی ماں کی دیکھ بھال کرے گی۔ مگر وہ اس پر بھی اپنی ضد سے نہیں ہٹی۔ اس معاملے میں سب کی کوشیش رائیگاں ہی گئیں۔ وقت کچھ اور آگے سرکا تو عذیر نے ریشم میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ گاہے گاہے اُس کی آمد و رفت کا سلسلہ چل نکلا اور پھر تقدیر کی چاپ قریب سُنائی دینے لگی۔

اپنے دل کی کیفیت کو لے کر وہ انتہائی مشکل میں تھا کہ کس سے اپنے جذبات کا اظہار کرے۔ کون ہے جو اُس کی بات کو سمجھے گا کون قبول کرے گا اس رشتے کو۔۔۔ وہ اپنی لڑائی کیسے لڑے گا۔۔۔؟ اُس کے سامنے بے شمار محاذ تھے اور وہ اکیلا اپنی لڑائی لڑنے کی تیاری کرنے لگا ان حالات میں اُمید کی ایک کرن تھی اور وہ تھی ماں جی۔۔۔ ماں جی کے بارے میں سوچتے ہوئے اُسے ایک مقام پر آ کر اپنی خود غرضی کا احساس ہوا کہ کہیں وہ ایک مجبور ماں کے جذبات سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش تو نہیں کر رہا۔ کافی دنوں تک وہ اس احساس کے زیر اثر رہا۔ رفتہ رفتہ ادراک کے در کھلتے چلے گئے اور اُسے کامل یقین ہونے لگا کہ وہ ریشم سے بے پناہ محبت کرنے لگا ہے۔

وہ ایک شادی شدہ مرد تھا اور دو بیٹوں کا باپ تھا قد کاٹھ میں اللہ پاک نے درازی عطا کی تھی۔ خد و خال بھی مناسب تھے ڈیل ڈول پُرکشش تھا مگر رنگ کچھ گہرا تھا جب کہ ریشم بے حد خوبصورت متناسب قد کی لڑکی تھی۔ سب سے بڑھ کر اُس کی دلکش کٹوراسی آنکھیں یہ ہی بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں عذیر کی کمزوری بن گئیں۔

چھ سال پہلے اُسے گھریلو دباؤ کے زیر اثر چچازاد نسیم سے بیاہ دیا گیا تھا ماں کی وہ ہی روایتی منت سماجت اور واسطے نسیم بی بی اُسے پسند نہ تھی چونکہ وہ کافی حد تک نرم دل اور فطرتاً صلح جُو انسان تھا سو نباہ رہا تھا۔ گزشتہ چھ سالوں میں وہ بہت اچھا نہیں تو بہت بُرا شوہر بھی نہیں ثابت ہوا تھا۔ نسیم کا کوئی بھائی نہیں تھا وہ چار بہنیں تھیں۔ خاندان بھر میں یہ بات مشہور تھی کہ وہ تمام بہنیں بیٹیاں ہی پیدا کرتی ہیں جانے اللہ پاک کی کیا حکمت تھی کہ خلقِ خدا کے منہ سے نکلی ہوئی یہ بات سچ ثابت ہو رہی تھی۔ ریشم کی صُورت عذیر کے گھٹن زدہ دل پر اچانک اور غیر متوقع طور پر تازہ ہوا نے دستک دی تھی۔

دل تو اپنے حواس کھونے لگا تھا اور دماغ اُس پر غلبہ پانے کی کوشش کر رہا تھا اس کی عقل یہ ماننے کو تیار نہ تھی کہ اُس کا اور ریشم کا سنجوگ ہو سکتا ہے۔ جس شدت سے دماغ اُسے پسپا کرنے پر تلا ہوا تھا۔ دل اُس سے دُگنی شدت کے ساتھ مچل رہا تھا۔ آخر جیت دل کی ہوئی اور اُس نے ماں جی کے ساتھ اپنے جذبات بانٹنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ جب کہ ریشم اُس کی تمام تر دلی اور ذہنی کیفیات سے انجان تھی۔

"ماں جی میں ریشم سے نکاح کرنا چاہتا ہوں اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو۔۔۔" عذیر نے اپنی بات ایسے جلدی جلدی ماں جی کے سامنے رکھی کہ مبادا ٹھہر ٹھہر کر بولنے سے اُس کے حرف دم نہ توڑ دیں۔ وہ اپنی جرأت پر حیران تھا اور کسی قدر مطمئن بھی ریشم کی ماں نے بے یقینی سے عذیر کے جھکے ہوئے سر کو دیکھا۔ اور کچھ پل سوچنے کے بعد ریشم کی شرط عذیر کے سامنے رکھی۔ وہ کسی طور ماں کو چھوڑ کر جانے پر آمادہ نہ تھی اور گھر داماد بھلا کون دیتا۔ لوہا گرم دیکھ کر عذیر نے دوبارہ چوٹ کی۔۔۔ ماں جی آپ فکر مند نہ ہوں میں گھر داماد رہنے کو تیار ہوں۔ جب تک ریشم اپنے نئے رشتے اور زندگی میں آنے والی نئی ذمہ داریوں کو دل سے قبول نہ کرے گی میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔ مجھے اُمید ہے وہ بہت جلد حقیقت کو تسلیم کر لے گی۔ پھر نبیل کی شادی کے بعد تو وہ یقیناً آپ کی طرف سے بے فکر ہو ہی جائے گی۔

پھر اُسے اپنی گرہستی بسانے میں دقت نہیں ہو گی۔ ہوں۔۔۔ ماں جی نے طویل سانس لیتے ہوئے اپنے دل کے بوجھ میں کچھ کمی محسوس کی اور اپنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے گویا رضامندی دے دی۔ نبیل نے اس معاملے میں کچھ زیادہ ردِ عمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ صرف اپنی ماں کو تمام فکروں سے آزاد اور خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ آگے کے مراحل عذیر کے لیے کچھ زیادہ پریشان کن ثابت نہیں ہوئے اُس نے اپنے پُرانے دوستوں اور چچا کے بیٹے کو رازدار بنایا اور اُن سے ہی باراتی لانے کا کہا جس میں ماں باپ سے لے کر بہن بھائی تک شامل تھے۔ جب کہ حقیقت میں تو اُس کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس سب بھاگ دوڑ میں اکثر اُس کا ضمیر اُسے

جھوٹ بولنے پر ملامت بھی کرتا۔ وہ ریشم، نبیل اور ماں جی تینوں کو دھوکا دے رہا تھا۔ یہ کیفیت چند ہی پل رہتی اور پھر اُس کا دل اُسے مطمئن کر دیتا۔ وہ یہ سب ریشم کی حد درجہ محبت میں کر رہا تھا اندھی محبت، اُسے یقین تھا کہ وہ جلد ہی تمام معاملات کو سُلجھا لے گا۔ وہ اُسے اتنا چاہے گا کہ وہ کبھی اُس کے بغیر رہ ہی نہیں پائے گی۔

نکاح کے بعد اُس نے اپنا پیٹرولیم کا کاروبار شروع کر لیا۔ اور گھر والوں سے کہہ دیا کہ وہ دو سال کے لیے دبئی جا رہا ہے۔ اس جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لیے اُس نے شہر سے دور ایک پوش علاقے میں گھر کرائے پر لے لیا اور ماں جی، ریشم اور نبیل کے ساتھ رہنے لگا۔ ویسے کاروبار کے سلسلے میں یوں بھی کئی کئی دن شہر سے باہر رہنا پڑتا۔ گھر والوں کو خرچہ وہ اپنے دبئی میں مقیم دوست کے توسط سے بھیجتا رہا۔

ریشم عذیر کے ساتھ بہت خوش تھی ماں جی اور نبیل بھی مطمئن تھے وہ ایک اچھا شوہر اور داماد ثابت ہوا تھا۔ اب نبیل کے لیے بھی رشتے کی تلاش شروع ہوئی۔ دو سال کا عرصہ پلک جھپکتے گزر گیا اس دوران وہ مزید ایک بیٹی کا باپ بن گیا۔ ریشم اور عذیر کی ''کائنات'' اب رفتہ رفتہ عذیر نے اپنی ماں اور بہن کو سچ بتانے کا فیصلہ کیا۔ سچ کیا تھا گویا ایٹم بم تھا وہ ہی احتجاج، رُوٹھنا منانا، ریشم اور اُس کے گھر والوں پر جو پہاڑ ٹوٹا سو الگ، حیرت انگیز طور پر ان حالات نے عذیر اور ریشم کو اور زیادہ قریب کر دیا تھا۔ وہ دن رات اُس سے اپنی غلطیوں کی معافی بھی مانگتا اور بے تحاشا محبت کا یقین بھی دلاتا رہتا۔ آخر وہ بے بس ہو گئی وہ خود بچپن سے اپنے باپ کی جدائی کا دُکھ دل میں دبائے جی رہی تھی نہیں چاہتی تھی کہ یہی دکھ اُس کی بیٹی کا مقدر بنے کچھ عرصے کی کشیدہ صورت حال کے بعد حالات اپنی ڈگر پر واپس آتے گئے۔ اب دونوں بیویاں ایک ہی گھر کے دو مختلف کمروں میں آباد ہو گئیں۔ تیسری بیٹی کی پیدائش کے بعد نسیم بی بی پر بیٹی پیدا کرنے کا ٹھپہ لگ چکا تھا۔ اُدھر قسمت کیسے ریشم نے دوسرے بیٹے کو جنم دیا۔

کچھ لوگ قسمت کے بہت دھنی ہوتے ہیں اور یہ خوبی پیدائشی طور پر اُن کے ساتھ ساتھ چلتی

ہے بچپن سے جوانی تک کا سفر دونوں گہری ہمجولیوں کی طرح ساتھ طے کرتی ہیں۔ ریشم بھی بہت دھنی عورت تھی اُسے دُکھ بھی ملے تو کسی انہونی کی طرح۔ زندگی کے پلڑوں میں دُکھ زیادہ تھے یا خوشیاں اس کا تعین وہ نہ کرسکی۔ اُس کا تیسرا اور سب سے چھوٹا بیٹا باسط جو پانچ سال کا ہو چلا تھا۔ مگر اب تک نہ چلتا تھا نہ ہی بولتا تھا۔ اُس کا قد اور ذہن ایک سال سے آگے نہ بڑھا تھا اچھے سے اچھے ڈاکٹر کو دکھایا گیا مگر کوئی حوصلہ افزا جواب نہ ملا اس دُکھ کی کیفیت سے ریشم رفتہ رفتہ کمہلانے لگی۔ اس کا چاند چہرہ ماند پڑنے لگا۔ دن رات بیٹے کے دُکھ میں گھلتی جارہی تھی نہ اُس کا دُکھ۔ درد کسی مقام پر تھمانہ وقت کی رفتار رُکی باسط اب آٹھ سال کا تھا اُس کا نچلا دھڑ اب بھی مفلوج تھا لیکن پھر وہ ایک سبے حد خوبصورت اور چمکتے چہرے والا معصوم سا بچہ تھا۔

عذیر جب بھی گھر آتا ریشم یا تو باسط میں مگن رہتی یا پھر یونہی اُلجھی بکھری سی رہتی۔ اب دونوں کے درمیان ایک دیوار سی آن کھڑی ہوئی تھی جو اُن کی اپنی ہی اولاد تھی۔ ریشم کی اصل طاقت کا مرکز و محور تو عذیر کی محبت تھی وہ ہمیشہ اُس کی موجودگی میں خود کو محفوظ تصور کرتی۔ اب اُسے اپنا اکیلا پن بے چین رکھتا۔ وہ اندر سے کھوکھلی ہوتی جارہی تھی۔ کائنات اب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھی۔ وہ حتی المقدور ماں کو سنبھالنے اور باپ کو سمجھانے کی کوشش کرتی۔

وقت ہتھیلی میں بندریت کی طرح پھسلتا جارہا تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ ریشم کو معدے کا السر ہے۔ ساتھ ہی بلڈ پریشر اور شوگر کا مرض بھی ہے۔ دن ڈھلنے کے ساتھ ساتھ وہ بھی ڈھلتی جارہی تھی۔ چند ہی دنوں میں ڈھانچہ سی ہوگئی۔ بیماریوں سے تو شاید وہ لڑ ہی لیتی مگر عذیر اور اپنے درمیان حائل دیوار کو گرانا اُس کی طاقت سے بڑھ کے تھا۔ وہ اُس کا پیچھا بھی نہ کرتی تھی۔ اُسے خود اپنا آپ کسی آسیب کی طرح لگا کرتا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ یہ آسیب عذیر کی رُوح سے چمٹ جائے۔ اکیلے پن کا عفریت اُس کے لہو کا ایک ایک قطرہ چاٹ رہا تھا۔

اُس کی سوتن کے بھاگ جاگ گئے تھے وہ تین بیٹیاں پیدا کرکے بھی شان اور تمکنت سے اپنے عہدے پر براجمان تھی اور وہ۔۔۔ اپنے وجود اپنے ہونے کا یقین کھو رہی تھی۔ آخر کار اُسے

ہاسپٹل میں داخل کروا دیا گیا۔ کائنات اور سعدیہ (اس کی سوتیلی بیٹی) اس کی تیمارداری پر مامور تھیں۔ اس کی بیماری روز بروز شدت اختیار کر رہی تھی۔ اب تو وہ لہو اُگلنے لگی تھی۔ بارہا راتوں میں شدت درد سے بلبلا اُٹھتی۔ ایسی ہی ایک سرد اور خاموش رات عذیر اُسے دیکھنے آیا تو اس نے اُکھڑی سانس اور ڈبڈباتی آنکھوں سے اُس کا ہاتھ تھام کر التجا کی کہ وہ اُسے آزاد کر دے۔۔۔ وہ اُسے اپنی محبت سے آزاد کر دے۔۔۔ عذیر میں تھک گئی ہوں۔۔۔ میری روح تم سے بندھی ہے۔۔۔ میں بہت تکلیف میں ہوں۔ خدا کے لیے مجھے جانے دو۔۔۔ مجھے آزاد کر دو۔۔۔

یک لخت اُس کے ہاتھ عذیر کے ہاتھوں میں سرد پڑنے لگے۔ اُس کے شوہر اُس کے سرتاج۔ اُس کے مجازی خدا کی محبت کی حرارت کا کنکشن جیسے کٹ گیا۔۔۔ کائنات نے دھیرے سے باپ کے کندھے کو چھوا تو اس نے قدرے چونک کر بیٹی کی روتی صورت کو دیکھا۔

بابا آپ کو اللہ پاک کا واسطہ میری ماں کو آزاد نہ کیجئے گا۔ اگر وہ آپ کی محبت میں ہی زندہ ہے تو اُسے جی لینے دیں۔ شاید کسی دن وہ ٹھیک ہو جائے۔ معجزہ ہو جائے۔ آپ اُن کی ضد سے ہار نہ مانیے گا۔۔۔ وہ بھی تو لڑ رہی ہے۔۔۔ آپ کے لیئے۔۔۔ آپ کی محبت کے لیئے۔۔۔ آپ وعدہ کریں آپ کمزور نہیں پڑیں گے۔۔۔ بیٹی سے نگاہیں چُراتا وہ جلدی سے ہاسپٹل کی حدود سے باہر نکل گیا سحر ہونے والی تھی۔ جانے کونسا پہر اور گھڑی تھی کہ تھکی ماندی نیند سے بوجھل کائنات نے اُسی تیزی کے ساتھ ایک سائے کو باہر جاتے ہوئے دیکھا۔۔۔ ایک لمحے سے بھی کم وقت میں وہ ماں کے بیڈ کے پاس پہنچی۔۔۔ اور جیسے ہی اُس نے ریشم کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیا تو۔۔۔۔۔

محمد طارق علی

کلین بولڈ

وسط اپریل کے وہ سنہرے سنہرے سے دن، جب موسم بہار اپنے سارے رنگ سمیٹ چکا تھا میرے لیے یادگار دن بن گئے۔ مجھے میری پسند کے مقامی گورنمنٹ ڈگری کالج میں فرسٹ ائر میں داخلہ مل گیا۔ جلدی ہی کلاسیں شروع ہو گئیں ایک روز میرا ساڑھے بارہ بجے والا پیریڈ خالی تھا۔ میں کینٹین چلا گیا۔ موسم خاصا گرم تھا لیکن کینٹین کے ہرے بھرے لان میں قدرے ٹھنڈی اور ہلکی ہلکی ہوا تھی اور ہر سو نکہت گل پھیلی ہوئی، اسی وقت جاوید بشیر بھی وہاں آ گیا۔ ہم اکٹھے چائے پینے لگے وہ کچھ خاموش خاموش تھا آنکھیں سُتی ہوئیں، اُداسی کا رنگ لئے ہوئے اور چہرے کا رنگ پھیکا پھیکا میرے پوچھنے پر اس نے بتایا:

"کالج کرکٹ ٹیم میں میری شمولیت ابھی تک مشکوک ہی ہے"

"تو پھر اب کیا کرو گے"

"بس انتظار، قسمت نے ساتھ دیا تو میں ٹیم میں شامل ہو جاؤں گا ورنہ ٹیم سے باہر تو ہوں ہی"

جاوید بشیر میرا دور کا پڑوسی تھا، دو گلیاں آگے رہتا تھا اب وہ کالج میں میرا کلاس فیلو بھی بن گیا۔ ہم روزانہ صرف دو پیریڈ میں اکٹھے ہوتے، باقی پیریڈز میں ہمارے مضامین مختلف تھے۔ اس کا ڈیل ڈول اچھا تھا، کسرتی جسم قد چھ فٹ کو چھوتا ہوا لہریئے دار بال، سانولا رنگ لیکن نوجوانی کی چمک لئے ہوئے۔ ہلکے سُروں میں بات کرتا تھا تاہم مخاطب کی توجہ اپنی جانب کھینچ لیتا تھا۔ بولتے وقت اس کی آنکھوں میں قدرے چمک سی لہرانے لگتی اور لبوں پر خود بخود ہلکی سی مسکراہٹ اتر آتی۔ وہ کچھ کچھ اس زمانے کے مشہور ہیرو گریگوری پیک کے مانند لگتا تھا۔

جاوید بشیر بس میرا واقف تھا۔ تفصیلی تعارف اس روز ہوا جب ہم میٹرک رزلٹ کے بعد کالج میں داخلہ لے رہے تھے۔ اس کے نمبر خاصے کم تھے خصوصاً انگلش اور اردو میں وہ بہ مشکل پاس تھا۔ کوئی اور لڑکا ہوتا تو اسے داخلہ بالکل نہ ملتا۔ لیکن جاوید کو داخلہ مل گیا کیونکہ وہ ایک اچھا سپورٹس مین تھا۔ اسکول لیول کے کرکٹ میچوں میں کامیابیوں کی ایک لمبی فہرست، اخباری تراشے اور چند تعریفی اسناد اس کے پاس تھیں۔ وہ ایک بااثر باپ کا بیٹا بھی تھا جو وزارت خزانہ میں کسی اچھے عہدے پر تھے۔

ان دنوں کالج کرکٹ ٹیم میں ایک اچھے فاسٹ باؤلر کی کمی تھی۔ ٹیم کئی میچ اپنی اسی خامی کی وجہ سے ہار چکی تھی۔ سپورٹس شعبے والوں نے جاوید بشیر کو داخلے کے فوراً بعد کرکٹ ٹیم کے لیے ہاتھوں ہاتھ لیا لیکن ٹیم کے کوچ اور کپتان نے پہلے اس کی باؤلنگ اور سٹیمنا کا امتحان لیا اس کی جسمانی طاقت اور قوت برداشت ٹھیک تھی لیکن فاسٹ باؤلر کے طور پر اس کے رن اپ کو غیر تسلی بخش سمجھا گیا اسی نقص کی وجہ سے اس کے بال کی لائن ورلینگتھ صحیح نہ تھی۔ وہ کچھ مایوس ہوا تاہم اسے ضروری پریکٹس کے لیے دو تین ہفتے کا وقت دے دیا گیا لیکن مقررہ دن لیے گئے ٹیسٹ میں وہ پھر ناکام تھا اس کی مایوسی بڑھ گئی۔

اس روز کینٹین میں چائے کی پیالی پر ہماری گفتگو زیادہ تر اسی موضوع پر رہی پھر بل دے کر ہم اٹھ گئے۔ اور اپنی اپنی کلاسوں میں چلے گئے۔ اس زمانے میں ٹی وی کا رواج نہیں تھا کہ سپورٹس چینلز پر اچھے کرکٹ پلیئرز کی فلمیں دیکھنے کو مل جاتیں۔ کمپیوٹر اور سی ڈی کا بھی کوئی تصور نہ تھا۔ کالج لائبریری میں ایک پرانا سا فلم پروجیکٹر پڑا تھا اور کبھی کبھار چلتا بھی تھا۔ لیکن کرکٹ میچوں کی فلمیں کہیں سے بھی مل نہیں سکتی تھیں کہ جاوید انہیں دیکھ کر اپنا ایکشن درست کر لیتا۔ البتہ گرمیوں کی چھٹیاں آئیں تو اس نے کمر ہمت باندھی اور وہ ایک پرائیویٹ کرکٹ کلب جائن کر کے ہاٹ ویدر کرکٹ کھیلنے لگا۔ لیکن یہاں بھی اسے تکنیکی اعتبار سے فاسٹ باؤلر کے طور پر مناسب نہیں سمجھا گیا۔ اس نے چند سینئر کھلاڑیوں کی مدد سے کافی کوشش کی لیکن بات نہ بنی۔ وہ پھر مایوس

ہوا تاہم کسی کے مشورے پر اس نے ایک ترکیب آزمائی۔ وہ لاہور چلا گیا اور مختلف کلبوں میں نامور فاسٹ باؤلروں کو پریکٹس کرتے یا میچ کھیلتے دیکھتا رہا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اس کا دل باؤلنگ کے لئے مچلنے لگتا۔ اس نے کئی بڑے نام والے باؤلروں سے مشورہ لینا چاہا تو کسی نے اسے لفٹ نہیں کرائی۔ وہ مایوس، دل گرفتہ، پنڈی واپس آ کر گھر بیٹھ گیا۔

اب ناکامی کا بھوت بڑا سا منہ کھولے جاوید کو چڑا رہا تھا۔ وہ روہانسا ہو گیا جب کوئی راہ نظر نہ آئی تو ایک دن وہ مصلے پر بیٹھی ماں کے قدموں سے جا لپٹا اور گلوگیر آواز میں کہا "ماں میرے لیے دعا کرو کہ اس کھیل میں میرا مستقبل بن جائے۔"

ماں نے ہاتھ اٹھا دیے۔ اس کا ماتھا چوما اور ایک تعویذ اس کے بازو پر باندھ دیا "جا پتر اللہ خیر کرے گا، بگڑا کام بنے گا"

گرمیوں کی چھٹیوں کے فوراً بعد کالج کی کرکٹ ٹیم نے پریکٹس شروع کر دی کیونکہ ایک ماہ بعد انٹر کالج میچوں کی سیریز شروع ہونے والی تھی۔ کوچ اور کپتان نے جاوید کو گھر سے بلا کر اس کے رن اپ اور باؤلنگ کو ایک بار پھر اچھی طرح جانچا لیکن مایوسی سے سر ہلا دیے کوچ نے اسے علیحدہ لے جا کر کہا "جاوید اب تم ایک کام کرو، ہے ذرا مشکل لیکن مجھے یقین ہے تم کر لو گے۔"

"جی حکم کیجئے"

"تم فاسٹ باؤلنگ چھوڑ کر اسپن پر آ جاؤ۔"

جاوید نے ایسا ہی کیا۔ ڈیڑھ/دو ہفتے کی پریکٹس کے بعد وہ چل نکلا۔ اس کی تیزی سے اسپن ہوتی آف بریک بال سے کالج کی اپنی ٹیم کے اچھے بیٹسمین بھی گھبرانے لگے۔ جاوید اس کامیابی پر بہت خوش ہوا اور سمجھ گیا کہ یہ ماں کی دعا اور تعویذ کا اثر ہے۔ اب وہ کھیل کے لیے جانے سے پہلے آستین چڑھا کر تعویذ کو چومتا اور ماں کے قدموں میں جھک جاتا۔ ماں اس کی بلائیں لیتی۔

انٹر کالج میچوں کی سیریز میں جاوید بشیر ہر قسم کی پچ پر کھیلا اور مخالف ٹیموں کی وکٹیں گراتا چلا گیا۔ کوئی امپائر اس کی کاٹ بی ہائینڈ اور لیگ بفور کی اپیلوں کو رد نہیں کر سکتا تھا۔ ٹیم میں مستقل

جگہ بنا لینے پر سارے ٹیم میٹ اس سے خوش تھے۔ اور اس بات پر حیران بھی کہ اس کے کھیل میں اتنی مؤثر اور مثبت تبدیلی آخر کیونکر آئی۔ مخالف ٹیموں کے خلاف مسلسل فتوحات سے اُن کے دل بڑھ گئے اور ظاہر ہے کہ اس میں جاوید بشیر کی عمدہ آف بریک باؤلنگ کا ایک بڑا حصہ تھا۔

انٹر کالج ٹرافی جیتنے پر کالج کی ٹیم اور جاوید کے نام کی دھوم مچ گئی۔ لوکل سپورٹس حلقوں، اخبارات اور ریڈیو کی مقامی خبروں میں خوب چرچے ہوئے۔ سارے کلاس فیلو اور اخباری رپورٹر اس سے پوچھتے:

''تمہاری ان کامیابیوں کی خاص وجہ کیا ہے؟'' اس کا ایک ہی جواب ہوتا ''اللہ کی مدد اور ماں کی دعا''

ایک فنکشن میں پرنسپل صاحب نے اسے شاباش دی اور تعریفی سند سے نوازا۔ وہ گھر آ کر ماں سے لپٹ گیا۔ ''ماں یہ میرا نہیں تیرا کمال ہے۔'' تعویذ اس نے آنکھوں سے لگا لیا۔ ماں سے اور دعائیں وصول کر کے اٹھ گیا۔

اپنے اچھے گیم اور اچھی شہرت کی بدولت جاوید کالج کی حدود سے آگے نکلا، پہلے ضلعی اور ڈویژنل سطح کے میچوں میں نام کمایا۔ پھر اور اوپر اٹھا تو صوبائی سطح پر آ گیا۔ اب قسمت کا ستارہ اسے دیکھ کر محض ٹمٹمانے کی بجائے چمکنے لگا تھا۔ ایک بار ویسٹ انڈیز کی ٹیم دورے پر آئی تو راولپنڈی میں ہونے والے ایک سہ روزہ میچ میں جاوید نے اپنی باؤلنگ کے جوہر دکھا کر سب کو متاثر کیا۔ یوں آتے جاتے دنوں میں اس کی کامیابیوں کی فہرست لمبی ہوتی گئی اور اب نام وری اسے قومی ٹیم کی طرف لے جا رہی تھی۔ لیکن وہ کب اور کیسے یہ اعزاز پا سکے گا یہ آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا تاہم وہ یہ بات بہ خوبی جانتا تھا کہ قومی ٹیم میں جانے کے لئے اچھی فنی مہارت ہی نہیں، تگڑی سفارش کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ کرکٹ بورڈ کے دروازے پر اچھے اچھے پلیئرز ہر وقت منڈلاتے رہتے تھے۔ لیکن موقع قسمت کے دھنی کو ملتا تھا۔

اس دوران ہم دونوں پہلے ایف اے اور پھر تھرڈ ایئر پاس کرنے کے بعد اب بی اے فائنل ایئر

میں تھے۔ جاوید کے والد ریٹائر ہو چکے تھے۔ ان کی دو نصیحتوں پر جاوید اچھی طرح کاربند تھا۔ تعلیم پر پوری توجہ اور نماز کی پابندی۔ ہم دونوں ہر جمعے کے دن شہر کی مرکزی مسجد میں بھی اکٹھے پہنچے ہوتے تھے۔ نماز کے بعد انگلش کی تھوڑی سی پڑھائی اور پھر ہم اپنے اپنے مشاغل میں مصروف ہو جاتے۔

انہی دنوں ایک اچھی خبر سننے کو ملی۔ موسم گرما میں انگلینڈ۔ پاکستان کرکٹ سیریز کا اعلان ہو گیا۔ جاوید کی آنکھوں میں امید کے دیئے روشن ہو گئے اور جب کراچی میں کرکٹ بورڈ کے تحت باصلاحیت لڑکوں کے ٹرائلز شروع ہوئے تو جاوید بھی بھاگم بھاگ وہاں جا پہنچا۔ باؤلنگ، بیٹنگ اور فیلڈنگ ان تینوں شعبوں میں اس نے سخت محنت دکھائی اور سلیکٹرز کو اپنی کارکردگی سے متاثر کیا۔ سو کل اٹھارہ ممکنہ کھلاڑیوں کی فہرست میں اُس کا نام بھی آ گیا۔ لیکن بات اسی ایک نکتے پر آ کر رک گئی "اچھی سفارش؟" چند ذرائع استعمال کر کے اس نے ٹیم کے کپتان سے رابطہ کیا۔ لیکن ایک خوب صورت وعدہ لے کر گھر واپس آیا۔ اور بے نام امیدوں کے دیئے جلا کر بیٹھ گیا۔

ایک روز ماں نے جاوید کی اجڑی صورت دیکھ کر پوچھا: "اب کیا ہوا؟" اس نے بتایا کہ انگلینڈ کے لیے اس کی ابتدائی سلیکشن ہو گئی ہے لیکن پکی بات کوئی نہیں۔ "ماں آپ دعا کرو نا بلکہ کوئی اچھا سا تعویذ بھی دو۔"

"انگلینڈ؟ کیا تُو گوریوں کے پاس جانا چاہتا ہے، بھلا کیوں؟ یہاں کیا ہے؟" ماں پریشان ہو گئی۔ "اوہ! نہیں ماں جی ایسی کوئی بات نہیں یہ میرے مستقبل کا سوال ہے۔"

"تُو میرا ایک ہی پُتر ہے، تیرا باپ بیمار اور بوڑھا، میرا بھی کوئی پتہ نہیں اور تو گوریوں سے کھیلنے کے لیے جانا چاہتا ہے؟ نہیں، کوئی دعا نہیں اور تعویذ بھی بالکل نہیں۔"

جاوید ہنسنے رونے کی سی کیفیت لیے ماں کے قدموں سے جڑ گیا اور سر جھکا لیا۔ ماں کا دل پسیج گیا "اچھا جا پُتر، اُوپر والا تجھے دیکھے گا اور تعویذ تجھے ایسا دوں گی کہ کوئی گوری تیرے پاس پھٹکے گی بھی نہیں۔" ماں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے اور جاوید کے بازو پر ایک نیا تعویذ باندھ دیا۔ وہ حوصلے کے ساتھ اٹھا اور مختلف محکموں کے چکر لگانے لگا۔ کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ٹیم انگلینڈ چلی گئی۔ جاوید

کلب کرکٹ سے اپنا مرجھایا دل بہلانے لگا۔

پاکستانی ٹیم نے ایک وارم اپ میچ کے بعد مختلف کاؤنٹیوں میں کئی سہ روزہ میچ کھیلے لیکن اچھے نتائج کے بغیر بلکہ ایک دو پلیئرز زخمی بھی ہو گئے اور پھر پہلا ٹیسٹ میچ قریب آ گیا۔ ایک روز اچانک کرکٹ بورڈ نے جاوید سے فون پر رابطہ کیا اور کہا کہ اپنا بیگ اور پاسپورٹ تیار رکھو۔ جاوید کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ ماں کو گود میں اٹھا کر گھماتا رہا۔ پھر بوقتِ وداع دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ البتہ والد خوش تھے۔ ماں نے چلتے ہوئے اُسے کہا "دیکھ پتر گوریوں سے بچ کر رہنا۔"

"ہاں ماں، ایسا ہی ہوگا۔"

انگلینڈ کے مختلف موسم اور فاسٹ پچوں کے باوجود جاوید کی باؤلنگ کا جادو چل گیا۔ مخالف ٹیم اس کی تیز اسپن باؤلنگ سے ڈرتی اور وکٹیں کھوتی رہی۔ جاوید نے اپنے لمبے قد کا فائدہ اٹھا کر آخری نمبر پر کئی بار اچھی بیٹنگ بھی کی۔ انگلش پریس اپنی ٹیم پر خوب برسا اور یقیناً یہ پاکستانی ٹیم کے لیے ایک اعزاز تھا۔ جہاں جہاں میچ ہوتے گوریوں کی ایک اچھی خاصی تعداد پاکستانی پلیئرز کا پیچھا کرتی رہی۔ خصوصاً جاوید کا سانولا سلونا رنگ اور لڑکھڑاتی انگلش میں شرمیلے انداز کی گفتگو دیکھ کر کئی گوریوں نے اسے اپنے من میں بسا لیا بلکہ ایک انگلش نژاد پاکستانی لڑکی نے اُسے شادی کی آفر بھی کی لیکن وہ محتاط تھا اور محتاط ہی رہا۔

کرکٹ بورڈ کا جاوید سے معاہدہ انگلینڈ میں ہونے والے چند میچوں تک ہی محدود تھا۔ میچوں کے اختتام پر وہ فارغ تھا۔ لندن میں مقیم ایک دو پرانے پاکستانی پلیئرز اسے مختلف کاؤنٹیوں میں لے گئے۔ آخر ویلز سے اس کا معاہدہ ہو گیا لیکن صرف تین ماہ کے لیے ایک بیمار پلیئر کی جگہ۔ اس کے لیے یہ بھی غنیمت تھا۔

جاوید سارا ہفتہ ویلز میں کھیلنے کے بعد ویک اینڈ پر لندن آ جاتا اور دریائے ٹیمز کے قریب ایک پاکستانی کے چھوٹے سے مگر آرام دہ ہوٹل میں ٹھہر جاتا۔ اس نے داخلے کے لیے لندن یونیورسٹی میں کئی چکر لگائے لیکن داخلے کا سیزن نہ تھا اور وہاں کی پڑھائی بہت مہنگی تھی۔ یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا

میں ایک نائیجیرین لڑکی سے اس کی دو تین بار ملاقات ہوئی۔ ''رجبہ'' مسلم تھی، اسلامی طرز کے لباس میں ملبوس، اچھی عادات کی مالک اور خوب صورت انگلش بولنے والی۔ اس نے جاوید کو ''کلین بولڈ'' کر دیا۔ اس طرح ''آوٹ'' ہونے پر وہ بہت خوش تھا۔ رجبہ کو جاوید اس لیے اچھا لگا کہ وہ سمارٹ پرسنلٹی والا، سیدھا سادا اور نمازی تھا۔ دونوں نے ایک ہونے میں دیر نہ لگائی۔ وطن واپسی پر رجبہ جاوید کے ساتھ تھی۔

''کیا میں نے تمھیں منع نہ کیا تھا؟'' ماں نے جاوید کو گلے لگایا، پیار کیا اور تھپڑ بھی لگا دیا۔

''ہاں ماں مگر تم نے گوریوں سے بچنے کا کہا تھا اور تعویذ بھی دیا تھا۔ اس تعویذ نے کام نہیں کیا کیوں کہ یہ گوری نہیں ہے'' جاوید مسکرایا۔ ''جھوٹا کہیں کا! یوں کیوں نہیں کہتا کہ تو نے اسے پسند کیا ہے۔'' ماں بھی مسکرائی۔ ''اور تیری یہ پسند اب ہماری بھی پسند ہے۔'' جاوید کے والد کا اعلان۔

*****

ادارہ

فروغ اردو کے لیے یونیورسٹی آف واشنگٹن کا کلیدی کردار

ریاست واشنگٹن میں سیاٹل شہر کو ادبی و ثقافتی سرگرمیوں کے اعتبار سے ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ہر چند کہ یہاں بہت سی انجمنیں اپنی اپنی ثقافت کا پرچم بلند رکھنے کے لیے بہت فعال کردار ادا کر رہی ہیں، لیکن اس شہر کی سب سے ممتاز اور اس ملک کی قدیم و اعلیٰ تعلیمی درسگاہ یونیورسٹی آف واشنگٹن کے شعبۂ اردو کو یہ قابل ستائش امتیاز حاصل ہے کہ اس نے گذشتہ تین دہائیوں میں اردو زبان و ادب کی تدریس و فروغ میں ناقابل فراموش اور لائق تقلید خدمات انجام دی ہیں اور یہ سفر اپنی مثالی آب و تاب کے ساتھ جاری ہے اور شعبۂ اردو کے لائق اساتذہ کے زیر سایہ ان شاء اللہ جاری و ساری رہے گا۔ شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر جمیل احمد اور ان کی اہلیہ ڈاکٹر جینیفر ڈوبرو کا مثالی جوڑا جنھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے کی امتیازی اسناد حاصل کرنے اور یونیورسٹی آف واشنگٹن سے اردو میں ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد دونوں اساتذہ نے اسی نامور درسگاہ کو اپنی تدریسی کاوش کے لیئے انتخاب کیا۔ یہ ان کی بے پناہ محنت کا ثمر ہے کہ ان کے زیر سایہ ان کا شعبہ اس قدر مقبول ہوگیا ہے کہ امریکہ کی دوسری ریاستوں سے بھی طلبا و طالبات اردو کی تعلیم حاصل کرنے کے لیئے اس درسگاہ کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ ان کے شعبہ میں تشنگان اردو کی تعداد چالیس (۴۰) تک پہنچ چکی ہے جو دوسری امریکی درسگاہوں کے مقابلہ میں ایک امتیازی تعداد ہے۔ سیاٹل اور اس کے اطراف کے شہروں میں جو ارض ہندو پاک سے تارکین وطن آباد ہیں ان کو اپنی زبان اور شعر و ادب سے رشتہ استوار رکھنے کے لیے شعبۂ اردو گاہے بگاہے ادبی نشستوں کا انعقاد کرتا ہے جس میں ملحقہ شہروں کے علاوہ سرحد پار کینڈا سے بھی ادیب، شعرا اور دانشور اپنی تخلیقات پیش کرتے اور سامعین سے داد و تحسین حاصل کرنے کے

لیے شرکت کرتے ہیں۔ ایسی نشستوں کی ہر دلعزیزی اور پسندیدگی کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ فریفتگانِ شعر و ادب اب اپنے اپنے گھروں پر بھی ایسی محفلیں سجانے لگے ہیں جہاں ڈاکٹر جمیل احمد اور ڈاکٹر جینیفر ڈوبرو مہمانِ خصوصی ہوتے ہیں۔ اردو زبان کی شیرینی نے امریکی طلبا و طالبات کو اپنے سحر میں اس طرح گرفتار کیا ہے کہ وہ بھی اردو میں طبع آزمائی کرنے اور عشاقانِ اردو کے شانہ بشانہ کھڑے نظر آتے ہیں قابلِ مبارکباد ہے یہ درسگاہ اس کا شعبۂ اردو اس کے مثالی اساتذہ اور ہونہار طلبا و طالبات۔

موجودہ حوصلہ افزا حالات کو دیکھتے ہوئے ہم صدر شعبۂ اردو پروفیسر ڈاکٹر جمیل احمد کو یہ خصوصی تجویز دینا چاہیں گے کہ شعبۂ اردو کے زیرِ اہتمام ایک علمی و ادبی مجلّہ کا اجراء کیا جائے جس میں شعبہ کی مجلسی سرگرمیوں پر تفصیلاً اظہارِ خیال کیا جائے جو یقیناً طلبا و طالبات کے لیے مزید حوصلہ افزائی کا سبب بنے گا۔ اُن کی نگارشات کی اشاعت بھی علمی و ادبی تحقیق اور مذاقِ سخن کے فروغ میں مددگار ہو سکے گی۔ ہمیں اُمید ہے کہ اس تجویز کو زیرِ غور لایا جائے گا۔ شکریہ !

نورین طلعت عروبہ

حمد

خوف کیسا مرے مولا کہ نگہبان ہے تُو
ہم خطار کار ہیں اور مشفق و رحمان ہے تُو

زخم کے ساتھ ہی مرہم بھی عطا کرتا ہے
کیسے کہہ دوں کہ مرے حال سے انجان ہے تُو

تجھ میں اے دل جو یہ توحید کی رعنائی ہے
کون کہتا ہے تجھے بے سروسامان ہے تُو

مُقتدِر تُو ہے، مقدم بھی، اَحد بھی تُو ہے
آپ ہی اپنی بڑی شان کے شایان ہے تُو

تیری رحمت کہ کبھی ہم سے جُدا ہوتی نہیں
ساتھ رہتی ہے بہر وقت کہ رحمان ہے تُو

ذرّے ذرّے میں نمایاں ہے نشانی تیری
ساری دنیا کی حکایات کا عُنوان ہے تُو

ہم اسے دل میں بساتے ہیں اسے چُومتے ہیں
تیری کیا بات ہے خُود خالقِ قرآن ہے تُو

حمد

دل نوکِ قلم پر ہو تُجھے جان سے لکھوں
اے رب مَیں ترے نام کو اس شان سے لکھوں

چاہوں بھی الفاظ تری شان کے شایاں
ہر بار تجھے اک نئے ارمان سے لکھوں

بولوں تو ترے اذن سے ہر بات ہو ممکن
لکھوں تو مرے رب ترے احسان سے لکھوں

جب چاہوں تری نعتیں کاغذ پہ رقم ہوں
مَس کر کے اسے سُورۂ رحمٰن سے لکھوں

اِس رحمتِ بے پایاں پہ جو شکر ہو، کم ہے
جو کچھ بھی لکھوں بس ترے فیضان سے لکھوں

ہر لفظ میں ہو تیری رضاؤں کا خزینہ
ہر طرح سے کامل ہو جو ایمان سے لکھوں

کر اس میں اضافہ کہ مرا علم ہو ایسا
کوئی بھی حوالہ ہو مَیں قرآن سے لکھوں

عرش ہاشمی

نعت

سارے رنج و غم اپنے اِس طرح مٹا لینا
مدحِ سرورؐ دیں کی محفلیں سجا لینا

لب پہ نام آتے ہی سر وہیں جھکا لینا
کاش ہم کو آجائے نامِ مصطفےٰؐ لینا

آپؐ جب کہ مومن کی جان سے بھی اَولیٰ ہیں
پھر ہمیں غرض کیسی پھر کسی سے کیا لینا

موت جب مجھے آئے، اُس سے قبل ممکن ہو
در پہ حاضری دے کر نعت اک سنا لینا

نزع کا جو وقت آئے مجھ پہ اے مرے سرورؐ
اُس گھڑی بھٹکنے سے تم مجھے بچا لینا

اِک خیال آتے ہی کچھ خلش نہیں رہتی
ہم مرے تو ہوں گے ہی آپؐ کے حوالے نا!

عرش پر کرم آقا! دو ہی کام ہوں اس سے
نعت آپؐ کی لکھنا، نام آپؐ کا لینا

حسن عسکری کاظمی

نعت

ہم ہیں محتاجِ ہدایت، ہادی و رہبر ہیں آپؐ
عالمِ امکاں کی ہر مخلوق سے برتر ہیں آپؐ

آپؐ کو بھیجا بنا کر رحمت اللعالمیں!
نعمتِ عظمیٰ، سراپا خُلق کا پیکر ہیں آپؐ

رفعتِ کونین کا حاصل ہے معراجِ نبیؐ
کائناتِ حُسن میں اب دائمی سرور ہیں آپؐ

آپؐ کی اُمت ہوئی حرماں نصیبی کا ہدف
عہدِ بے تعبیر میں اب مونس و یاور ہیں آپؐ

المدد! اے غمگسارِ کلمہ گو یانِ وفا
ہم سپر انداختہ اور ناصر و صفدر ہیں آپؐ

دی دیجیے ہم کو اماں ہم ہیں مسلماں یا نبیؐ
بے بصر، بے مایہ ہم ہیں اور دیدہ ور ہیں آپؐ

پروفیسر زہیر کنجاہی

مہرِ حرا

اُداس بے روح موسموں کے اُداس لمحے
ہوا کے ہونٹوں پر سسکیاں تھیں
فضا سے چیخیں اُبھر رہی تھیں
مہیب ظلمت نے ساری دُنیا پر اپنے شہپر
سیاہ شہپر ۔۔۔ کچھ ایسے پھیلائے تھے کہ توبہ
سیاہ راہوں پہ روحِ انساں بھٹک رہی تھی
یہ سرد، بے روح موسموں کے اُداس لمحے
ہزاروں صدیوں سے فکرِ انساں کو ڈس رہے تھے
فضا نے انگڑائی لی اچانک
ہوا کی سرگوشیوں نے اِنساں کو مژدۂ جاں فزا سنایا
صفا و فاراں کی چوٹیوں سے
بدلتے موسم کی صُبحِ نو کا
ہوا طلوع اِک مہرِ تاباں ☆
حرا سے اُبھرا نیا سویرا

اُفق اُفق جس سے جگمگایا
نبیؐ وہ آیا
جو ساتھ اپنے کتاب لایا
کہ جس کی طلعت نے روحِ انساں کو اِک نئی زندگی
عطا کی
اُداس بے روح موسموں کے اُداس لمحے ہوا ہوئے
اور
دل و دماغِ بشر کہ صدیوں سے ظلمتوں میں گھرے
ہوئے تھے
اسیرِ زُلفِ بُتان و وہم و گماں تھے
یک دم رہا ہوئے سب
سلام اُس صبحِ آگہی پر
سلام اُس آخری نبیؐ پر

☆ یہ سطر نظر ثانی چاہتی ہے (ادارہ)

عطاء الرحمٰن قاضی

○

کون یہ شام ڈھلے نغمہ سرا ہونے لگا
دل وارستہ، گرفتار ہوا ہونے لگا

دیدنی تھی کفِ احساس پہ خوشبو کی پھوار
جاگ اٹھے رنگ تو وابندِ قبا ہونے لگا

ایک عالم تھا سرِ خلوتِ جاں، رات گئے
سجدۂ شوق جو یاروں سے ادا ہونے لگا

بھول جاؤں نہ کہیں نام بھی تیرا، ڈر ہے
عکس تو آئینۂ دل سے جدا ہونے لگا

لپک اک کر کے بجھ جاتے ہیں کئی سارے چراغ
وحشتا اہلِ تمنا کو یہ کیا ہونے لگا

خاک پھر اڑنے لگی معبدِ جاں میں ہر سُو
چاک پھر پیرہنِ برگِ دعا ہونے لگا

تیر سینے میں جو پیوست ہُوا، خوب ہُوا
دید وا دید کا سامان، عطا ہونے لگا

○

اسیرِ لمحۂ تشکیک ہے، اِدھر مت آ
ہر ایک دل، یہاں تاریک ہے اِدھر مت آ

دھڑک رہا ہے ہر اک دل کسی اشارے پہ
ہر ایک سانس یہاں بھیک ہے اِدھر مت آ

کھلا نہ پھول کسی شاخ پر، ہوائے بہار!
کہ حالِ دل زدگاں ٹھیک ہے اِدھر مت آ

اب اُس کی زلفِ پریشاں کو کون سلجھائے
یہاں تو حرص کی تحریک ہے اِدھر مت آ

یہ شہرِ کم نگہاں ہے قدم قدم پہ یہاں
ہر اہلِ درد کی تضحیک ہے اِدھر مت آ

چراغِ شامِ تمنا کی خیر ہو کہ یہ دل
ہوائے مرگ کی تملیک ہے اِدھر مت آ

عطا یہ لمحۂ پرّاں تجھے خبر ہی نہیں
پھر اک سراب کے نزدیک ہے اِدھر مت آ

محمد طارق غازی (کینیڈا)

○

اُدھر اک مجلسِ اہلِ غلو ہے
بحمداللہ وہاں میں ہوں نہ تو ہے

نفاق، انکار، دھوکہ، خود فریبی
سپر میری مگر لاتقنطو ہے

ہے پھر پیشِ نظر دیوانِ حافظ
نشہ ہے دل کو، آنکھوں میں سبو ہے

یہاں ماضی میں مستقبل ہے پنہاں
یہی اسلام کا رمزِ نمو ہے

جدھر روزانہ سورج ڈوبتا ہے
اُدھر کیسا اندھیرا کو بکو ہے

ہیں اس کے چیلے سب چنگیز دوراں
رئیسِ جاہلیت تند خو ہے

بلالؓ و آلِ یاسرؓ کا زمانہ
پلٹ کر پھر تمہارے روبرو ہے

ولی اللہ نے چھیڑا تھا جس کو☆
ادھوری آج تک وہ گفتگو ہے

یہ نکتہ لکھ دیا نانوتویؒ نے☆
فقط سیف و قلم سے آبرو ہے

امام آئے تو اٹھے گا مؤذن
یہ اُمت سر بکف ہے، باوضو ہے

ہنائے انقلاب قریہ قریہ
یہی بحران ہے جو کو بکو ہے

مسائل اب مصائب بن رہے ہیں
جہاں میں جس کو دیکھو گرم رو ہے

غذا تک بن گئی مالِ غنیمت
معیشت آج کتنی جنگجو ہے

بڑا رتبہ ہے چشمِ بحر و یم کا
مری آنکھوں میں بھی اک آبجو ہے

ترے در تک اگر میں آگیا ہوں
تو یارب یہ کمالِ جستجو ہے

ابھی اک نام آیا تھا زباں پر
مشامِ دل میں رقصِ مشکبو ہے

تری شیشہ گری کا حسن ہے سب
جدھر دیکھو اُدھر بس تُو ہی تو ہے

فرشتوں کو ہٹاؤ درمیاں سے
تمنا جس کی تھی وہ رو برو ہے

بس اک خوبی ہے اس اُمت کی طارق
کروڑوں دل، فقط اک آرزو ہے

☆ شاہ ولی اللہ دہلوی/ حجۃ اللہ البالغۃ/ مولانا محمد قاسم نانوتوی، بانی دارالعلوم دیوبند

انور جہاں برنی (ورجینیا) امریکہ

○

دل کے احوال جب سنائے ہیں
آپ سن سن کے مسکرائے ہیں

موت نے جب گلے لگا ہی لیا
کیوں بھلا آج آپ آئے ہیں

ضبط نے بڑھ کے ان کو تھام لیا
جب بھی آنسو پلک تک آئے ہیں

زندگی ہم نے تیری راہوں پر
کیسے کیسے فریب کھائے ہیں

آپ آئے نہیں تو پلکوں پر
ہم نے شب بھر دیے جلائے ہیں

شاہ راہِ حیات پر اے دل
کیسی مایوسیوں کے سائے ہیں

ناوکِ افگن کہیں نہ ہو بدنام
ہم نے ہنس ہنس کے تیر کھائے ہیں

عالمِ رنگ و بو میں اے انور
کون اپنا ہے؟ سب پرائے ہیں

○

صبوحِ حسن سے لی ہے جو انگبیں میں نے
بنا لیا ہے تصور کو آتشیں میں نے

جنونِ بندگیِ عشق کفر تک پہنچا
نقوشِ پا پہ جھکائی جہاں جبیں میں نے

ہے کائنات میں کیا کہہ سکوں جسے اپنا
بس ایک دل تھا جسے کھو دیا کہیں میں نے

مرے غموں کے لیے چارہ گر نہ سوچ علاج
چنا یہ زیست کا سرمایۂ حسیں میں نے

دکھا کے آئینۂ حسنِ یار و جلوۂ دوست
رخِ حیات کی زلفیں سنوار لیں میں نے

سحر وہ کونسی ہے جس کے انتظار میں ہوں
اسی خیال میں راتیں گزار دیں میں نے

تجلیات کی رو میں حقیقتوں سے پرے
بنائی گنبدِ افلاک پر زمیں میں نے

یہ کس کا غم ہے کہ ہر غم سے بڑھ گیا انور
لٹانے کس کے لیے آج عقل و دیں میں نے

امین راحت چغتائی

○

اپنی مٹی میں اب نم نہیں صاحبو
یہ سزا بھی کوئی کم نہیں صاحبو

کیوں دکھائی نہ دیں اُن کو ہم کیا کہیں
روشنی اتنی بھی کم نہیں صاحبو

ڈھونڈتے کیا ہو ساحل پہ کوئی صدف
آج لہروں میں دم خم نہیں صاحبو

دار کی شاخ تو سرخرو ہو گئی
زندگی کا کوئی غم نہیں صاحبو

تیغِ الفاظ کی نوک پہ ہم رہے
یہ عنایت بھی کچھ کم نہیں صاحبو

آؤ تقدیر سے کوئی ٹکر تو لیں
وہ نہیں اب کے یا ہم نہیں صاحبو

کس نے اندیشۂ بام رخصت کیا
یوں تو راحت بھی کچھ کم نہیں صاحبو

○

کب سے حیران کھڑے ہیں کہ کدھر کو چلیے
کوئی کہتا ہے اِدھر کوئی اُدھر کو چلیے

راہ میں خارِ مغیلاں بھی ملیں گے لیکن
چشم وا ہو تو نہیں فکر جدھر کو چلیے

شمع گل دیکھ کے چلتے بنے پروانے بھی
خاک اڑنے کو ہے اب آیئے گھر کو چلیے

سر سرِ دار نہیں ہے تو کرم ہے اُن کا
وہ جدھر جاتے ہیں چپ چاپ اُدھر کو چلیے

یوں سرِ عام جو کہنا ہو، وہ کہیے، کہیے
پھر ہتھیلی پہ اٹھائے ہوئے سر کو چلیے

یہ بھی کیا شہر، سرِ صبح اندھیرا چھا جائے
ہر کوئی پوچھتا پھرتا ہے کدھر کو چلیے

مل ہی جائے گا نشاں اپنی گلی کا راحت
جس طرف کوئی نہ جاتا ہو اُدھر کو چلیے

ضامن جعفری (کینیڈا)

○

شکستہ دل ہیں تو چہرے پہ غم تو ہوگا نا!
لبوں پہ آہ اور آنکھوں میں نم تو ہوگا نا!

بڑھا ہوا ہے بہت درد آ کے دیکھ تو لو!
گیا بھی نہ تو کم از کم یہ کم تو ہوگا نا!

چلو یہ مان لیا احتیاط بہتر ہے
عدم توجہی لیکن ستم تو ہوگا نا!

گر اب پہنچ بھی گیا مژدۂ وصال تو کیا!
مریضِ ہجر کا ہونٹوں پہ دم تو ہوگا نا!

ہجومِ یاس میں یک دم یہ جلوہ آرائی
حواس و ہوش کا یک لخت رَم تو ہوگا نا!

پہنچ ہی جائے گا خوں میرا اُن کے داماں تک
قدم قدم پہ وہ نقشِ قدم تو ہوگا نا!

دیارِ کذب میں حق گوئی! کیا کیا ضامن؟
یہ قتلِ کذب ہے، اب سر قلم تو ہوگا نا

ڈاکٹر قاسم جلال

○

سوچوں سے دماغ جل رہا ہے
صہبا سے، ایاغ جل رہا ہے

سینے میں یہ داغ جل رہا ہے
یا کوئی چراغ جل رہا ہے

سینچا تھا جو باغباں نے خوں سے
آج آہ! وہ باغ جل رہا ہے

اشکوں نے لگائی آگ دل کو
برسات میں راغ جل رہا ہے

آؤ! اسے آئینہ دکھائیں
بلبل سے جو زاغ جل رہا ہے

رُک رُک کے قدم اُٹھا رہا ہوں
بجھ بجھ کے چراغ جل رہا ہے

کل سایہ فشاں جلال تھا جو
وہ نخلِ فراغ، جل رہا ہے

حسن عسکری کاظمی

○

بے سبب ہجر کے قیام کا غم کرتا ہے
خواہشِ مرگِ مسلسل کو بھی کم کرتا ہے

فرصتِ گریہ کسے اور کہاں کا نوحہ
پردۂ شب میں مگر آنکھ کو نم کرتا ہے

بے وضو رہنا کسی طور گوارا ہی نہیں
دیدہ و دل کو اگر صحنِ حرم کرتا ہے

اب یقیں اپنی وفاؤں کا دلاتا ہے اسے
اپنا سر تیغ دو دم ہی سے قلم کرتا ہے

افقِ وقت پہ دیکھے گا زمانہ جس کو
نصب ایسی ہی بلندی پہ علم کرتا ہے

دامنِ دل میں کہاں اتنی جگہ ہے پھر بھی
اپنے ناکردہ گناہوں کو بہم کرتا ہے

مٹ ہی جائے گا حسن نقشِ دوئی بھی اک دن
قُل ھو اللہ احد سینے پہ دم کرتا ہے

○

جب تک رہے گی جنگ یہاں اختیار کی
کوئی نہیں سنے گا دلِ بے قرار کی

ہمسائیگی میں ہم نے عدو سے اٹھائے دکھ
قائم کبھی ہوئی نہ فضا اعتبار کی

عہدِ خزاں کو ختم تو ہونا ہے ایک دن
چلنے کو ہیں چمن میں ہوائیں بہار کی

ہم پر زمیں نے اپنے خزانے اُگل دیے
کیا کچھ نوازشیں ہوئیں پروردگار کی

ہم سے نہ ہو سکا لب و رخسار کا بیاں
صورت وہی رہی ہے غمِ روزگار کی

سنتے رہے ہیں قصے عروج و زوال کے
جاری رہیں گی گردشیں لیل و نہار کی

کم حوصلہ ہے سوہنی اِس دور کی حسنؔ
پایاب دیکھ کر بھی تو ندی نہ پار کی

صابر عظیم آبادی

O

نہ پوچھ مجھ سے مرے دل پہ کیا گزرتی ہے
بڑے ہی کرب میں شام بلا گزرتی ہے

دل و نگاہ میں ہوتا ہے زلزلہ پیدا
چمک کے جب تری برق ادا گزرتی ہے

ذرا خلوص و وفا سے بھی کام لو کہ مجھے
گراں بہت ہی تمہاری جفا گزرتی ہے

تمام راستے خوشبو میں ڈوب جاتے ہیں
ترا پیام لیے جب صبا گزرتی ہے

یہ اور بات ہے ہم دیکھتے نہیں ورنہ
نظر سے تیری تجلی سدا گزرتی ہے

نصیب ہوتی ہے جس کو خوشی زمانے کی
اُسی کے سر سے الم کی گھٹا گزرتی ہے

ہم اپنے درد کے زنداں میں بند رہتے ہیں
"کسے خبر پسِ دیوار کیا گزرتی ہے"

زمیں ہو کہ خلاؤں میں راستہ کوئی
ہر اک مقام سے خلقِ خدا گزرتی ہے

وہ عمر، عمر نہیں حادثہ ہے اے صابر
کسی کے پیار میں جو بے مزا گزرتی ہے

نسیم سحر

O

سیارگان اب کے عجب زاویے پہ ہیں
نزدیک لگ رہے ہیں، مگر فاصلے پہ ہیں

زندہ جو ہوں ابھی تو یہ میرا کمال ہے
حیران سارے لوگ مرے حوصلے پہ ہیں

خود اپنے خد و خال کوئی دیکھتا نہیں
الزام جس قدر بھی ہیں سب آئینے پہ ہیں

زندہ دکھائی دے تو رہے ہیں اگرچہ ہم
سچ یہ ہے زندگی سے بڑے فاصلے پہ ہیں

نظریں ہماری ایک زمانے سے مرتکز
نقطے میں جو چھپا ہے اُسی دائرے پہ ہیں

وہ مسئلہ تو دیر ہوئی حل بھی ہو چکا
اُلجھے ہوئے ہم آج بھی جس مسئلے پہ ہیں

اتنی ریاضتوں سے یہ عقدہ بھی حل ہوا
جو لوگ راستے پہ نہیں، راستے پہ ہیں!

ترکِ تعلقات کا امکاں بھی ہے بہت
خود سے تعلقات اب اُس مرحلے پہ ہیں

کچی محبتوں کے سفر آج بھی نسیم
پانی کی سرکشی میں ہیں، کچے گھڑے پہ ہیں

انور شعور

O

لوگ جو ذات سے اُوپر نہیں اُٹھتے اپنی
کبھی اوقات سے اُوپر نہیں اُٹھتے اپنی

ہم رقیبوں کو بٹھاتے ہیں برابر اپنے
اور وہ گھات سے اُوپر نہیں اُٹھتے اپنی

ذہن رکھتے ہیں رسا اہلِ ہوس بھی لیکن
سطحِ جذبات سے اُوپر نہیں اُٹھتے اپنی

جیت یا مات نہیں بھولتے لڑنے والے
جیت سے، مات سے اُوپر نہیں اُٹھتے اپنی

شیخ صاحب ہمیں کرتے ہیں نصیحت کیا کیا
خود خرافات سے اُوپر نہیں اُٹھتے اپنی

جائیں گے ہم سرِ مرّیخ پہ بھی جام بکف
رند عادات سے اُوپر نہیں اُٹھتے اپنی

کچھ نہیں دیکھتے خوابوں کے سوا آپ شعور
دن کو بھی رات سے اُوپر نہیں اُٹھتے اپنی

سلیم زاہد صدیقی

O

یہ بات سچ ہے کہ ہم اس کی چاہ رکھتے ہیں
شدید رکھتے ہیں اور بے پناہ رکھتے ہیں

تمہارے خیر کی ملتی رہی خبر ہم کو
کہ ہم رقیب سے بھی رسم و راہ رکھتے ہیں

نہ ہوں گے شیخ جی تائب کبھی گناہوں سے
وہ ہر گناہ کا عذرِ گناہ رکھتے ہیں

گزر کے آئے ہیں ہم آگ کے سمندر سے
ہم اپنی چاہ کا مثبت گواہ رکھتے ہیں

نہیں پہنچتے ہیں ان تک مصائب و آلام
جو میکدے کی سی جائے پناہ رکھتے ہیں

زباں سے کہتے ہیں، ہم پہ یقین ہے ان کو
مگر وہ دل میں ابھی اشتباہ رکھتے ہیں

کوئی جو سیکھے تو آدابِ میکشی سکھلائیں
ہم اپنی ذات میں اک درسگاہ رکھتے ہیں

صوفیہ انجم تاج (امریکہ)

○

وہ طاق وہ چھت وہ محرابیں وہ گھر وہ عمارت مانگے ہے
انگنائی میں بیلے جوہی کی خوشبو کی طراوت مانگے ہے

وہ ٹھنڈی ہوا وہ پگڈنڈی سبزے کی لہک وہ ہریالی
اور شام کی ہلکی خنکی میں جگنو کی حرارت مانگے ہے

اس رنگ برنگے موسم میں کچھ اور نہیں مانگے ہے یہ دل
ہاں ان کی چشم محبت کی تھوڑی سی عنایت مانگے ہے

ہر ایک نظر میں ہر دل میں آزادی کی پریاں رقصاں ہیں
تتلی جو ہے میری چنکی کی اڑنے کی اجازت مانگے ہے

اس شہر میں کیا کیا جگ مگ ہے لیکن یہ سادہ دل میرا
کلیوں کی کہانی چاہے ہے پھولوں کی حکایت مانگے ہے

ہو نیم کا ایک چھتنار درخت اور سائے میں اس کے سبزے ہوں
اور سبزے کی نرمی پہ یہ دل سونے کی اجازت مانگے ہے

جن لفظوں کو میں نے بچپن میں گہنے کی طرح پہنا انجم
ہر لفظ مرے ہر گہنے کا اس دور سے قیمت مانگے ہے

حسن چشتی

○

دن ہی نہیں حریں تو پھر خواب میں کوئی آئے کیوں
راہِ طلب میں جو نہ ہو تیری گلی میں جائے کیوں

درد بھی ہے عروج پر رات بھی کچھ طویل ہے
ایسے میں نیند آئے کیوں، یاد تری بھلائے کیوں

اس کے فراق کی سزا، اشکوں میں ڈھل کے رہ گئی
ایسے میں اس کی بے رُخی وحشتِ دل بڑھائے کیوں

ہم ہی چلے تھے چھوڑ کر محفلِ جانِ دوستاں
اُن کی گلی کا راستہ، کوئی ہمیں بتائے کیوں

تیری نگاہِ ناز ہی ، ہوگئی بے نیاز جب
مطربِ اشکبار پھر نغمۂ شوق گائے کیوں

چھوڑ کے اس کا آستاں، خود ہی تو در بدر ہوا
کاہے کو رو رہے ہے حسنؔ، کرتا ہے ہائے ہائے کیوں

رشید آفرین

○

ہوئی نہ بزمِ خرد جن کے دل کو وجہ سکوں
سجا کے بیٹھ گئے ہیں فضائے دشتِ جنوں

یہ کیا مقام ہے حیراں ہوں سحر ہے کہ فسوں
کسی کا سر ہے قلم اور کسی کا سر ہے نگوں

کبھی اُفق پہ یہ خورشید بن کے چمکے گا
ردائے وقت پہ ٹپکا ہے جو حیات کا خوں

یہ کم نگاہیٔ دوراں ہے اور کچھ بھی نہیں
جو اہلِ دل ہیں جہاں میں وہ سب ہیں خوار و زبوں

خلوص و مہر و وفا کا ہے آفریںؔ مظہر
وہ دل کہ جس کو خدا نے دیا ہے سوزِ دروں

اویس الحسن

⦿

یہ کس ادا سے چمن سے بہار گزری ہے
سلگ سلگ کے تمنا ہزار گزری ہے

حیات دل کی جو اک شب شمار کر بھی لوں
وہ ایک شب ہی بہت بے قرار گزری ہے

اڑا کے لے جو گئی دل کی سسکیاں بلبل
بھرے چمن پہ قیامت ہزار گزری ہے

صبا نے چھو جو لیا خوشبوؤں کے آنچل کو
جبینِ گل پہ شکن ناگوار گزری ہے

یہ کس مقام پہ پہنچی ہے جستجو دل کی
وصال رُت تھی مگر سوگوار گزری ہے

افتخار یوسف

⦿

یہ زندگی تھی سفر، جادۂ سفر مرے خواب
تباہیوں کا سبب، قصہ مختصر مرے خواب

غموں کی سوچ اُڑا لے گئی ہے نیند مری
اسی لیے تو ادھورے ہیں بیشتر مرے خواب

بچا بچا کے میں رکھتا ہوں پھر بھی ڈرتا ہوں
ہوائے وقت نہ کر دے اِدھر اُدھر مرے خواب

کسی کی نیند بھی ٹوٹے کبھی خدا نہ کرے
کہ جیسے ٹوٹ کے بکھرے ہیں عمر بھر مرے خواب

میں سینچتا ہی رہا اپنے خون سے یوسف
رہے وہی کے وہی نخلِ بے ثمر مرے خواب

ڈاکٹر جمیل احمد (سیاٹل) امریکہ

O

اس کے آنے کی ایک خبر سی ہے
میری راتوں میں اک سحر سی ہے

ناخدا کشتیاں تو پار اتریں
دل کی حالت یہ کیوں بھنور سی ہے

آپ ہیں اب تو ہمقدم ہے بہار
فصلِ گل ورنہ مختصر سی ہے

ہجر کی رُت میں پھیر صدیوں کا
وصل کی شب کہ مختصر سی ہے

جانے کیوں مجھ سے وہ خفا ہیں جمیل
بات میری تو بے ضرر سی ہے

O

بات خوشبو کی بات پھولوں کی
بات ساون کی بات جھولوں کی

عمر کے اک پڑاؤ پہ آکر
بات ماضی کی بات بھولوں کی

اس نئے دور میں مرے ہمدم
بات کرتے ہیں ہم اصولوں کی

لمس کی آنچ بھی نہ سہہ پایا
بات کرتا تھا جو بگولوں کی

خود کو کانٹوں میں کر لیا محبوس
ہائے مجبوریاں ببولوں کی

نازیہ خلیل عباسی

درد غم فراق کا درماں نہ کیجئے
اب دل میں آکے دل کو پریشاں نہ کیجئے

تاروں کو ہم شبی کا اگر چہ ملے شرف
مژگانِ دل کو اس طرح ویراں نہ کیجئے

گرچہ دلِ حزیں کی تڑپ بھی غضب کی تھی
کہنے لگے کہ اس کا تو ارماں نہ کیجئے

لطفِ غمِ حیات کا باعث بھی زلف تھی
کیسے کہوں کہ اس کو پریشاں نہ کیجئے

مجھ کو تو اپنے پاؤں کے چھالوں سے پیار ہے
اس منزلِ حیات کو آساں نہ کیجئے

نگہت زیبا

وہ سکونِ دل کہ اب گرداب جاں ہو جائے گا
آگ کا اک پھول پانی پر رواں ہو جائے گا

خشک آنکھوں میں اترتا ہے کوئی عکسِ قدیم
ان نگاہوں میں کوئی منظر عیاں ہو جائے گا

نیند کی دیوی جگا دیتی ہے اس کے خواب میں
خواب کا یہ رنگ زیبِ داستاں ہو جائے گا

شام ہوتے ہی مرا دل ڈوبنے لگتا ہے کیوں
کچھ اگر ہوگا تو بس یوں ناگہاں ہو جائے گا

چھپتی ہی جاتی ہے نگہت منزلوں کی گرد میں
زندگی کا یہ سفر کیا رائیگاں ہو جائے گا

محمد اویس جعفری ۔ سیاٹل (امریکہ)

(ایک بھائی کا بہن کو خراجِ تحسین و عقیدت)

سراپا

گر تخیل، تصور تعاون کریں
اور قلم ترجمانی پہ آمادہ ہو
تو پھر میں کروں
فکر تشبیہ و تلمیح
اور استعارے چنوں
دل یہ کہتا ہے پھر اک سراپا لکھوں
جس کا طاری ہے مجھ پر ابھی سے فسوں

میرے معبود و مطلوب و مقصود
میرے خدا!
تو ازل تو ابد تو مرا منتہا
دے اجازت تو اُس کو صحیفہ کہوں
اور لکھوں:
اُس کے بالوں پہ چھٹکی ہوئی چاندنی
رقص کرنوں کا یا اوجِ کہسار پر
اور سیپارہ جیسی منور جبیں
جس پہ تحریر ہیں صبر کی آیتیں
بندگی کے نشاں

اُس کی آنکھوں میں فکرِ رسا کی جھلک
شفقت اور پیار کی، چاہتوں کی دمک
اس کے دامن سے آئے گلوں کی مہک

صبح صادق فدا اس کے رخسار پر
ابر پارہ کوئی جیسے سایہ فگن
روئے گلزار پر

اس کے لب رحل ہیں
جن سے آیاتِ قرآن کے زمزمے
دم بدم گل فشاں
اور سجائے ہوئے حمد کے نعت کے ارمغاں
اس کے لب نغمہ خواں
وہ ہے جادو بیاں

اس کی مخروطی انگلیوں کی روش
اُس کی آغوش میں رکھنا تسبیح کو
جس کے دانوں پہ بس ذکر و اذکار ہیں
روز و شب، صبح و شام
انگلیاں جو کہ ہیں
خانہ داری کی تاریخ کے مرحلوں کی امیں

پور دے جن کے ہیں
گھر گرہستی کے ہر کام کے رازدار
خوانِ انواع و اقسام کے شاہکار
منحصر جن پہ کام و دہن کا خمار

ہیں سبھی انگلیاں اُن کی تخلیق کار
کیا ہو ان کا شمار
جن کی باتیں ہزار

سر کی شال شانوں کی ہے پردہ دار
حسنِ تہذیب و توقیر کی پاس دار
اور پھر اس پہ رنگِ حیا کا نکھار
جس پہ سو جاں سے پاکیزگی خود نثار

طنز و تشنیع، کذب اور مکر و ریا
جیسے اِن کا نہیں دور کا بھی کہیں اُس سے کچھ واسطہ
وہ فرشتہ نہیں پر فرشتہ صفت
کوئی اپنا ہو یا غیر ہو یا عدو
اس کو محبوب ہے سب کی ہی منفعت

حسنِ نیت پہ اس کے عمل کا مدار
اس کی رفتار میں تمکنت
اس کی گفتار میں شہد ہے
اس کی آواز میں ساحری
اس کے انداز میں دلبری

فون پر گفتگو ہو کہ ہو رُو برُو
نرم رُو، نرم خُو
اس کا لہجہ کہ جیسے خنک آبِ جو
وہ تو چاہت ہی چاہت ہے بس
جیسے ماں کی دعا ہر نفس
اس کی باتوں میں شفقت کا رس

زندگی کے حقائق پہ اس کی نظر
اس کو سب علم ہے اور وہ ہے باخبر

حادثوں سے ہے پُر زندگی کی ڈگر
چھوٹ جاتا بھی ہے راہ میں ہمسفر
امتحان، آزمائش سے کس کو مفر
درد و غم کا وہی ہے بس اک چارہ گر
وہ جو اوّل بھی ہے وہ جو آخر بھی ہے
وہ جو ظاہر بھی وہ جو باطن بھی ہے

وہ لطیف و خبیر و سمیع و بصیر
وہ رحیم و کریم و حلیم و نصیر
اس کی توفیق سے
وہ سراپائے تسلیم و صبر و رضا
گردشِ روز و شب سے ستیز آزما
بے خطر مطمئن خندہ زن شادماں

میرے رب! میرے آقا و پروردگار
تیرے احسان ہیں ان گنت، بے شمار
ماورائے تصور ترا اختیار
دیکھ! اٹھائے ہوئے ہوں میں دستِ دعا
اے مرے کردگار!
رحمتِ بیکراں، بیکراں بخش دے
اے خدا! اپنے حفظ و اماں بخش دے
صحت و عافیت کا جہاں بخش دے

گر تصور، تخیل تعاون کریں
اور قلم ترجمانی پہ آمادہ ہو
دل یہ کہتا ہے میں اک سراپا لکھوں

محمد طارق غازی

آموختہ

ڈھونڈا کیے کہاں بڑی اونچی اٹھا گئی — قوموں کو اس زمین کی تہذیب کھا گئی
امت ہوئی جو محو عناصر کے علم میں — دنیا سے آخرش وہ صنم آشنا گئی
میراثِ عدن و دہر میں اک ربط بھی تو تھا — پھر کیا ہوا کہ دولت ارض و سما گئی
بابل ہو، نینوئی ہو، جینوا ہو، روم ہو — شہروں سے وہ جو پہلے گئی سوچیا گئی
صنعت کدوں میں روح کی چادر ہے تار تار — تہذیب ان کے شہر سے بھی بے ردا گئی
ویرانوں سے گزرتے ہوئے سوچتا تو ہوں — بستی جو تھی یہاں وہ کہاں خوش ادا گئی
چلئے ملائکہ سے نئی گفتگو رہے — جو وجہ امتیاز تھی اس کی ہوا گئی
بس اک نگہ میں جوہر تخلیق دے دیا — اک مشت خاک کو وہ نظر کیا بنا گئی
ہر خطہ کائنات کا جنت مثال تھا — حوّا کی شکل جب دل آدمؑ کو بھا گئی
اک غمزۂ لطیف تھا گویا صبا اثر — گلشن میں شاخ گل کی طرح وہ لجا گئی
جنت میں ہوگئی تھی جو معصوم سی خطا — بیرون خلد بس وہی دنیا سجا گئی
سرگوشی اک ہوئی جو سر مشعر الحرام ☆ — اس رات میں جہاں کا مقدر بنا گئی
دونوں طرف ہے نور کا دریائے بے کنار — اک روشنی اتر کے حرا سے قبا گئی
تشکیل کی تھی جس کی شریعت کی راہ سے — جانے کہاں وہ ملت ظلم آشنا گئی
ابجد ☆☆ سے روح و جسم کا ہر رمز گم ہوا — ذہنوں سے حرف حرف سرود دعا گئی
یخ بستہ ہیں ارادے، نہیں آنچ آنکھ میں — سینوں سے کیا حرارت تیغ آزما گئی
اس طرح بھی ادا ہوئی سنت رسول کی — کچھ دور تک تو دشت میں میری صدا گئی

☆ نواحِ مکہ مکرمہ میں مزدلفہ کے مقام پر مشعر الحرام وہ جگہ ہے جہاں زمین پر پہلی ملاقات کے وقت حضرت آدم اور حضرت حوا علیہما السلام نے وادی منیٰ اور مکہ کے سفر کے دوران رات گزاری تھی

☆☆ طبیعاتی عناصر ابجد کے حروف سے موسوم ہیں

پروین شیر (ونی پیگ) کینیڈا

جو دن چڑھا تو

جوان سورج نے

شباب کا تاج زریں پہنے

بڑے تکبر سے آسماں پر پہنچ کے

نیچے زمیں پہ دیکھا

زمیں کی ظلمت کو زیر کر کے

اسے لگا جیسے اس نے تسخیر کر لیے ہوں

سبھی اندھیرے

قمر اور انجم بھی اس کے آگے

وجود اپنا گنوا چکے تھے... چھپے ہوئے تھے

نشے میں ڈوبا ہوا گیا ہی آسماں پر چمک رہا تھا

جو دن ڈھلا تو

وہی تکبر سے چور سورج

زمیں کے قدموں پہ آ گرا ہے

شکست خوردہ نڈھال ہو کر

زمیں کے سینہ پہ سر لگائے

لہو کے آنسو بہا رہا ہے

پناہ لینے زمیں کے آنچل میں

منہ چھپا کر پڑا ہوا ہے

سرکتے تاریک سائے دن کے جو چھپ گئے تھے

پلٹ چکے ہیں

زمیں تو ماں ہے... روز کی طرح

مشفقانہ ہے اس کا لہجہ

"سنا تھا واپس تم آ رہے ہو

اسی لیے میں نے اپنے در کو کھلا رکھا ہے"

تعزیت: سہ ماہی الاقرباء کے قلمی معاونین کی ممتاز شخصیتوں میں کینیڈا (ونی پیگ) سے معروف شاعرہ محترمہ پروین شیر کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ انھیں گزشتہ ستمبر میں اپنے شریک حیات محترم سید وارث شیر کی رحلت کے المناک و جانکاہ صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ ان کی عمر ۸۷ سال تھی۔ ولادت پٹنہ (بہار) انڈیا میں ہوئی تھی۔ مرحوم نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (انڈیا)، یونیورسٹی آف لندن (برطانیہ) نیز جرمنی کی جامعات میں تعلیم حاصل کی۔ موصوف بین الاقوامی امور پر متعدد کتب کے مولف و مصنف تھے۔ آپ نے یونیورسٹی آف منی ٹوبہ میں بھی "اپلائیڈ میتھامیٹکس" میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیے۔ نیز بین الاقوامی اخبارات میں 'امن عالم' کے موضوع پر وقیع و معلومات افزا مضامین لکھے۔ آپ کے پس ماندگان میں اہلیہ پروین شیر، بیٹی صہبا، صاحبزادگان شیراز اور فراز کے علاوہ اُن کی اولادیں شامل ہیں۔

ادارہ سہ ماہی الاقرباء مرحوم کے لیے مغفرت، عقبیٰ و آخرت میں بلند درجات اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کے ساتھ دلی تعزیت پیش کرتا ہے۔

فیروز ناطق خسرو

قرض میری مٹی کا

میں مشتِ خاک ہوں
ہے قرض میری مٹی کا !
ہے جسم و جاں پہ مرے
قرض میری مٹی کا !
مجھے یہ قرض نبھانا تھا کل بھی
آج بھی ہے!
یہ قرض کل بھی چکانا تھا مجھ کو
آج بھی ہے!
یہ شہر میرا نہیں ہے
ہمارا سب کا ہے!
کہ اس کے حسن کا جادو بڑے غضب کا ہے!
اسی کی زلف کا ہر شخص ہے اسیر یہاں
فقیرِ شہر بھی دیکھو تو ہے امیر یہاں!
ہے سچ یہی یہاں آنے کے
لاکھ رستے ہیں!
جو آگئے یہاں صدیوں سے رستے بستے ہیں!
شناخت اس کی نہیں ہے حسب نسب کے لیے
کشادہ کرتا ہے باہوں کو اپنی سب کے لیے
جو غم زدہ ہیں انہیں بھی لگا کے سینے سے
ہزار لفظ تسلی کے وار دیتا ہے
نصیب بگڑے ہوؤں کے سنوار دیتا ہے !

جو پیار کرتا ہے اس سے یہ شہر اس کے لیے
بھڑکتے شعلوں سے خود کو گزار دیتا ہے !
غلط نہیں ہے جو سب زندہ باد کہتے ہیں
یہی ہے جس کو عروس البلاد کہتے ہیں!
یہ شہر ہے مرے پیاروں کی خوشنما تصویر!
یہ شہر ہے مرے خوابوں کی ہو بہو تعبیر !
ہے تجھ سے عہد مرا
میرے شہرِ بے تمثیل
نہ میں کروں گا کبھی تیری صبح کا سودا
سیاہ رات کے ساتھ!
میں دل کو، دل سے ملا لوں گا
ہاتھ، ہاتھ کے ساتھ
میں سب سے مل کے رہوں گا
کہ سب ہی میرے ہیں
جو تیرے چاہنے والے ہیں
وہ بھی میرے ہیں!
میں کل بھی زندہ رہا تھا
ہوں آج بھی زندہ!
میں کل بھی زندہ رہوں گا
اسی یقین کے ساتھ!
اسی زمین کے ساتھ!

اویس الحسن

رومان کا ٹانکا ہوا

گو کہ معلوم تھا ظالم ہے دسمبر لیکن
ایک وعدہ کہ جسے دل نے نبھایا اب تک
سرد موسم میں سلگتی ہوئی حدت کی قسم
ہم نے پلکوں کو محبت سے سجایا اب تک

جھلملاتی ہوئی تصویر ستمگر کی قسم!
آج پہلو میں عجب ٹیس اٹھی ہے دیکھو
دل کو تھامے ہوئے کہتے ہیں محبت کے ستم
جذب و مستی کی عجب لہر تھمی ہے دیکھو

آہ سوز اس کی کشش، تیرا تقدس توبہ
سرد جھونکوں سے محبت کو بجھنے نہ دیا
اپنی پلکوں کے کناروں کے سلگنے کی قسم
ہم نے سینے میں لگی آگ کو بجھنے نہ دیا

اپنے رومان کے ٹانکے ہوئے سورج کی قسم
زلف جاناں کی چمک ڈھونڈ رہا ہے کوئی
اُن کے مہکے ہوئے آنچل کے فسانے توبہ
اُن کی چوڑی کی کھنک ڈھونڈ رہا ہے کوئی

آج سانسوں کا تلاطم جو ڈبوتا دل کو
کشتیِ جاں کو بھی موجوں کے حوالے کرتے
حسن طوفان کی بانہوں کے حوالے کرتے
عشق طوفان کی بانہوں کے حوالے کرتے

پھر بھی معلوم تھا ظالم ہے دسمبر لیکن!
یہ نہ معلوم تھا اتنا ہے ستمگر لیکن!

صوفیہ انجم تاج (امریکہ)

رکھ رکھاؤ

یہ وضع داری ہماری راہوں میں سنگ بن کر
کبھی کبھی زندگی میں ایسے مقام پر لا کے چھوڑ
جاتی ہے
جس سے آگے کا مرحلہ اور بھی کٹھن ہے
گزشتہ ساری مسافتوں کی تھکن بھلائے
میں منتظر راہ میں کھڑی تھی
مگر اُدھر سے نہ قافلہ فصلِ گل کا گزرا
نہ خوشبوؤں کا پیام آیا
میں سر جھکائے خود آپ اپنے سے لڑ رہی تھی
کہ یک بیک روبرو جو میرے
تم آج اس طرح آ گئے ہو
کہ اپنے دل کو سنبھالنا بھی محال ٹھہرا
مرا سراپا تو گردِ غم سے اٹا ہوا تھا
سو تم سے اتنا بھی کہہ نہ پائی
کہ میں تمہاری ازل کی ایک آشنا تھی
اور میں
تمہاری ہی راہ تک رہی تھی

نورین طلعت عروبہ

میرا دیس

مولا یہ میرا دیس، مری جان کی طرح
مضبوط چاہیئے مجھے ایمان کی طرح

رکھا ہے ہم نے اس کی خواب کا خیال بھی
بالکل کسی بہار کے امکان کی طرح

انمول ہے ہمارے لیے پاک سر زمیں
عبدالقدیر خان کے احسان کی طرح

وہ قدر و منزلت کہ جو منسوب تجھ سے ہے
دل میں سجی ہے قیمتی سامان کی طرح

گھر کی طرح عزیز ہے جب یہ وطن ہمیں
پھر اس میں کیوں رہیں کسی مہمان کی طرح

اے کاش میرے دیس میں ہو امن کا قیام
پیارے نبی کریمؐ کے فرمان کی طرح

اردو زباں کا حق ہے ملے اس کو قومیت
یہ بھی ہمارے ساتھ ہے پہچان کی طرح

صابر عظیم آبادی

رباعیات

یہ کون بدن پر ہے بدن اوڑھے ہوئے
ملبوس بھی ہے مشک ختن اوڑھے ہوئے
آنکھوں میں ہے سورج کی چمک پھیلی ہوئی
آیا ہے سفر سے جو تھکن اوڑھے ہوئے

☆☆☆

اک عہد مساوات کی تشکیل کرو
نفرت کے ہر اک کھیل کی تذلیل کرو
گر چاہتے ہو امن و سکوں تو پہلے
اس شہر کے حالات کو تبدیل کرو

☆☆☆

جو اس کا ہے سب اس کو پتا ہوتا ہے
رنگ اس کے تجسس کا جدا ہوتا ہے
کیوں ڈھونڈنے نکلا ہے خدا کو زاہد
شہ رگ کے قریں ہی تو خدا ہوتا ہے

☆☆☆

وہ اپنی حقیقت کا پتا کیا دے گا
محتاج ہے جو خود ہی بتا کیا دے گا
ہے مانگنا تو مانگ حقیقی رب سے
انسان کو پتھر کا خدا کیا دے گا

☆☆☆

دکھ درد کے لمحات اذیت کی گھڑی
کٹ جائے گی کٹھن سی مصیبت کی گھڑی
انسان کرے صبر و تحمل صابر
آتی ہے ذرا دیر سے راحت کی گھڑی

☆☆☆

افکار جواں عزم جواں رکھتا ہوں
دامن میں کئی کاہکشاں رکھتا ہوں
رکھتا ہوں زمانے کی ہر اک چیز مگر
میں عظمتِ کردار کہاں رکھتا ہوں

☆☆☆

خاشاک کی مانند بکھر جاتا ہے
ذلت ہی اٹھاتا ہے جدھر جاتا ہے
دھرتا جو نہیں پندنصیحت پہ کان
بے موت زمانے میں وہ مر جاتا ہے

☆☆☆

دیوانہ تو ہوتا نہیں اتنا بے باک
رکھتا ہے مگر اپنے جنوں کا ادراک
تنہائی کے لمحات میں فصل گل میں
کرتا رہتا ہے اپنا دامن چاک

☆☆☆

بوڑھوں کی جوانوں کی محبت دینا
آپس میں رہوں مل کے وہ چاہت دینا
لینی ہے ابھی قوم کی خدمت مجھ سے
اللہ مجھے تھوڑی سی مہلت دینا

بارِ غم آفاق اٹھا لوں تو چلوں
پلکوں پہ نئے دیپ جلا لوں تو چلوں
انجان کوئی دور سے دیتا ہے صدا
آواز سے آواز ملا لوں تو چلوں

نقد و نظر

کتاب : متاعِ فکر و نظر

مصنف : سید منصور عاقل

مبصر : پروفیسر ڈاکٹر غلام شبیر رانا

ناشر : مکتبہ الاقرباء فاؤنڈیشن۔ اسلام آباد

قیمت : ۶۰۰ روپے

سید منصور عاقل کا شمار پاکستان کے ان ممتاز ادیبوں میں ہوتا ہے جن کی تخلیقی کامرانیوں کا ایک عالم معترف ہے۔ اُن کی ادارت میں اسلام آباد سے شائع ہونے والا سہ ماہی ادبی مجلہ ''الاقرباء'' قارئینِ ادب میں بے حد مقبول ہے۔ گزشتہ دو عشروں میں الاقرباء نے فروغِ علم و ادب کے لیے جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں وہ تاریخِ ادب کے اوراق میں آبِ زر سے لکھی جائیں گی۔ سید منصور عاقل کی چودہ کتب اُردو میں اور سات انگریزی میں شائع ہو چکی ہیں۔ الاقرباء فاؤنڈیشن اسلام آباد کے زیرِ اہتمام ان کی نئی تصنیف ''متاعِ فکر و نظر'' جو سال ۲۰۱۴ء کے وسط میں شائع ہوئی ہے، بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اس معرکہ آرا کتاب میں سید منصور عاقل کے لکھے ہوئے ادبی مجلات اور ادبی کتب پر تبصرے یک جا کر دیئے گئے ہیں۔ متاعِ فکر و نظر میں نوے کتابوں پر تبصرے اور چھ کتابوں کی تقاریظ شامل ہیں۔ سید منصور عاقل نے ماضی کے افکار، حال کے تجربات اور مستقبل کے تصورات کی اساس پر پاکستانی ادب کی تہذیبی اور ثقافتی، قدار کا قصرِ عالی شان تعمیر کرنے کا جو خواب دیکھا ہے وہ ان کی تحریر کے ایک ایک لفظ سے عیاں ہے۔ ایک زیرک نقاد، محقق، ادیب و دانش ور اور حریتِ فکر کے مجاہد کی حیثیت سے سید منصور عاقل نے آئینۂ ایام میں آنے والے دور میں تخلیقِ ادب کی جو لفظی مرقع نگاری کی ہے وہ خوب سے خوب تر کی جانب

حازم سفر رہنے کے سلسلے میں ایک واضح لائحہ عمل پیش کرتی ہے۔ ایک مستعد اور فعال تخلیق کار تنقید کی روشنی میں اپنے مستقبل کے ادبی سفر اور منزل مقصود کا تعین کرتا ہے۔ سید منصور عاقل کے لکھے ہوئے کتابوں پر یہ ادبی تبصرے جس مثبت انداز میں قاری اور تخلیق کار کو فکر پرور اور بصیرت افروز رہنمائی سے متمتع کرتے ہیں وہ فروغ ادب کے لیے ایک بہت اچھا شگون ہے۔ قحط الرجال کے موجودہ زمانے میں جب زندگی کی اقدار عالیہ کو شدید خطرات لاحق ہیں اور مادی دور کی قباحتوں نے تمام رُتیں ہی بے ثمر کر دی ہیں، ایسی کتب کی اشاعت نہ صرف جمود کے خاتمے کی جانب اہم پیش رفت ہے بلکہ اس کے اعجاز سے قارئین ادب کے فکر و نظر کو مہمیز کرنے میں بھی مدد ملے گی۔

'متاعِ فکر و نظر' کی اشاعت سے اُردو ادب کی ثروت میں اضافہ ہوگا اور قارئین ادب کو افکار تازہ کے وسیلے سے جہانِ تازہ تک رسائی حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔ سید منصور عاقل کے تبصرے کتاب، مصنف اور اُس کے اسلوب کے بارے میں تمام حقائق کی گرہ کشائی کرتے ہیں۔ سید منصور عاقل نے اپنی تبصرہ نگاری کے ذریعے تخلیق ادب میں گہری دلچسپی اور انہماک پر زور دیا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ فکری ارتقا کا تقاضا یہ ہے کہ جہد مسلسل کو زادِ راہ بنایا جائے۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ سعی پیہم ہی زندگی کی علامت ہے۔ اسی کے اعجاز سے ذہن و ذکاوت فہم و فراست اور فکر و نظر کے ارتقاء کو یقینی بنایا جا سکتا ہے۔ تخلیق کار کی شخصیت کردار اور اسلوب میں نکھار کے لیے سخت محنت ناگزیر ہے۔ ایک بلند پایہ مصنف کی مثال ایک کوہ پیما کی ہے جو ایک سر بہ فلک پہاڑ کی چوٹی سر کرنے کا عزم کرتا ہے۔ اُسے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوتی ہے کہ اس جد و جہد میں اس کی جان بھی جا سکتی ہے لیکن وہ اپنی دُھن میں مگن اپنی جد و جہد میں منہمک رہتا ہے۔ اُسے اس بات کا پختہ یقین ہوتا ہے کہ آنے والی نسلیں یقیناً 'فروغ گلشن و صوت ہزار کا موسم' دیکھیں گے۔ سید منصور عاقل نے ان تمام مصنفین کی محنت کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے جنھوں نے اپنے اشہب قلم کی جولانیوں سے قارئین ادب کو قطرے میں دجلہ اور جزو میں کل کا منظر دکھایا۔ ان کی تخلیقی فعالیت سے احساس و ادراک اور تہذیبی و ثقافتی ارتقا کے امکانات روشن تر ہو گئے۔ کتاب

''متاعِ فکر ونظر'' کا پیش لفظ (افتتاحیہ) سید منصور عاقل نے تحریر کیا ہے۔ ''گزارشِ احوالِ واقعی'' کے عنوان سے مصنف اور کتاب کے بارے میں پروفیسر سحر انصاری کی اہم رائے بھی کتاب کی زینت بنی ہے۔ چار سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب کمپیوٹر کمپوزنگ میں اعلیٰ معیار کے سفید کاغذ پر نہایت اہتمام کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ اس کی قیمت چھ سو روپے ہے۔ کتاب حاصل کرنے کا پتا درج ذیل ہے۔ مکتبہ الاقرباء فاؤنڈیشن ۱۰۲، سٹریٹ ۱۱۰ سیکٹر جی۔۳/۱۱۔ اسلام آباد

کتاب : ذکرِ فیض

مولف : سید مظہر جمیل

مبصر : مسلم شمیم

''ذکرِ فیض'' سید مظہر جمیل کی تازہ ترین قاموسی ادبی دستاویز ہے۔ اس سے قبل اُن کی متعدد غیر معمولی اہمیت کی حامل تحقیقی، تنقیدی اور بصیرت افروز کتابیں ادبی حلقوں میں موضوعِ گفتگو رہی ہیں، اور اس ضمن میں اُن کے کارناموں کی خاطر خواہ پذیرائی بھی ہوئی اور اعترافِ کمال کے اعزازات سے بھی اُنھیں نوازا گیا۔ مذکورہ کتابوں میں جدید سندھی ادب۔ میلانات، رجحانات اور امکانات، کو تاریخ ساز ادبی کارنامہ تسلیم کیا گیا ہے۔ ''ذکرِ فیض'' اسی تاریخی اہمیت کی حامل کتاب ہے۔ ''ذکرِ فیض'' کو بجا طور پر فیض احمد فیض کی پہلی باضابطہ سوانح عمری کہا گیا ہے میرے نزدیک اس جامع قاموسی سوانح عمری کا نام ''ذکرِ فیض'' صاحبِ تصنیف کی عجز بیانی اور کسرِ نفسی کا مظہر ہے۔ ''ذکرِ فیض'' نام سجاد ظہیر کی کتاب ''ذکرِ حافظ'' کی یاد دلاتا ہے جو اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے مناسب و موزوں نام ہے۔ حافظ شیرازی اور فیض کی شاعرانہ عظمت کو ذہن نشیں رکھا جائے تو اس مماثلت اور تناظر میں 'ذکرِ حافظ' اور 'ذکرِ فیض' ان دونوں کی معنویت سمجھ میں آتی ہے۔ ذکرِ فیض کو میں مولانا الطاف حسین حالی کی عہد ساز کتاب سرسید احمد خاں کی سوانح عمری 'حیاتِ جاوید' کا ہم پلہ ادبی کارنامہ سمجھتا ہوں۔ ''حیاتِ جاوید'' انیسویں صدی کے تناظر میں ایک ایسی

سوانح عمری ہے جو سرسید کے حوالے سے مذکورہ صدی کا سیاسی، سماجی، لسانی نظریاتی، ثقافتی اور اقتصادی منظر نامہ اپنی تمام تر جامعیت کے ساتھ پیش کرتی ہے" حیات جاوید" میں سرسید احمد خاں کی زندگی کی روداد ۱۸۱۷ء سے ۱۸۹۸ء تک جس طرح پیش کی گئی ہے اور اُن کی معرکہ آرائیوں اور کارناموں کو قلم بند کیا گیا ہے، وہی کچھ " ذکر فیض" کی جامعیت کا وصف خاص ہے۔ " ذکر فیض" میں پوری بیسویں صدی بلکہ ماڈرن عہد تاریخ کو فیض کی جہدِ حیات کی داستاں میں جگہ دی گئی ہے۔ 'ذکر فیض' نام بحرِ ہند کو حیدر آباد دکن میں واقع زبداندی قرار دینے کے مترادف ہے۔ واضح رہے کہ سید مظہر جمیل کا آبائی وطن حیدر آباد دکن تھا۔ ان جملہ ہائے معترضہ سے قطع نظر موضوع گفتگو " ذکر فیض" ہے جو ایک آدرش وادی عظیم تخلیق کار اور کثیر الجہت نابغۂ روزگار شخصیت کی سوانح حیات ہے جسے میں نے " حیات جاوید" کی ہم پلہ ادبی دستاویز کہا ہے۔ یہ قاموسی تصنیف ۳۳ جامع اور سیر حاصل ابواب پر مشتمل ہے اور فیض کی پیدائش اور عہد طفولیت سے شروع ہو کر اُن کی جنم بھومی 'کالا قادر' کے آخری پھیرے اور پھر اُن کی رحلت اور ان کے آخری سفر تک کے تمام واقعات اور حالات زیست کی تفصیل " ذکر فیض' میں بالتفصیل بیان کی گئی ہے۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ یہ ایک آدرش وادی عظیم شخصیت کی جیون کہانی ہے، اس آدرش وادی کا آدرش کیا تھا، اس باب میں ڈاکٹر علی مدیح ہاشمی کا ایک مختصر مگر غیر مبہم فقرہ لائق اعتنا ہے" یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ فیض کی زندگی ایک خاص سماجی اور سیاسی فلسفے کے زیرِ اثر رہی، یعنی فلسفۂ اشتراکیت (Isocialism) فیض نے تمام عمر اسی جدوجہد میں حصہ لیا اور اسی کی پیروی کی۔" اس فقرے کو میں نے اس لیے اہمیت دی کہ کچھ حلقے فیض کی شاعرانہ عظمت کے ڈانڈے پتا نہیں کن کن حوالوں میں ڈھونڈتے ہیں اور بعض تو انھیں کلیتہً صوفی منش شاعر قرار دینے کی بھی جرأت رندانہ کا اظہار کر چکے ہیں۔ یہ سب کچھ میرے نزدیک بدنیتی پر مبنی رویے ہیں اور فیض کی ترقی پسندی پر غیر متزلزل وابستگی کے حوالے سے شکوک وشبہات پیدا کرنے کی سعی نامشکور کے زمرے میں آتے ہیں۔

فیض کی نظریاتی زندگی کا بیان " ذکر فیض" میں صفحۂ اول سے صفحۂ آخر تک پھیلا ہوا ہے،

خصوصیت کے ساتھ اس کا پانچواں باب جو ترقی پسند ادب کی تحریک ۱۹۳۶ء اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے منشور کے بیان سے شروع ہو کر اس تحریک کے آغاز سفر سے فیض کی وابستگی سے عبارت ہے۔ فیض کی آغاز سفر سے ترقی پسند تحریک سے وابستگی اُن کی شاعرانہ عظمت کا سرچشمہ رہی ہے۔ سجاد ظہیر نے اپنی کتاب 'روشنائی' میں تفصیل کے ساتھ تحریر کیا ہے کہ فیض روزِ اول سے ان کے اس مشن میں ہم قدم رہے تھے فیض کا شعور ترقی پسند تحریک کے حوالے سے اُن کے تاریخی شعور کا حصہ تھا۔ اُن کے نزدیک ۱۹۳۶ء سے شروع ہونیوالی تحریک سماجی ارتقا کے سفر سے جڑی ہوئی ہے وہ بخوبی جانتے تھے کہ ترقی پسندی اور ترقی پسند تحریک سماجی ارتقا کی کہانی کا اٹوٹ انگ ہے اور یہ کہ سماجی زندگی کے آغاز سفر سے، جو لاکھوں سال پر محیط ہے، اس کہانی کی ابتدا ہوئی۔ انسان جنگلوں اور غاروں سے نکل کر کھیتی باڑی کے دور میں آیا عرصۂ حیات ہزاروں سالوں پر محیط ہے۔ اس سماجی عمل میں جب نجی ملکیت نے جنم لیا تو غیر طبقاتی سماج طبقاتی سماج میں بدل گیا اور یہیں سے طبقاتی کش مکش اور آویزش کا سلسلہ شروع ہوا۔ طبقاتی کش مکش کی تاریخ دراصل سماج میں ترقی پسند اور رجعت پسند قوتوں کے درمیان کش مکش، آویزش اور جدوجہد کی تاریخ ہے۔ سماجی ارتقا، تغیر و ترقی اور انقلابات کے مراحل سے دوچار ہوتا ہوا قانونِ فطرت کی عمل داری میں سرخ روئی کی منزلوں سے ہم کنار ہوتا آیا ہے۔ انسان اور انسانی تمدن و تہذیب کا سفر ہمیشہ پیش رفت کا سفر رہا ہے۔ ترقی پسند قوتیں ہر دور میں حاوی طاقتیں رہی ہیں۔ شعور و فکر اور ترقی کا سورج کبھی کسی خطۂ ارض پر روشن رہا، کبھی کسی اور خطۂ ارض پر۔ انسانی سماجی زندگی کبھی واپسی کے سفر پر گام زن نہیں ہوئی یعنی رجعت پرستی کو قبول نہیں کیا۔ استحصالی اور ظلم و جور کا دبدبہ وقت کے ساتھ سوالیہ نشان بنتا گیا۔ ادب میں ترقی پسندی کی تحریک اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ فیض کا سرچشمۂ فکر و شعور یہی نظریہ اور آدرش رہا۔ انقلاب اکتوبر ۱۹۱۷ء اس نظریے کا علم بردار تھا جس انقلاب کا خیر مقدم علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں کیا تھا

آفتاب تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا　　　آسماں ٹوٹے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک؟

ترقی پسندی کا آدرش اسی انقلاب اکتوبر سے عبارت ہے۔ فیض کے سوویت یونین سے تعلق خاص کا اظہار''ذکرِ فیض'' میں بڑی صراحت سے کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر لدمیلا وسیلوا کی کتاب 'پرورشِ لوح و قلم، فیض، حیات اور تخلیقات' میں سوویت یونین کے انہدام سے پہلے جو تصویر فیض کی آنکھوں میں ابھر رہی تھی، اس کا اظہار اُس دور کی شاعری میں پایا جاتا ہے جس کی نشان دہی ڈاکٹر لدمیلا وسیلوا نے بڑے واضح انداز میں اپنے کرب کے ساتھ کی ہے۔ ''ذکرِ فیض'' میں مذکورہ کتاب کے مندرجات کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ اُن کے انتقال کے چھ سال بعد ۱۹۹۰ء میں یہ تاریخی سانحہ ظہور پذیر ہوا۔ فیض کے ذہن و دل پر یہ المیہ کیا گل کھلاتا، نا قابلِ فہم نہیں ہونا چاہیے۔ اس ضمن میں ''ذکرِ فیض'' کے بیسویں باب کا حوالہ بے محل نہیں ہوگا جو 'بین الاقوامی لینن پیس ایوارڈ' کے زیرِ عنوان ہے۔ اس ایوارڈ کو وصول کرتے ہوئے اپنی جوابی تقریر میں فیض نے اپنی خوب صورت ترین شاعرانہ تقریر کا اختتام ان فقروں پر کیا تھا کہ ''مجھے یقین ہے کہ انسانیت جس نے اپنے دشمنوں سے آج تک کبھی مار نہیں کھائی، اب بھی فتح یاب ہو کر رہے گی اور آخرکار جنگ و نفرت اور ظلم و بربریت کے بجائے باہمی زندگی کی بنا وہی ٹھہرے گی جس کی تلقین اب سے بہت پہلے فارسی شاعر حافظ نے کی تھی۔

''خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی　　بجز بنائے محبت کہ خالی از خلل است''

ترقی پسند تحریک کے تسلسل میں ''ذکرِ فیض'' کا اٹھارواں باب جو 'افرو ایشیائی ادیبوں کی تحریک اور کانفرنسیں' کے زیرِ عنوان ہے مذکورہ افرو ایشیائی ادیبوں کی تحریک کے محرک سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض تھے جس کی تشکیل ۱۹۵۶ء میں دہلی کی ایک کانفرنس میں زیرِ غور آئی تھی اور ۱۹۵۸ء میں اس کی پہلی کانفرنس تاشقند میں منعقد ہوئی تھی۔ اس باب میں مذکورہ افرو ایشیائی رائٹرز ایسوسی ایشن کی غرض و غایت سے لے کر آخری کانفرنس، جو افریقا لیونڈر میں منعقد ہوئی کی مکمل تاریخ رقم کی گئی ہے۔ اس تنظیم کا شہرۂ آفاق جریدے "LOTUS" کا سیر حاصل بیان ''ذکرِ فیض'' کا حصہ ہے۔ "LOTUS" کے چیف اڈیٹر کے حوالے سے اُن کے لکھے گئے اداریوں کا ذکر خیر بڑی

قدر و قیمت کا حامل قرار پائے گا۔ واضح رہے کہ سوویت یونین کے انہدام کے بعد عرصۂ دراز تک یہ بین الاقوامی تنظیم معطل و معدوم رہنے کے بعد دسمبر ۲۰۱۲ء میں قاہرہ میں بحال ہوئی ہے اور ماضی قریب میں اس کا پاکستان چیپٹر بھی قائم ہوا ہے جس کی سہ روزہ بین الاقوامی کانفرنس گزشتہ دنوں اسلام آباد میں منعقد ہوئی جس میں قاہرہ سے اس تنظیم کے سکریٹری جنرل محمد سلماوی اور افرو ایشیائی پیپلز سولیڈریٹی سوسائٹی (Afro.Asian Peoples' Solidarity Society) کے صدر جناب حدیدی بھی مذکورہ کانفرنس میں شریک ہوئے اور مذکورہ تنظیم کے صدر ڈاکٹر علی جاوید بھی دہلی سے کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے تھے اور مثالی کردار ادا کیا تھا۔ راقم نے بھی انجمن ترقی پسند مصنفین کے صدر کی حیثیت سے شرکت کی تھی اور انجمن کی کراچی شاخ کے صدر ڈاکٹر سید جعفر احمد بھی مذکورہ کانفرنس میں شریک ہوئے، انجمن کے پختون خوا کے صوبائی صدر جناب شہاب خٹک بھی شریک ہوئے تھے۔

بیسویں صدی میں دو عالمی جنگوں ۱۹۱۴ء۔۱۹۱۶ء اور ۱۹۳۹ء۔۱۹۴۵ء کے عالمی ثقافتی منظر نامے کے ساتھ ساتھ سیاسی منظر نامے کا معتبر حوالوں کے ساتھ بیان ''ذکر فیض'' میں قارئین کے لیے گنج گراں مایہ کا درجہ رکھتا ہے۔ ۱۹۳۰ء کی دہائی کے اوائل میں فسطائیت کے عفریت کا انسانی تہذیب و ثقافت کے لیے بھیانک چیلنج بن کر نمودار ہونا اور دوسری جنگ عظیم پر منتج ہونا، یہ سب کچھ ''ذکر فیض'' میں قارئین کے لیے غیر معمولی تاریخی مواد ہے۔ فیض ایک عالمی ادبی شخصیت ہونے کی حیثیت سے عالمی ادبی منظر نامے کی ادبی شخصیات، پبو نرودا، ناظم حکمت اور محمود درویش جیسے اکابر ادب سے فیض کے دوستانہ مراسم کے تذکرے ''ذکر فیض'' کے بے حد اہمیت کے حامل ابواب ہیں۔ ''ذکر فیض'' کے ۲۶ ویں باب میں 'جہاں نوردی' کے زیر عنوان فیض کے عالمی روابط خصوصیت کے ساتھ لندن، ماسکو اور دہلی میں اُن کی پذیرائیوں کے قصے فیض کی ادبی اور فکری عظمت پر دال ہیں۔ ''ذکر فیض'' میں صاحب تصنیف کے خلوص فکر و نظر کے جلوے ہر جگہ قارئین کی آنکھوں کو بصیرت و بصارت کے خزانے بخشتے ہیں ''ذکر فیض'' میں سید مظہر جمیل کی اپنی نظریاتی

وابستگی کی زندگی کی روداد بحوالۂ فیض پڑھی جا سکتی ہے۔

سید مظہر جمیل کی فیض احمد فیض سے وابستگی کی اساس نظریاتی ہے جس کا سلسلہ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں شروع ہوا تھا۔ مظہر جمیل اپنی طالب علمی کے دور سے اس تحریک سے وابستہ رہے اور سب سے پہلے اُنھوں نے سکھر میں ڈیموکریٹک اسٹوڈنٹس فیڈریشن (D.S.F) کو منظم کیا اور اس کے کاز سے عملی طور جڑے رہے۔ واضح رہے کہ D.S.F. کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کا اسٹوڈنٹ فرنٹ تھا جو بعد میں N.S.F. کے نام سے جانا گیا۔ سید مظہر جمیل جلد ہی ادبی اور ثقافتی شعبوں سے وابستہ ہوئے، مگر یہاں بھی کاز اور آدرش وہی رہا یعنی مسلکِ فیض احمد فیض۔ ۱۹۸۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کے حوالے سے چار روزہ بین الاقوامی کانفرنس جس کی تیاری میں آٹھ ماہ کا عرصہ صرف ہوا تھا، اس کانفرنس کی تنظیمی کمیٹی کا راقم جنرل سکریٹری جناب شوکت صدیقی چیرمین اور جناب سبطِ حسن سرپرست اعلیٰ تھے۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں یہ کانفرنس تاریخی اہمیت کی حامل ٹھہری تھی اور ترقی پسند تحریک کی تاریخ کی سب سے بڑی کانفرنس تسلیم کی گئی تھی۔ اس کانفرنس میں مظہر جمیل کا کلیدی کردار رہا تھا۔ میں خود کو اس کانفرنس کی تنظیمی کمیٹی کا DEJURE جنرل سکریٹری کہتا ہوں اور مظہر جمیل کو DEFACTO جنرل سکریٹری۔ اس کانفرنس کے کامیاب انعقاد سے گویا انجمن ترقی پسند مصنفین کا باضابطہ احیا ہوا تھا جو ۱۹۵۴ء میں غیر قانونی قرار دی گئی تھی۔ مذکورہ کانفرنس کے انعقاد میں سید مظہر جمیل کا کلیدی کردار اور دیوانہ وار عملی سرگرمیاں اُن کے مسلکِ فیض سے روحانی رشتوں ناطوں کی مظہر ہیں۔ اس تناظر میں ''ذکرِ فیض'' کو مظہر جمیل کے عشقِ فیض کا فیضان کہنا چاہیے۔ ''ذکرِ فیض'' کا انتساب وابستگانِ فیض کے ساتھ ''اُن اَنگنت دل دادگانِ فیض کے نام'' جو میں بھی ہوں، جو تم بھی ہو'' یہ حصۂ انتساب میرے دعوے کی دلیل کا درجہ رکھتا ہے۔

ہماری بد قسمتی کہ اردو زبان کی دنیا بھر میں اس وسیع الثروتی کے باوجود آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ عزت مآب جسٹس جواد ایس خواجہ کی سربراہی میں نفاذ اردو کے آئینی اور قومی غیرت وحمیت پر مبنی عدالتِ عظمیٰ کے تازہ ترین فیصلہ پر ایوانِ اقتدار میں اکثر چتونوں پر بل پڑے ہوئے ہیں۔

کتاب : اردو تحقیق۔صورت حال اور تقاضے

مصنف : پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل

مبصر : سید منصور عاقل

پبلشر : القمر انٹر پرائزز۔اردو بازار۔لاہور

پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل ایک نامور محقق، نقاد، ماہر تعلیم اور جامعاتی سطح کے بین الاقوامی معلم ہیں۔ ان کی زیر نظر تصنیف جو تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے واقعی ایک گنجینۂ معارف ہے جس کا عمیق مطالعہ کے بعد جائزہ لینا اور نقد و نظر کا حق ادا کرنا ایک سو صفحات میں بھی مشکل دکھائی دیتا ہے۔ کتاب کے صرف چار ابواب ہی اگرچہ موضوع کی کثیر الجہتی کا مکمل احاطہ کرتے ہیں لیکن مصنف کی انتقادی بصیرت نے تصنیف کو ایک خاص انفرادیت عطا کر دی ہے جس کا اندازہ انتساب کے درج ذیل روایت سے ماورا کلمات سے کیا جا سکتا ہے۔

"ہائر ایجوکیشن کمیشن کے نام۔۔۔۔جس کے سیاست کے زیر اثر رہنے اور جس کے بنیادی مقصد کے اوجھل ہو جانے کے سبب جامعات کے بے بصیرت سربراہوں اور نااہل اساتذہ پر کوئی قدغن نہیں چنانچہ آج جامعات میں تحقیق کی صورت حال روز بروز زوال پذیر ہے۔"

معروضات کے زیر عنوان فاضل مصنف نے لکھا ہے کہ سیاسی اثر اور سیاسی سرپرستی نے ہر سطح پر نااہلوں کو تعلیمی اداروں میں پہنچا دیا۔ قومیائے جانے کے سبب سرکاری تعلیمی ادارے تباہ ہوئے اور ان کی جگہ نام نہاد انگریزی دیوبلی نظام تعلیم کے ادارے گلی کوچوں میں قائم ہو گئے جنھوں نے تباہی کو مزید وسعت دیدی۔ اس طرح صرف تعلیم نہیں پوری قوم ہی دو طبقوں میں بٹ گئی۔ قومی زبان پس انداز ہو گئی۔

زیرِ نظر کتاب کے محرکات کے حوالے سے پروفیسر صاحب بتاتے ہیں کہ اردو تحقیق کی موجودہ صورت حال اور جامعات میں تحقیق کے مسائل و مشکلات جیسے موضوعات اُن کے راست تجربے اور مشاہدے کے سبب زیرِ نظر مضامین و مقالات کا موضوع بنے ہیں۔ تقسیم کے وقت بیشتر علمی سرمایہ بھارت میں رہ گیا تھا۔ انڈیا آفس لندن کے آرکائیوز کا مسئلہ بھی حل طلب تھا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی اور پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانوں کے علاوہ پنجاب پبلک لائبریری لاہور، پشاور آرکائیوز اور لاہور ریکارڈ آفس تھے۔ انجمن ترقی اردو کا کتب خانہ دہلی سے کراچی منتقل ہوا پھر کراچی میں آرکائیوز کا شعبہ اور عجائب گھر تہذیبی و علمی ورثے کے اہم مراکز بن گئے۔ متعدد ادارے قائم کیے گئے۔ انجمن ترقی اردو بورڈ۔ کراچی اقبال اکیڈمی اور بعد میں بزمِ اقبال لاہور، مرکزی اردو بورڈ، مجلسِ ترقی ادب لاہور، پنجابی ادبی اکیڈمی لاہور، ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور، ادارۂ تحقیقات پاکستان لاہور، پشاور اکیڈمی پشاور، سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد اور بلوچ اکیڈمی کوئٹہ وجود میں آئے۔ ڈاکٹر عقیل نے اس ضمن میں بعض اہم علمی شخصیات اور محققین کی گراں مایہ اور امتیازی کاوشوں کو بھی سراہا ہے جن میں ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر محمد باقر، کلبِ علی خاں فائق اور ڈاکٹر عبادت بریلوی کے علاوہ تحقیق کے شعبہ میں ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر نجم الاسلام اور محمد اکرام چغتائی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ مجلسِ ترقی ادب لاہور کی کلاسیکی مطبوعات کو تحقیقی و تنقیدی مقدمات کے ساتھ مرتب کرنے والوں میں خلیل الرحمٰن داؤدی اور اسماعیل پانی پتی کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ مشفق خواجہ کا ذکر کرتے ہوئے فاضل مصنف نے انھیں اردو تحقیق میں تلاش و جستجو اور معلومات کی فراہمی کے ساتھ متون کی ترتیب میں اُن کی ذہانت و محنت کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

فاضل مصنف نے کامل بلاغتِ نظر کے ساتھ پاکستان میں ادبی تحقیق کے نہ صرف مسائل کا جائزہ لیا ہے بلکہ نہایت اہم اور قابلِ عمل تجاویز بھی پیش کی ہیں۔ آپ وسائل اور مآخذ کی فراہمی کو ایک بڑا مسئلہ قرار دیتے ہیں اور اظہارِ افسوس کرتے ہیں کہ پاکستان میں ابھی تک تحقیق

کے بنیادی وسائل اور مآخذ کی فراہمی کے بارے میں سوچا بھی نہیں گیا ہے۔ موصوف کے خیال میں ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام کتب خانے اپنی مطبوعات اور اپنے مخطوطات و دستاویزات کی فہرستیں شائع کریں نیز ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے جو تمام اہم مآخذِ کتب و مخطوطات کی عام استفادے کے لیے مائیکروفلمنگ کرے۔ موضوعات اور معیار کے سلسلے میں فاضل مصنف نے مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر عندلیب شادانی کی وقیع کاوشوں کا ذکر کیا ہے اور اُن اداروں کا بھی جن میں محفوظ مخطوطات اور نوادر محققین کے لیے نہایت اہمیت رکھتے ہیں۔ جہاں تک اصولِ تحقیق کا تعلق ہے ہمارے ہاں اس ضمن میں ترتیب و تدوینِ متون پر خاطر خواہ کام نہیں ہوا۔ البتہ پہلی بار ممتاز محقق ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں نے توجہ دی۔ ان کا مقالہ 'فنِ تحقیق' سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح اردو میں لسانی تحقیق کا آغاز حافظ محمود شیرانی اور مولوی عبدالحق کی کاوشوں کا مرہونِ منت ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کی تصنیف ''اردو زبان کا ارتقاء'' اہمیت کی حامل ہے۔ مصنف نے یہاں اردو کے ساتھ علاقائی زبانوں کے تعلق کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ اردو کی بین الاقوامی ساخت کی تشکیل و تدوین کے حوالے سے ڈاکٹر عبدالحق کے مبسوط تحقیقی مقالے ''فارسی شاعری کا اثر اردو شاعری پر'' اور ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں کا مقالہ ''فارسی پر اردو کا اثر'' کا ذکر خصوصیت کا حامل ہے۔ لغات کے سلسلے میں سخاوت مرزا کی تحقیقی کاوش مقالہ بعنوان ''تحقیقاتِ الفاظِ ہندی غرائب اللغات'' کے ساتھ ساتھ سید مصطفیٰ علی بریلوی کی تخلیق ''انگریزوں کی لسانی پالیسی'' کو بھی لسانی تحقیق کے ضمن میں پیش کیا گیا ہے۔

ادبی تحقیق کے حوالے سے ملک میں جو کام ہوا ہے فاضل مصنف نے اُس کا جائزہ بھی بالاستیعاب لیا ہے جس میں نئے فنون کی دریافت و تدوین میں نظم و نثر دونوں شامل ہیں۔ پاکستان میں تذکروں کے تعلق سے بتایا گیا ہے کہ یہ کام تین شکلوں میں ظہور پذیر ہوا ہے یعنی قدیم غیر مطبوعہ تذکرے شائع کیے گئے دوسرے قدیم تذکروں کو تصحیح متن اور ترمیم و تخفیف کے ساتھ شائع کیا گیا اور سوئم نئے تذکرے لکھے گئے۔ مجلسِ ترقی ادب لاہور کی شائع کردہ کتاب

''مجموعۂ نثر غالب'' پر خلیل الرحمٰن داؤدی نے جس محققانہ بصیرت و کاوش سے کام کیا اُس پر فاضل مصنف نے انھیں خراج تحسین پیش کیا ہے البتہ ادب کی مختلف اصناف کے تحقیقی جائزہ پر مشتمل کام تو ہوا ہے مگر صاحب تصنیف کے خیال میں وہ بہت زیادہ قابل اطمینان نہیں البتہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی کاوشیں اس سلسلہ میں وقیع حیثیت رکھتی ہیں اُن کی ''تاریخ ادب اردو'' کی دو جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ادبی صحافت کے حوالے سے زیر تبصرہ کتاب میں مبسوط انتقادی جائزہ لیا گیا ہے اور جامعاتی سطح پر عدم توجہی کا گلہ بھی۔

لسانی تحقیق پر فاضل مصنف نے کافی کچھ لکھا ہے اور اردو میں روایتی اور تاریخی اصولوں کے تحت لسانی تحقیق کے آغاز کا سہرا حافظ محمود شیرانی اور نصیر الدین ہاشمی کے سر باندھا اور بعد میں جن اصحاب نے اس روایت کو آگے بڑھایا ان میں وحید الدین سلیم پانی پتی اور پنڈت دتا تریہ کیفی کے بعد ڈاکٹر عبدالستار صدیقی۔ عبدالقادر سروری۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ ڈاکٹر گیان چند۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور شامل ہیں۔ جنھوں نے ۱۹۲۹ء میں لندن میں 'ہندوستانی صوتیات' کے موضوع پر مقالہ لکھا۔

زیر نظر تصنیف میں ایک قابل ذکر مقالہ بعنوان ''بھارت میں دکنی تحقیقات کا عہد حاضر'' شامل ہے جس کا آغاز فاضل مصنف درج ذیل جملے سے کرتے ہیں۔

> ''دکنیات سے متعلق مطالعے کا آغاز۔۔۔ اردو تحقیق کے متعدد موضوعات کی طرح گارساں دتاسی ہی سے ہوتا ہے جب اس نے پیرس میں ۱۸۳۱ء میں پہلے پہل ولی کا دیوان مرتب کر کے شائع کیا''

بات کو پھر اس طرح آگے بڑھایا گیا ہے کہ ایک مکمل باب رقم ہو گیا۔ جس میں کثیر تحقیقی مواد شامل کیا گیا ہے اور جن فاضل سکالرز نے ادبی تحقیق کو تاریخ کا لازوال حصہ بنا دیا اُن بے شمار اسمائے گرامی میں آغا نصیر الدین ہاشمی (دکن میں اردو۔ ۱۹۲۳ء) شمس اللہ قادری، مولوی عبدالحق ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور عبدالقادر سروری وغیرہ شامل ہیں۔ سقوط حیدر آباد کے دکنیات

کے مطالعہ اور تحقیق کی ایک متوازی روایت نے پاکستان میں بھی فروغ پایا۔

تحقیق و تنقید کے درمیان باہمی انجذاب کی صورت میں مصنف کی محققانہ رائے ہے کہ بعض علمائے ادب نے ادب اور تحقیق کو دو متوازی رویوں سے متصف کیا ہے۔ تاہم کلیتہً یہ قرار پاتا ہے کہ عملِ تحقیق کے لیے تنقید پر انحصار لازمی ہو جاتا ہے۔ رہا معیاری رسمیات تحقیق میں اصول و ضوابط کا سوال تو صاحبِ کتاب کو دکھ اس بات کا ہے کہ "تحقیق و تصنیف کے جو معیاری اور سائنسی اصول و ضوابط ایک عرصے سے عملی دنیا میں مروج ہیں ہمارے بہت کم محققین و مصنفین کو ان سے واقفیت حاصل ہے۔"

جہاں تک جامعات میں تحقیق کے فروغ کا تعلق ہے تو اس باب میں ڈاکٹر صاحب نے صورت حالات اور مشکلات کا معروضی جائزہ بڑے شرح و بست کے ساتھ لیا ہے اور کم و بیش دو درجن اسباب کی نشان دہی فرمائی ہے اس مفروضے کے ساتھ کہ پاکستان میں تحقیق کے موثر اور فعّال ادارے جامعات ہیں لیکن اعلیٰ تعلیمی کمیشن کی راہ میں متعدد مسائل و مشکلات ہیں اور اُسے مکمل طور پر قوت نافذہ حاصل نہیں۔ بعض جامعات بوجوہ تحقیق کے معیار اور اُس کے فروغ کے لیے سرگرم نہیں۔ اساتذہ کی اکثریت تحقیق سے گریزاں ہے۔ جامعات میں کسی موثر تادیبی نظام کی غیر موجودگی۔ نگران اساتذہ کے انتخاب میں عدم احتیاط۔ اکیڈمک کونسل کی ہیئت میں تبدیلی کی ناگزیر ضرورت وغیرہ وغیرہ

معاشرتی علوم اور ادبیات میں تحقیق کے مسائل و مشکلات بھی کچھ کم سنجیدہ اور کٹھن نہیں، تاہم اس موضوع کا بھی دقتِ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے اور اصلاحِ احوال کے لیے پورے غور و فکر کے بعد قابلِ عمل تجاویز دی گئی ہیں اور فاضل مصنف نے بڑی دلسوزی سے لکھا ہے "میری معلومات "مشتے از خروارے" پرتی ہیں۔ جن مسائل و مشکلات اور عدم توجہی سے ہماری جامعات میں تحقیق دو چار ہے مجھے یقین ہے میں اُن سب کا احاطہ نہیں کر سکا ہوں لیکن یہ موضوع ہم سب کی اور متعلقہ ذمہ دار افراد اور اداروں کی توجہ چاہتا ہے۔"

'ہماری جامعات کے اردو مجلوں کا معیار المیہ اور سدِ باب' کے زیرِ عنوان ایک صاحب علم و دانش کی حیثیت سے مصنف نے جن حقائق سے پردہ اُٹھایا ہے راقم الحروف میں ہرگز تاب نہیں کہ بطور تجزیہ یا تبصرہ ایک حرف بھی نوکِ قلم پر لا سکے۔ معزز قارئین ہی شاید اس درد و کرب کی کیفیت سے گزرنے کی طاقت رکھتے ہوں! راقم زیرِ نظر کتاب میں فاضل مصنف کی سرقہ پر مبنی ایسے نام نہاد تحقیقی مقالوں کی نشان دہی پر بھی قلم آرائی کرنے سے معذرت خواہ ہے کہ قارئین اور فاضل مصنف کے درمیان حائل ہونا سعیِ لاحاصل کے مترادف ہوگا۔ اردو کی ادبی تاریخیں، البتہ ایک ایسا اہم موضوع ہے کہ جس سے خود بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے اور قارئین کرام بھی مستفید ہو سکتے ہیں۔

''اردو کی ادبی تاریخیں''۔۔۔ اس موضوع پر ڈاکٹر عقیل نے نہایت قیمتی مواد مہیا کیا ہے۔ آپ نے آغاز ہی میں قاضی عبدالودود کے مقالات، گارساں دتاسی کی ''تاریخِ ادبیاتِ ہندوی و ہندوستانی'' کا ذکر کر کے تحریر کا عالمانہ رُخ متعین کر دیا ہے یقیناً یہ عمدہ تحقیقی مطالعہ کی مثالیں ہیں اور یہ بھی بجا طور پر کہا ہے کہ ڈاکٹر گیان چند کی مبسوط اور جامع تصنیف ''اردو ادب کی تاریخیں'' اپنے موضوع پر حرفِ آخر کہی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس قول کی تائید میں جو وضاحت پیش کی ہے وہ بھی علم افروزی کی مظہر ہے۔ نیز آخر میں بعض تحقیقی صداقتوں کی جانب اشارہ کر دینا اور ناواجب تنقید کا تاثر زائل کرنے کی سعی ڈاکٹر صاحب کی عالی ظرفی کا ثبوت ہے۔ کتاب میں شامل اُن کے دیگر مضامین مثلاً 'تعلیقاتِ خطبۂ گارساں دتاسی'۔ 'سیدان بادشاہ گر'، 'تاریخ تبادلیاں' اور 'تحقیق میں سرقے کی عالمی مثالیں' صاحب تصنیف کی گراں مایہ علمی بصیرت اور محققانہ صلاحیتوں کے خرد افروز مظاہر ہیں۔

کتاب کے چوتھے اور آخری باب کا آغاز، صاحب کتاب نے ایک نہایت اہم موضوع یعنی مخطوطات سے کیا ہے لیکن ان مخطوطات کے لیے بنیاد جناب مشفق خواجہ کی کتاب ''جائزہ مخطوطات اردو'' نے مہیا کی ہے۔ خواجہ صاحب کو ڈاکٹر عقیل نے اس تحقیقی کارنامے پر زبردست

خراج تحسین پیش کیا ہے اور اس ضمن میں اُن کے پیش رو کارناموں یعنی سعادت حسن خاں کے تحریر کردہ اردو شعراء کے معروف تبصرے 'خوش معرکۂ زیبا' کی ترتیب اور تصحیح متن اور اس پر طویل تحقیقی مقدمے کو ڈاکٹر صاحب نے ایک مثالی اور اہم کارنامہ قرار دیا ہے اور وہ مرحوم خواجہ صاحب کے اس عظیم وصف کو بابائے اردو مولوی عبدالحق اور انجمن ترقی اردو سے طویل قرب کا فیضان سمجھتے ہیں، اُن کے خیال میں 'جائزۂ مخطوطاتِ اردو' کی اشاعت سے اردو تحقیق میں ایک منفرد، مثالی اور مفید اضافہ ہوا ہے۔ کئی اہم مخطوطات سامنے آئے ہیں اور متعدد گم شدہ مآخذ کے بارے میں معلومات یکجا ہوئی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے مزید لکھا ہے کہ بنیادی طور پر یہ کتاب دو سو مخطوطات کی وضاحتی فہرست پر مشتمل ہے جو کراچی کے متعدد سرکاری اور نجی کتب خانوں کی ملکیت ہے۔ اس میں کتابوں اور مصنفین کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ جن مخطوطات پر حواشی تحریر کیے گئے ہیں اُن میں سے متعدد مخطوطات بے حد اہمیت کے حامل ہیں جن تک دیگر محققین کی رسائی ممکن نہ ہو سکی مثلاً ادبیات کے تحت ''دیوانِ اختر'' 'دیوانِ جویا' 'دیوانِ ظہیر' 'دیوان قدرت' (دوم) 'دیوان مشتاق' وغیرہ پہلی بار ادبی دنیا کے سامنے آئے ہیں۔ ولی، میر حسن، انشاء اور تاریخ پر ان مشاہیر کے مخطوطات کے بعض مزید نسخے بھی دریافت کیے گئے ہیں۔

''اردو نثر کے ارتقا میں علماء کا حصہ'' ایک اور اہم تحریر ہے۔ مصنف کو شکوہ ہے کہ اردو زبان بالخصوص نثر میں مذہبی اہل قلم کی نگارشات کو درخور اعتناء نہیں سمجھا گیا۔ تاہم اٹھارویں صدی تک جو بھی نثری نمونے دستیاب ہوئے ہیں اُنھیں تبرکاً ادبی جائزوں میں شامل کیا گیا ہے۔ مثلاً شاہ عبدالقادر۔ شاہ رفیع الدین۔ شاہ اسمٰعیل شہید اور مولانا خرم علی بلہوری نظر آتے ہیں لیکن ہمارے ادبی مورخوں اور محققوں نے اس جانب خاطر خواہ توجہ مبذول نہیں کی۔ تاہم اس خلا کو کم از کم شمالی ہند کی حد تک اور آغاز سے ۱۸۵۷ء تک ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے اپنی تصنیف "اردو نثر کے ارتقاء میں علمائے کرام کا حصہ" سے پُر کیا ہے۔ یہ تصنیف مصنف کے انتقال (نومبر ۱۹۸۳ء) کے بعد منظر عام

پر آئی۔ دراصل یہ ان کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر جامعہ کراچی نے اُنھیں ڈاکٹریٹ کی سند عطا کی۔

پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل نے اسی نوع کا ایک اور مقالہ بعنوان ''محمد حنیف آزاد کی ایک غیر معروف تصنیف۔۔تذکرہ علماء'' اپنی زیر نظر کتاب میں شامل کیا ہے نیز ایک اور تحقیق کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ آزاد بلگرامی کا تذکرہ ''مآثر الکرام' بڑی حد تک محمد حسین آزاد کے اس تذکرے کا محرک اور بنیادی ماخذ معلوم ہوتا ہے۔ اس تذکرے میں شامل علماء میں پہلا نام مسعود سعد سلمان کا اور آخری نام آزاد بلگرامی کا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاید اسے وہ زمانی اعتبار سے مرتب کرنا چاہتے تھے لیکن آزاد بلگرامی (متوفی ۱۷۸۶ء) پر پہنچ کر رُک گئے اور مزید اپنے دور تک نہ بڑھ سکے۔

زیر نظر کتاب کے آخری باب میں ایک اور توجہ طلب مضمون بعنوان ''تاریخ مشغلہ'' شامل ہے۔ یہ ایک مخطوطہ ہے جو محمد اکرام چغتائی کو وی آنا (آسٹریا) کے قومی کتب خانے کے شعبۂ مخطوطات میں دستیاب ہوا۔ چنانچہ اپنے مفصل مقدمہ اور ضروری تعلیقات کے ساتھ اُسے انھوں نے مرتب کر کے شائع کر دیا۔ یہ ۴۶ خطوط پر مشتمل مجموعہ ہے جو سلطان اودھ واجد علی شاہ نے مشغلہ السلطان نواب آبادی بیگم کو لکھے تھے۔ محمد اکرام چغتائی نے 'تاریخ مشغلہ' سے اس خاتون کے بارے میں چند اشارے اخذ کیے ہیں اور واجد علی شاہ سے اس کے روابط پر مقدمہ میں بڑی محنت سے روشنی ڈالی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک طوائف تھی اور رقص و موسیقی میں ماہر تھی۔ شعر و شاعری سے شغف تھا اور کبھی کبھی خود بھی شعر کہتی تھی۔

زیر نظر تصنیف کے باب چہارم میں بعض اہل قلم شخصیات پر اور بھی مفید مضامین اضافہ کیے گئے ہیں۔ جن میں 'غالب اور عصر غالب' کے مصنف ڈاکٹر محمد ایوب قادری اور اردو تحقیق میں انفرادیت کی ایک مثال حسام الدین راشدی اور تحقیق میں اخلاص اور سنجیدگی کی ایک اور مثال: نور السعید اختر شامل ہیں۔

صاحبِ کتاب نے باب چہارم کے اختتام پر ایک ضمیمہ بعنوان ''رسمیاتِ مقالہ نگاری'' شریکِ اشاعت کیا ہے۔ یہ ضمیمہ خصوصاً جامعات میں ریسرچ میں مصروف طلباء و طالبات کے لیے نہایت مفید اور ایک رہنما دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے جس میں تحقیقی مقالہ نگاری کے سائنٹفک اصول بیان کیے گئے ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل نے زیرِ نظر کتاب مرتب کر کے ایک نہایت وقیع و ارفع کارنامہ انجام دیا ہے جس پر وہ بجا طور پر داد و تحسین کے مستحق ہیں کہ اُن کی یہ کاوش تحقیقی ادب میں بیش بہا اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

مراسلات

بیرسٹر سلیم قریشی ۔لندن (برطانیہ)

سالنامہ ۲۰۱۵ ملا۔ یہ سالنامہ دانشوروں کے حاصل علم اور فکر کا نچوڑ ہے۔ سر ورق پر آپ نے جامعۂ نظامیہ حیدرآباد (دکن) کی سادہ لیکن پُر وقار عمارت کا عکس دیا ہے جس کے در یچے روشن ماضی کی جھلک دکھاتے ہیں۔ اس قدیم گہوارۂ علم وادب پر آپ کی تحریر اس کے ماضی اور حال پر کما حقہ، روشنی ڈالتی ہے۔ جناب غلام ابن سلطان کی تحریر "دکن میں اردو ادب کا ارتقا" ماضی کے ادوار کی طرف لے جاتی ہے جہاں آسمانِ ادب پر روشن ستارے اُردو ادب کے ارتقا پر روشنی ڈالتے ہیں۔ جناب غلام ابنِ سلطان کی تحریر تاریخ، جغرافیہ اور ادب کا دلچسپ مرقع ہے۔

آپ کا اداریہ "اردو ایوانِ عدل میں" ماضی کے ان اداریوں کا تسلسل ہے جو آپ اردو کو عملی طور پر پاکستان کی قومی زبان بنانے کے لیے لکھتے رہے ہیں۔ اب لگتا ہے کہ آپ کی کاوشیں بھی رنگ لا رہی ہیں۔ اس گونگی قوم کو زبان دینے میں آپ کی کاوشوں کا بھی بڑا حصّہ ہے۔ ذیلی اداریہ "تن ہمہ داغ داغ شد" میں آپ نے نظامِ تعلیم کی اعلیٰ ترین سطح پر علم کی خرید وفروخت کرنے والوں کی خبر لی ہے اُمید ہے کہ علم کی خرید وفروخت کے یہ تاجر بھی اپنی دکان اُٹھا کر چل دینگے۔ سالنامے کا ہر مضمون دانشوری اور فکر کا ذخیرہ لیے ہوئے ہے:

ہر ست جلوہ ہائے معانی کی سیر کر　　گھونگھٹ الٹ دیا ہے عروسِ خیال کا

اقبال پر جناب محمد ادریس جعفری، ڈاکٹر طاہر حمید تنولی۔ ڈاکٹر خلیل طوقار اور پروفیسر نغمہ زیدی کے مضامین قابل ذکر ہیں ڈاکٹر خلیل طوقار کی تحریر "مولانا جلال الدین رُومی اور علامہ محمد اقبال" پر تحریر میں علم وادب کے دو دریا ملتے ہیں جو علم و دانش کے موتی بہا رہے ہیں۔

؎ محروم رہے دولتِ دریا سے وہ غواص　　کرتے نہیں جو ساحلِ دریا سے کنارہ

"یادِ رفتگان" کے زیرِ عنوان لکھنے والے پروفیسر غلام شبیر رانا، ڈاکٹر عطش درّانی۔ ڈاکٹر

گل ناز بانو اور محترمہ رضیہ کاظمی نے آسمانِ ادب پر روشنی پھیلانے والے اُن ستاروں کا ذکر کیا ہے جو اب کسی اور جہاں کے آسمان کی زینت بنے ہیں۔

حصۂ نظم میں جناب شفق ہاشمی کا سورۂ والشمس اور اُمّ المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ اور سیدنا حسّان بن ثابت کے عربی اشعار کا منظوم ترجمہ بہت اچھا ہے۔ محترمہ آمنہ عالم کا آیۃُ الکرسی کا منظوم ترجمہ بھی ایک اچھی کوشش ہے۔ مراسلات میں جناب محمد طارق غازی کا مراسلہ اردو اور اردو رسم الخط (بحوالہ ڈاکٹر طوق آر) اردو کی تاریخ پر ایک سیر حاصل تبصرہ ہے معلومات سے بھرپور اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ لکھنا تو اور بھی تھا لیکن فی الوقت اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

شجاع طلعت۔ بیلویو۔ واشنگٹن (امریکہ)

عید سعید مبارک۔ رمضان سے چند یوم قبل سالنامہ ۲۰۱۵ء وصول ہوا تھا۔ ماشاءاللہ ۴۰۰ صفحات سے متجاوز یہ شمارہ ایک عام کتاب سے زیادہ ضخامت رکھتا ہے اور اس لیے اسے قسطوں میں پڑھے بغیر چارہ نہیں۔ شکر ہے کہ الاقرباء سہ ماہی ہے، بالفرض اگر یہ ماہانہ ہوتا تو اس کے مطالعہ کے ساتھ انصاف قطعاً ناممکن ہوتا۔ اقبالیات پر جتنے معیاری و تحقیقی مضامین اور مقالے الاقرباء میں شائع ہوتے ہیں شاید ہی کسی اور رسالے میں شائع ہوتے ہوں۔ اگر میں غلط ہوں تو میری تصحیح فرما کر ممنون فرمائیے۔ اس ضمن میں صرف ایک مودبانہ گزارش آپ کے توسط سے اقبال پر لکھنے والوں کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں اور وہ اس امید و التجا کے ساتھ کہ میری گزارش پر غیر جانبداری اور حقیقت پسندی سے غور فرمایا جائے۔ ہم جس دور سے وابستہ ہیں اسمیں بدقسمتی سے اردو سے جو کہ ملک کی قومی زبان ہے اور جس میں ہماری تہذیب کا بیش بہا اثاثہ موجود ہے مجرمانہ عدم توجہی برتی جارہی ہے، خود الاقرباء کے اداریے بھی اس پر نوحہ کناں ہیں۔ ''اشرافیہ'' تو انگریزوں کی ذہنی غلامی میں گرفتار ہے اس لیے اگر یہ طبقہ اردو میں بات بھی کرتا ہے تو انگریزی لب و لہجہ میں کرتا ہے اور اردو میں متبادل الفاظ کے باوجود انگریزی الفاظ کی منہ چڑا کر ادائگی کرتا ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ایک وقت تھا کہ شریف اور تعلیم یافتہ خاندانوں کو فارسی دانی میں امتیاز حاصل تھا اور عوام

کو بھی فارسی زبان کی کسی حد تک شُد بُد تھی۔ عام بیٹھکوں اور مجلسوں میں گفتگو اردو و فارسی اشعار سے مزیّن ہوا کرتی تھی، مگر افسوس وہ زمانہ ہَوا ہوا۔ خوشی کی بات ہے کہ الاقربا کے اکثر مصنفین اس حقیقت سے واقف ہیں اور فارسی اشعار کا ترجمہ فراہم فرما کر اقبالیات کے شوقِ مطالعہ کو مہمیز کرتے ہیں، جو اہلِ قلم یہ تصور کرتے ہیں کہ تمام قاری ان ہی کی طرح فارسی جانتے ہیں اور فارسی اشعار کا ترجمہ فراہم نہیں کرتے وہ عشاقانِ اقبال کو نہ صرف محروم مطالعہ کرتے ہیں بلکہ دل شکنی بھی کرتے ہیں۔ میں ڈاکٹر مظہر جاوید، پروفیسر نغمہ زیدی، ڈاکٹر شاہد اقبال کامران، اور ڈاکٹر جلال سوئیدان کے علاوہ بھی بے شمار ایسے مقالہ نگاروں کے ناموں کی فہرست فراہم کر سکتا ہوں جو اس جریدہ میں فارسی اشعار کے تراجم فراہم کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں مجھے یقین ہے کہ اقبالیات کے بے شمار قاری خصوصاً دیارِ مغرب میں میرے ہمنوا ہوں گے۔ حالیہ شمارہ میں ڈاکٹر خلیل طوقار اور ادیس جعفری صاحبان کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اقبال کے فارسی اشعار کا اردو ترجمہ فراہم کر کے قارئین کے لیے تفہیم کو سہل کر دیا ہے ورنہ ہمت شکنی ہوتی ہے اور غیر فارسی داں قاری، شاعرِ مشرق کے فلسفہ اور اسرار و رموز شاعری سے محروم رہتا ہے، یہ ایک بڑی محرومی ہے مجھے امید ہے کہ آئندہ شماروں میں اقبال پر لکھنے والے فارسی ناشناس اور ہم جیسے دور افتادہ عشاقانِ اقبال کے ساتھ لطف و کرم سے کام لیں گے اور فارسی کے سلسلہ میں ہماری کم مائیگی کا لحاظ رکھتے ہوئے فارسی اشعار کے اردو تراجم فراہم کریں گے۔ اللہ انھیں جزائے خیر دے۔ والسلام

پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل۔ کراچی

منصور عاقل صاحب الاقربا کا تازہ شمارہ آپ کے دونوں بے حد دردمندانہ اداریوں اور جامعہ نظامیہ جیسے عمدہ مقالات کے ساتھ ابھی کچھ دیر پہلے موصول ہوا۔ بے حد خوشی کا سبب بنا۔ یہ اداریے تو کتابچوں کی صورت میں ہر ذمے دار فرد اور ہر افسر کی میز تک پہنچ جائیں، مجھ مایوس فرد کی جانب سے ان کی تصنیف پر تہِ دل سے مبارکباد قبول فرمایئے۔ آپ نے فرضِ کفایہ ادا کیا ہے۔

طارق غازی (ٹورانٹو) کینیڈا ☆

جب آپ مراجعت فرمائے وطن ہوں گے تو امید ہے یہ خط مع دیگر مراسلات آپ کی میز پر ہوگا۔ آپ سے جو ملاقاتیں یادگار رہیں۔ مختصر اور قلیل تھیں، زیادہ ہوتیں تب بھی احساس یہی ہوتا۔ کیسے کیسے اہم موضوعات پر آپ کے خیالات سے استفادہ کیا، کتنے امور پر تبادلہ خیال کیا۔ وہ نکات بھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں قلم کی راہ پالیں گے۔ ملاقاتیں زیادہ نہ ہوسکیں تو اس میں میری کوتاہی کا دخل ہے۔ میں اس شہر عظیم میں بے کار بھی ہوں اور بے بس بھی۔ کار نہ چلاتا ہوں نہ رکھتا ہوں عہد نو میں یہ بڑی دلیل ہے آدمی کی بے کاری کی۔ اور ٹورانٹو میں بسوں کا نظام کچھ اس قدر بے ہودہ ہے کہ ڈیڑھ برس میں بھی میری سمجھ میں نہ آسکا۔ تو آدمی کا بے بس ہونا باور آیا۔ اس تفصیل کا غمزۂ غماز یہ ہے کہ تہذیب جدید میں وہی جیتا ہے جو اپنی حماقتوں یا ناکارہ پن کو دوسرے کے سر تھوپ کر فٹ پاتھ پر ایک کنارے کھڑا ہو جائے اور تماشا دیکھے۔ چنانچہ میری بے کاری اور بے بسی کا الزام بھی اس شہر کے سر سہی۔ اس رمضان میں ایک کام یہ ہوا کہ تہذیبوں پر زیر قلم کتاب مکمل ہوگئی۔ اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ اسی کتاب کا ایک اور باب ملت کے تصور پر الاقرباء کے بالغ نظر قارئین کی نذر کر رہا ہوں۔

مجھ ناکارہ کی ایک صفت یہ ہے کہ دن رات لکھنے کے کام میں مبتلا رکھیے کبھی جو حرف شکایت زبان پر لاؤں۔ مگر اپنے لکھے کو چھاپنا اور چھپوانا مجھے نہیں آتا اور چھاپنے چھپوانے والا میرے ہاتھ لگتا نہیں۔ سارے چھپوارے کسی نہ کسی نظریے کے نمائندے ہیں۔ میں بھی کسی نہ کسی نمائندگی کی ووٹر لسٹ میں تو شائد ہوں مگر چاہوں کہ پولنگ افسر کے پاؤں لوں تو وہ سر کو آتا ہے

فرقہ فرقہ بکھر گئی دنیا ہم فقیرانِ دہر تنہا ہیں

☆ فاضل مراسلہ نگار کا اشارہ راقم کے حالیہ دورہ کینیڈا کی طرف ہے (منصور عاقل)

آزاد بندوں کی دنیا کا کوئی شہر یار توجہ کرے تو کیا عجب جو ہفت خواں طے ہو جائے وہ تو پتا نہیں کب کی کوئی نیکی کام آ گئی کہ برادرم اویس جعفری صاحب کے توسط سے آپ سے تعلق ہو گیا اور آپ عنایات بے پایاں کا وہ بحر اطلس ثابت ہوئے کہ میرے قلم پارے اہل علم تک پہنچنے لگے اور بڑے محترم و ممتاز اہل قلم کے جلوس میں ہم بھی شامل ہو گئے۔

خود کو ہم خوب خوب جانتے ہیں　　ہم کہاں اس جہاں میں یکتا ہیں
لوگ کیا کیا گمان رکھتے ہیں　　اہل دنیا میں ہم بھلا کیا ہیں

ڈاکٹر نجمہ ملک۔ کراچی

الاقرباء پابندی سے مل رہا ہے۔ شکریہ سالنامہ ۲۰۱۵ء ماشاءاللہ بہت ضخیم ہے اور سابقہ شماروں کی طرح اپنے دامن میں نظم و نثر کی ایک کہکشاں لیئے آیا ہے۔ اداریے منفرد اور مثبت انداز فکر کے حامل، معیاری مضامین ہمارے ادب میں یقیناً ایک قابل قدر اضافہ، وجد آفریں حمد و نعت اور کیف آگیں سلام و منقبت، اعلیٰ تراجم، تاریخ کے دریچوں سے جھانکتی ہوئی فتح و نصرت کی روشنی کے ساتھ ساتھ دعوت عبرت اور سبق آموزی، عالمی ادب پر فاضلانہ تحریریں، نفیس انشائیے، پرکشش افسانے، یاد رفتگاں میں جدا ہونے والوں کی شخصیات و رخدمات، نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھی ہوئی جدید تخلیقات کا تعارف اور اقبالیات پر قابل قدر تحقیقی مقالے، غرض ہمارے ادبی افق پر یہ جریدہ اپنا ایک جداگانہ اور منفرد مقام رکھتا ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ اسے قائم و دائم رکھے اور اس کی مقبولیت میں مزید اضافہ فرمائے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے کہ اس کا پرچم بیرون ملک بھی لہرا رہا ہے۔ الاقرباء کی انجمن کے اہل قلم قابل مبارکباد اور لائق ستائش ہیں۔ زبان، علم و ادب کے سلسلہ میں اللہ تبارک و تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور انہیں اجر عظیم سے نوازے۔ آمین والسلام

پروفیسر ڈاکٹر سید محمد عارف۔ بہاول پور

ایک عرصے بعد عریضہ ارسال کر رہا ہوں۔ دو سال قبل فالج کا حملہ ہوا تھا۔ صاحب فراش

رہا۔ اللہ کا شکر ہے اب بہتر ہوں۔

سہ ماہی ''الاقربا'' کے سلسلے میں ایک حیرت انگیز واقعہ گوش گزار کرنا چاہتا ہوں، لیکن اس سے پہلے اس بات کے لیے بے حد ممنون ہوں کہ آپ کے مجلّے کی بلاتعطل ترسیل جاری ہے۔ آپ کی کتب ملیں وہ بھی بالاستیعاب پڑھ لیں۔ افسوس کہ اپنی طبیعت کی خرابی کے سبب ان پر میں ابھی تک کچھ نہ لکھ سکا۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں لکھوں۔ دیکھیے خدا توفیق دے اور ہمت دے۔ آپ کے مجلّے میں ویسے تو سب ہی چیزیں وقیع ہوتی ہیں لیکن اویس جعفری صاحب کی شاعری نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا۔ جی چاہتا ہے ان کا پورا مجموعۂ کلام میرے سامنے ہو۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ عرض کرنا چاہتا ہوں وہ آپ کے مجلّے میں چھپنے والے افسانے ''پاندان'' سے متعلق ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ''الاقربا'' جب ڈاک سے ملتا ہے تو اہلیہ اسے شوق کے ہاتھوں کھولتی ہیں، اور چیدہ چیدہ چیزیں پڑھتی ہیں۔ ''پاندان'' والا شمارہ جب پہنچا تو ورق گردانی کرتے ہوئے اس افسانے پر نظر پڑی تو اس کی ابتدائی چند سطور ہی نے انھیں مسحور کر لیا اور مجھ سے کہا کہ دیکھیں کس قدر عمدہ اور رواں زبان ہے اور بلند آواز سے پڑھنا شروع کر دیا۔ مجھے تو ایسا لگا کہ یہ الہامی الفاظ میرے کانوں میں رس گھول رہے ہیں۔ وجہ یہ کہ میری والدہ دہلی کے ایک نہایت ہی وقیع علمی گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ ستانوے برس کی عمر میں ۲۰۰۵ء میں انتقال ہوا۔ میری عمر بھی ستر برس کے قریب ہو رہی ہے۔ عمر بھر والدہ سے دہلی زبان سنتا رہا جو اس افسانے میں ایک طویل عرصے بعد دیکھنے کو ملی۔ یہ زبان تحریری صورت میں ''شاہد احمد دہلوی'' پر پی۔ ایچ۔ ڈی کرتے ہوئے ناصر نذیر فراق دہلوی کے ہاں پڑھی تھی اسی کا عکس شاہد مرحوم کی تحریروں میں بھی ملتا ہے۔ سو اس افسانے سے میری دلچسپی تو گہری اور فطری تھی۔ لیکن اصل حیرت کی بات جو میں بیان کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ ان دنوں میرے ہاں بارہ تیرہ برس کی ایک سرائیکی بچی گھریلو کام کے لیے ہمارے ہاں رہ رہی تھی وہ بھی کھڑی غور سے سنتی رہی۔ ان پڑھ مزدور گھرانے کی بچی!۔۔۔ مجھے تعجب ہوا کہ یہ کیا سمجھ رہی ہوگی۔ لیکن جونہی افسانہ ختم ہوا اس نے بڑی شدت

سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اسے پھر سنائیے۔ میں نے کہا اب وقت نہیں ہے شام کو خود میں سناؤں گا۔ میں نے سوچا کہ شام تک بھول بھال جائے گی۔ شام کو جب مجھے فارغ بیٹھا دیکھا تو رسالہ لیا اور میرے پاس پہنچ گئی کہ سنائیے۔۔ اس کا اتنا تجسس دیکھ کر میں نے اس سے پوچھا کہ سمجھ میں بھی آرہا ہے۔۔؟ اس نے ہاں میں سر ہلایا۔ اس نے پاندان کی کچھ خاص چیزوں کے نام ہم سے سن رکھے تھے، اس نے سیدھے سادے الفاظ میں بس اتنا کہا کہ مجھے سننے میں بڑا مزہ آرہا ہے۔ گویا وہ اسلوب بیان کی مٹھاس، لفظوں کی نرمی اور روانی کی تعریف کررہی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس افسانے میں تہذیب قدیم کی تفصیلات اس طرح بیان کی گئی ہیں کہ کہیں ذرا سا بھی جھول نہیں ہے۔ یہی وہ زبان اور اسلوب ہے جو اردو کی ہمہ گیریت کا ایک قوی سبب ہے۔ دورِ حاضر میں بقول ڈاکٹر جمیل جالبی اسالیب نثر کے تپتے صحرا میں یہ ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا ہے۔ قومی زبان کی بڑھتی ہوئی کرختگی کو دور کرنے کے لیے ایسے اسلوب کی ترویج کی بڑی ضرورت ہے۔
آپ نے بجا طور پر "الاقربا" میں چھپنے والے افسانوں میں اسے بہترین قرار دیا ہے۔ لیکن اس کے بعد آپ کے مجلّے میں ان ہی کے افسانوں کو زبان کی خوبصورتی اور بے جھول مٹھاس اور لطافت کے شوق میں پڑھا لیکن زبان کی شیرینی، روزمرہ اور محاوروں کی وہ بات مفقود تھی، جو بات "پاندان" میں ہے۔ نہ معلوم کس رو میں یہ افسانہ ان کے قلم سے نکل گیا، جو اُن کے آباواجداد میر ناصر علی اور خواجہ نذیر فراق کی تحریروں کا خاصہ ہے۔ ان کے چند افسانے پڑھ کر باقی افسانوں کو انہی افسانوں پر قیاس کروں یہ ان کے خود کے افسانوں میں منفرد اور سرفہرست معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ اردو میں منشی پریم چند سے غلام عباس تک کیسے کیسے کمال کے افسانے ہیں یہ افسانہ ان میں شامل ہونے کے لائق ہے۔ عبدالحلیم شرر کے "گذشتہ لکھنؤ" میں جہاں تہذیب لکھنؤ کی کمال کی تصویر کشی کی گئی ہے وہاں بھی پاندان کی جزویات ایسے حسین تہذیبی پس منظر میں نہیں ملتیں۔
آصف الرحمٰن صاحب کی تادیر سلامتی کے ساتھ دل سے یہ بھی دعا نکل رہی تھی کہ ان کے قلم سے "پاندان" جیسے افسانے اور پڑھنے کو ملیں لیکن افسوس یہ روشن باب بھی ختم ہوا "الاقربا" کے وسیلے

سے اردو زبان و ادب کے لیے آپ کی کاوشیں لائق تحسین ہیں، جو ہمارے وطن کی تہذیبی تاریخ میں ہمیشہ رہنمائی کرتی ہوئی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی رہیں گی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کو صحت و عافیت کے ساتھ سلامت رکھے۔ لکھنے کو بہت کچھ ہے ہمت جواب دے رہی ہے۔ دعاؤں کی درخواست کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں۔ انشاء اللہ اب میں اپنی تحریروں کے ساتھ حاضر ہوتا رہوں گا۔

پروفیسر سیدہ نغمہ زیدی۔ پشاور

خوشی ہے کہ آپ بیرون ملک کا دورہ مکمل کر کے تشریف لے آئے ہیں۔ اور ادبی سرگرمیوں میں حسب سابق سرگرم ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی ادبی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔

سالنامہ ''الاقرباء'' نظر نواز ہوا۔ آپ نے بہترین مقالات و مضامین اور منظوم ادب کی کہکشاں سجا ڈالی ہے۔ ہر تحریر دلفریب اور فکر انگیز ہے۔ یہ شمارہ ایک ایسا ادبی گلدستہ ہے جس کا ہر پھول جادوئی اور طلسماتی محسوس ہوتا ہے۔ اور اس کی خوشبو سے مشام جاں تادیر معطر رہیں گے۔

اردو زبان کے نفاذ کے سلسلے میں آپ کی کاوشیں قابل قدر ہیں۔ اور اس ضمن میں لکھے گئے اداریے ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حکومتوں کی مجرمانہ غفلت کا آپ نے جس بے باکی اور دردمندی سے پردہ چاک کیا ہے۔ وہ آپ کی قومی غیرت کا عکاس نظر آتا ہے۔ کاش ہمارے قائدین میں بھی اسی درجے کا احساس قومیت بیدار ہو جائے بہر حال اُمید بہار قائم رکھنی چاہیے۔ انشاء اللہ وہ دن دُور نہیں جب ہم اپنی زبان کو اس کا کھویا ہوا مقام دلوا پائیں گے۔ آثار تو ہویدا ہونے شروع ہو چکے ہیں۔ پو پھٹ چکی ہے۔ ظلمت شب بھی دُور ہو جائے گی۔ سرورق پر جامعہ نظامیہ حیدر آباد کی خوبصورت تصویر اور معلوماتی مضمون ایک اچھا سلسلہ ہے اسی طرح سرورق پر دی گئی عمارات کی تصاویر کے بارے میں آئندہ بھی معلومات بہم پہنچاتے رہیے تاکہ نئی نسل کو آگاہی حاصل ہو سکے۔ تمام مضامین و مقالات عمدہ ہیں۔ یہ آپ کا ذوق انتخاب ہے جو خوبصورت موتی چُن لیتا ہے۔ خاص طور پر محترم جناب اویس جعفری صاحب کا مضمون ''اقبال اور عشق

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم" اپنے منفرد اسلوب بیاں اور حرارت عشق سے دل کو سرشار کر گیا۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ اس طرح پروفیسر غلام شبیر رانا کا ڈاک لاکاں کے بارے میں مقالہ نہایت محنت اور دیدہ ریزی سے لکھا گیا ہے۔ عالمی ادیبوں کے بارے میں مقالات و مضامین الاقربا کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ اتنا پُر مغز مقالہ پیش کرنے پر رانا صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں۔ حصہ نظم میں تمام نظمیں، غزلیں، سلام اور منظوم تراجم بے مثال ہیں۔ غرض تمام مندرجات معلومات افزاء ہیں۔

یہ سال اُردو ادب کے گہر ہائے گراں مایہ چھین کر لے گیا۔ ڈاکٹر آصف الرحمٰن طارق، ڈاکٹر معز الدین، عبداللہ حسین، عقیل رُوبی، صابر لودھی، افضل توصیف کی وفات سے قصر ادب کے ایسے ستون گر گئے۔ جس سے عمارت ادب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ ان تمام ادیبوں کی خدمات بے مثال ہیں۔ ان کی تخلیقات آسمان ادب پر تا ابد درخشاں و تابندہ نظر آئیں گی۔ اللہ تعالیٰ اُن کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ (آمین)

یادرفتگاں اور گوشۂ ڈاکٹر آصف الرحمٰن طارق کے تمام مضامین نے دل کو غم و الم سے معمور کر دیا۔ "زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے" یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کو اپنی بے مائیگی اور بے بسی کا احساس ہوتا ہے کہ مشیت ایزدی کے سامنے سر تسلیم خم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ اور آپ کی صحت و تندرستی میں اضافہ فرمائے۔

میں اپنے قارئین کرام کی بھی بے حد شکر گزار ہوں۔ جنہوں نے میری کتاب "مطالعہ افکار اقبال" کی بے حد پذیرائی کی۔ اور ان کی پسندیدگی میرے لیے حوصلہ افزاء ثابت ہوئی۔ قارئین کرام کی آراء میرے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوتی ہیں۔ امید ہے وہ آئندہ بھی میرے مقالات پر اپنی قیمتی رائے کا اظہار کرتے رہیں گے۔

ڈاکٹر یوسف قدوائی۔ اومیک، واشنگٹن (امریکہ)

اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۴ء کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ سرورق پر پروفیسر معز الدین مرحوم کی تصویر دیکھ کر

میری چشم تصور سے ایک فلم گزر گئی جو کئی سالوں پر بلکہ ایک پورے عہد پر محیط ہے سب سے پہلے تو میں نے والد مرحوم جناب ڈاکٹر انیس قدوائی کی ڈائری سے عمرانہ چچی کا فون نمبر تلاش کر کے انھیں اور خاندان کے افراد کو تعزیت کا پیغام دیا۔ ابا جب ڈھاکہ میں تھے تو معزالدین چچا اور ہم ایک ہی احاطہ میں رہتے تھے اور ایک دوسرے کو قربت کی بنا پر ایک ہی خاندان کا حصہ سمجھتے تھے۔ عمرانہ چچی انسٹیٹیوٹ اوف ایجوکیشنل ریسرچ، ڈھاکہ میں ابا کی شاگرد تھیں اور دوران قیام لندن میں وہ مدرس بھی رہی ہیں۔ ان کے مزاج میں غضب کی شفقت، نفاست، شائستگی اور پاکیزگی ہے اور پورا گھرانہ مشرقی اقدار و تہذیب کا آئینہ دار ہے۔ کیا پرسکون زمانہ تھا۔ ہر شام چائے کی نشست ہوتی جس میں ڈاکٹر عندلیب شادانی، آفتاب صدیقی، مولانا جمال میاں فرنگی محلی، مولانا مودودی جیسے اساتذہ کے علاوہ گورنر اور دیگر زعماء بھی گاہے بگاہے شریک ہوتے تھے۔ معز چچا کے بڑے صاحبزادے حالی میرے اور میں ان کا جگری دوست رہے ہیں اور آج بھی وہ میرے نزدیک فاصلہ کے باوجود حقیقی بھائیوں کی طرح ہیں ان کی بہن ترنم جو ہیوسٹن میں رہتی ہیں۔ میری اپنی بہن کی طرح ہیں۔ یاد آیا جب معز چچا انگلینڈ سے آئے تھے تو ان کے پاس ایک سبز رنگ کی مازڈا کار تھی اور میں نے ہی چچا کو گاڑی چلانا سکھائی تھی۔ اس شمارہ نے تو برسوں کے بچھڑے ہوئے لوگوں کی یاد تازہ کر دی۔ ان چند سطور کے ذریعہ میں اور میرے گھر والے نہ صرف عمرانہ چچی، حالی، روی، اور ترنم اور ان کے خاندان کے تمام افراد کو بلکہ جو معز چچا کو جانتے ہیں اور ان کے حلقہ احباب سے وابستہ ہیں، ان سب کو دلی تعزیت پیش کرتا ہوں۔ اللہ مرحوم کے مراتب بلند فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین بہت کچھ لکھنے کو دل چاہتا ہے مگر ایک پورے عہد کی داستانِ محبت و تعلق کو رقم کرنے کے لیے معز چچا کا قلم درکار ہے جو میری دسترس سے باہر ہے۔

☆ ہمیں افسوس ہے کہ فاضل مراسلہ نگار کا یہ مکتوب سالنامہ ۲۰۱۵ء میں سہواً شاملِ اشاعت نہ ہو سکا۔ اس تاخیر کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں (ادارہ)

سعود صدیقی۔ کراچی

اسلام آباد میں قیام کے بعد کراچی پہنچ کر میں الاقرباء کے سالنامے ۲۰۱۵ء کے اب تک چند ہی مضامین پڑھ سکا ہوں۔ جس کی وجہ کچھ خانگی کام اور رمضان شریف کی آمد تھی۔ سرورق پر جامعۂ نظامیہ حیدرآباد دکن کی تصویر دیکھ کر چونکا چونکہ میرا پیدائشی وطن ہی حیدرآباد دکن ہے اور حیدر آباد ہی میں مشہور زمانہ جامعۂ عثمانیہ ہی میری مادرِ علم ہے جہاں سے میں نے انجینئرنگ کی ڈگری لی۔ سر ورق اور ہندوستان کی قدیم و مشہور اسلامی درسگاہ جامعۂ نظامیہ پر آپ کا سرورق اداریہ بہت معلوماتی اور عمدہ ہے جو کہ خاصی تحقیق کرنے کے بعد زیرِ قلم لایا گیا ہے لیکن پڑھنے پر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ چند اور اہم حقائق اس قدیم اور تاریخی دینی جامعۂ کے بارے میں رہ گئے ہیں جنہیں انشاءاللہ الاقرباء کے اگلے شمارے میں پیش کردوں گا اور زیرِ نظر سالنامہ پر بھی اپنی حقیر و ناقص رائے زیرِ قلم لاؤں گا۔ والسلام!

پروفیسر حسن عسکری کاظمی۔ لاہور

مؤقر جریدہ الاقربا کا مطالعہ ہم پر نئے علمی و ادبی آفاق ظاہر کرتا ہے۔ آپ کا اداریہ دل و جان سے پڑھا جاتا ہے کہ آپ پاکستان کے بنیادی مسائل اور ان کا حل پیش کرتے ہیں خصوصاً قومی زبان اردو کی وکالت کو آپ نے جزوِ ایمان بنا رکھا ہے۔ یقیناً آپ کی آواز اقتدار کے ایوان میں سنی گئی ہے اور اردو کو آئین کے حتمی فیصلے کے مطابق سرکاری اور دفتری زبان تسلیم کرنے اور بروئے کار لانے میں حکومت وقت مزید وقت ضائع نہیں کرے گی۔۔۔اللہ آپ جیسے دردمند اور پاکستان سے محبت کرنیوالی شخصیت کی توفیقات میں اضافہ فرمائے آمین۔

مسلم شمیم۔ کراچی

الاقرباء کا تازہ ترین شمارہ یعنی سالنامہ ۲۰۱۵ء کئی ہفتے قبل موصول ہوا تھا اور جب سے یہ دستاویزی جریدہ میرے پاس ہے میرے ساتھ ہے۔ جستہ جستہ اس کے مختلف مضامین کے مطالعہ

سے مستفید ہوتا رہا ہوں۔ مضامین و مقالات کا شعبہ حسب معمول نہایت ثروت مند ہے۔ اس شعبہ میں جناب غلام ابن سلطان کا مضمون ''دکن میں اردو ادب کا ارتقا'' میری خصوصی دلچسپی کا حامل ٹھہرا۔ موصوف کا نام نامی بھی میری توجہ کا طالب ٹھہرا۔ محترمہ ڈاکٹر گل ناز بانو کے دونوں مضامین تصورِ وقت ''آگ کا دریا'' کے تناظر میں نقد و انتقاد کا ناگزیر عمل پسند بھی آئے اور ان کا مطالعہ میرے لیئے بڑی معنویت کا حامل ٹھہرا۔ عبدالمتین منیری کا مضمون ''ڈاکٹر کلیم عاجز'' میرے لیے خصوصی دلچسپی کا مضمون ثابت ہوا کیونکہ مرحوم ڈاکٹر کلیم عاجز سے ایک بڑے دورانیے کی میری وابستگی رہی تھی۔

آپ کا یہ جریدہ اردو دنیا کا منفرد علمی ادبی فکری اور تحقیقی جریدہ ہے اور یہ جریدہ ایک فورم ہے ایک جہاں فکر و دانش ہے۔ اس جریدہ کا ہر شمارہ ایک دستاویز ہوتا ہے جو قیمتی ادبی ذخیرے کا حصہ بنتا ہے۔ مجھے اس سالنامے میں خود کو نہ پا کر بڑی محرومی کا احساس ہوا ہے۔ دو تحریریں شامل مکتوب ہیں۔ آپ جو چاہیں ان کے ساتھ سلوک روا رکھیں۔

نوید سروش۔ میر پور خاص

الاقرباء کا سالنامہ اور (جنوری۔ مارچ اور اپریل۔ جون ۲۰۱۵ء) نظر نواز ہوا۔ شدید گرمی اور شدید لوڈشیڈنگ کے باوجود پرچے کی نگارشات سے لطف اندوز ہوا۔

سید صاحب! آپ کے اداریے ایک دردمند پاکستانی کی آواز ہوتے ہیں جو حساس قومی مسائل کو اس طرح اُجاگر کرتے ہیں جس سے سوچنے کی نئی راہیں کھلتی ہیں اور مسائل کے حل کے لیے فکر مندی نظر آتی ہے۔ سالنامے میں آپ نے اردو کے سرکاری اور دفتری زبان کے نفاذ پر جو صدا بلند کی ہے اس عمل میں میری آواز اور دلی جذبات کو بھی شامل سمجھیے۔ آپ نے اداریے کے صفحات میں ''بین الاقوامی لسانی تعصب'' کی بات کی تھی۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر اردو کے ساتھ زیادتی عرصے سے روا ہے۔ میں اس بات سے متفق ہوں کہ

''یونیسکو میں بھارتی سفارت کاروں نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے اسے ''ہندوستانی''

کے نام سے موسوم کرادیا حالانکہ ہندوستانی نام کی زبان دنیا بھر میں کہیں نہیں پائی جاتی۔''

مگر ارباب اختیار کیا کر رہے ہیں یہ سوالیہ نشان ہے۔ اللہ تعالیٰ ان میں قومی غیرت پیدا کرے آمین۔ ذیلی اداریہ میں فاصلاتی نظام تعلیم کے امتحانات کی صورت حال کی طرف اشارہ کیا ہے۔ امتحانات ایک منافع بخش کاروبار بن گیا ہے۔ اعلیٰ سطح پر تعلیم کا یہ حال ہے تو ملک وقوم کی ترقی کا خواب دیکھنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ سندھ کے اکثر شہروں میں نویں تا بارھویں جماعت اور بی اے، ایم اے کے امتحانات جس طرح ہوتے ہیں وہ لکھتے ہوئے افسوس ہوتا ہے بلکہ شرم آتی ہے۔ پنجاب کے سرکاری ملازمین ہر سال بی اے اور ایم اے کی اسناد کے لیے ادھر کا رخ کرتے ہیں۔ ٹیلی وژن کے مختلف چینلز امتحانی مراکز کے منظر دکھاتے ہیں مگر۔۔۔؟ پچھلے دنوں کچھ چینلز نے خبر دی کہ کراچی، پیپلز یونیورسٹی نواب شاہ اور زرعی یونیورسٹی ٹنڈو جام کے پینتالیس (۴۵) اساتذہ (ایم فل، پی ایچ ڈی) کے جعلی مقالات سامنے آئے ہیں یعنی کسی اور کے کام پر ہاتھ صاف کیے جا رہے ہیں۔ اردو اور سندھی ادب کے سلسلے میں بھی کچھ ایسی ہی باتیں سامنے آئی ہیں۔

تازہ شمارے میں مضامین کا حصہ نہایت جان دار ہے اسے آپ کے ذوقِ نظر نے زبردست تحقیقی گوشہ بنادیا ہے۔ غلام ابن سلطان نے ''دکن میں اردو ادب کا ارتقا'' میں بہمنی دور، قطب شاہی عہد کا ادب، محمد قلی قطب شاہ کی تخلیقی صلاحیت، ولی دکنی کی شاعری کے رنگ اور دکن میں اردو زبان وادب کی ترقی کو بڑے سلیقے اور حقائق کے ساتھ نذرِ قرطاس کیا ہے۔ محمد انور مبین زبیری مجددی صاحب نے ''بہار ایجادیٔ بیدل'' تفہیم بیدل کی عظیم کاوش میں کمال کیا ہے۔ مضمون پڑھنے کے بعد بیدل مرحوم کے فارسی مشکل اشعار مشکل نہیں رہے ''دورِ حاضر میں خطوطِ شبلی کی معنویت'' میں ڈاکٹر محمد شارق اور ''ہندکو ادب میں معاشرے کے تعمیری عناصر میں'' عامر سہیل صاحب نے ادب کے ذریعے سماج میں بہتری لانے کے تناظر میں دیکھنے کی سعی کی ہے۔ ڈاکٹر گل ناز نے ''ادب اور زندگی میں نقد و انتقاد کا ناگزیر عمل'' میں وسیع پیمانے پر زندگی کے شعبوں میں تعمیری تنقید کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی قدر و قیمت اُجاگر کی ہے۔ مضامین کا حصہ یاد

رکھے جانے کے قابل ہے۔ ''اقبالیات'' الاقربا کی ایک منفرد پہچان بن چکا ہے۔ آپ اقبالیات پر موضوعات کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ موجودہ پرچے میں بھی اقبال کی فکر کے مختلف رنگ دیکھے جاسکتے ہیں۔ ایک خیال ذہن میں آرہا ہے کہ ''الاقربا'' میں اقبال پر شائع ہونے والے مضامین کا ایک انتخاب کتابی صورت میں شائع کیا جائے تو یہ ایک بامعنی اضافہ ہوگا۔ محمد طارق غازی صاحب بھی کمال کے اہل قلم ہیں۔ تاریخ پر اس روانی سے لکھتے ہیں کہ تہذیبی و سماجی صورت حال بھی سامنے آجاتی ہے'' قومِ عاد'' اور ''زبانوں کی ماں'' مضامین اُن کے گہرے مطالعے اور اپنے موضوع پر گرفت کے آئینہ دار ہیں۔

آپ نے ڈاکٹر آصف الرحمٰن طارق کا گوشہ مرتب کر کے قلم دوستی کا حق ادا کیا ہے۔ گوشے میں شامل تحریروں سے مرحوم کے افسانوں کے کئی پہلو روشن ہوئے۔ ''یادِ رفتگاں'' میں پروفیسر غلام شبیر رانا، ڈاکٹر عطش درانی اور عبدالمتین منیری کی یادوں نے متاثر کیا۔ ڈاکٹر گل ناز بانو نے ''آگ کا دریا'' کے حوالے سے کوئی نئی بات نہیں کی۔ کرامت بخاری کے مضمون ''اردو رسم الخط تبدیل کرنے کی سازش'' دنیا بھر میں اردو کے چاہنے والوں کے دل کی آواز ہے۔ حمد و نعت سلام و منقبت و تراجم کا انتخاب اسلامی تعلیمات کی روشنی، احکاماتِ الٰہی کی پابندی، اسوۂ رسولؐ کے نقشِ قدم پر چلنے اور خاندانِ رسولؐ سے محبت کی فکر سے مزین ہے۔ امین راحت چغتائی، شاہین، شفق ہاشمی، سرور عالم راز، آمنہ عالم، کرامت بخاری اور ڈاکٹر نثار ترابی کی غزلیں روایت کی پاس داری اور جدید فکر کے امتزاج سے تخلیق ہوئی ہیں۔ نازیہ خلیل عباسی کی نظم ''خواب دل کی عجب کہانی تھی'' صابر عظیم آبادی کے قطعات اور تنویر پھول کے قطعات، تاریخ وفات ادا جعفری نے متاثر کیا۔

''الاقربا'' کے خطوط علمی معلومات سے پُر ہوتے ہیں۔ محمد طارق غازی کا خط بہت اہم ہے یہ بات دل کو لگتی ہے۔ ''زبان جسم پر جلد ہوتی ہے قمیض نہیں آدمی جلد نہیں بدلتا۔''

اردو زبان کا رسم الخط تبدیل ہونے سے اردو زبان و ادب پڑھنے والے اپنے مذہبی، سماجی، تاریخی اور ادبی علوم سے اجنبی ہو جائیں گے اور زبان و ادب کی زمین بنجر ہو جائے گی۔ ترکی کی موجودہ نسل آج تک اپنے بزرگوں کی قبروں کے کتبے پڑھنے سے قاصر ہے۔

نسیم سحر۔ راولپنڈی

اداریے میں آپ نے "اردو ایوانِ عدل میں" کے عنوان سے اُردو کی صورتِ حال پر عدلیہ کے نوٹس کا ذکر کیا ہے۔ انہی دنوں کچھ ہلچل تو ایوانِ اقتدار میں بھی پیدا ہوئی ہے اور ممکن ہے کبھی یہ نوید مل ہی جائے کہ سرکار دربار کی خط و کتابت (نوٹنگ ڈرافٹنگ سمیت) اُردو زبان میں ہو گی، اس کے ساتھ ساتھ پاکستان کے آئین، تمام قوانین کا بھی سلیس اردو میں ترجمہ ضروری ہے تاکہ عوام کے مسائل حل ہوں۔ محض یہی کافی نہیں کہ صدر اور وزیرِ اعظم تقریر اردو میں کیا کریں اور بس! ہمارے سرکاری افسران کے دماغ سے یہ سوچ نکالنے کی اشد ضرورت ہے کہ اردو بولنے سے اُن کی افسری میں کوئی فرق نہیں آتا ہے، اپنی زبان بولنے میں احساسِ کمتری اور زبانِ غیر پر عبور رکھنے کو احساسِ برتری کی ترتیب کو یکسر الٹ دینے کی ضرورت ہے۔

"بہارِ ایجادیٔ بیدل" کے عنوان سے الدکتور نعیم حامد علی کے ترجمہ و تفہیم بیدل پر جناب محمد انور معین زبیری مجددی کا مقالہ بہت عمدہ اور پُر مغز ہے۔ بلاشبہ یہ جناب نعیم حامد علی کا بڑا ادبی کام ہے۔ مجھے سعودی عرب میں کئی برس تک جناب نعیم حامد علی کی محفلیں سمیٹنے کا موقع ملتا رہا اور بلاشبہ انہوں نے ادب اور ادبی تحقیقی کام میں جتنی محنت کی ہے وہ کم لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ ان کا کتب خانہ دیکھ کر تو میں حیرت میں مبتلا ہو گیا تھا کہ اس قدر منظم انداز میں قدیم ادبی کتابوں، ہاتھ سے لکھے نسخوں اور ادبی جرائد و اخبارات کا ریکارڈ تو شاید کسی بڑے سے بڑے علمی و ادبی ادارے نے بھی ترتیب دیا ہو گا۔ افسوس کہ الدکتور نعیم حامد علی کی ادبی خدمات کا اتنے بڑے پیمانے پر تا حال اعتراف نہیں کیا گیا جو کہ ان کا حق تھا۔

جناب محمد فیصل مقبول عجز نے نواب مرزا داغ دہلوی اور نظام شاہ رام پوری کی شاعری کے حوالے سے بات کرتے ہوئے بڑی عرق ریزی کے ساتھ داغ کی شاعری پر نظام شاہ رام پوری کے رنگِ سخن کا جائزہ لیا ہے اور غزلیاتِ نظام میں شامل بہت سی غزلوں کی زمینوں میں داغ کی لکھی ہوئی غزلوں کا ذکر کیا ہے اور دونوں شاعروں کی اس طرح کی غزلوں کے مثالیں دی ہیں

جناب محمد طارق غازی کا قدیم تہذیبوں کی تاریخ پر زیرِ تحریر کتاب میں سے "عاد، تہذیب اور جاہی" کے عنوان سے جو حصہ اس شمارے میں شامل کیا گیا ہے، انتہائی عالمانہ اور تحقیقی ہے اور اسے پڑھ کر جناب طارق غازی کو داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

اس شمارے میں ایک تنقید نگار یا مقالہ نگار کی تین تحریریں شامل ہیں۔ میری مراد (۱) دکن میں اردو ادب کا ارتقا (غلام ابنِ سلطان) (۲) ژاک لاکاں (پروفیسر ڈاکٹر غلام شبیر رانا) اور (۳) عزیز جہاں ادا جعفری (پروفیسر ڈاکٹر غلام شبیر رانا) سے ہے۔ قطع نظر اس بات کے کہ انہیں ایک ہی نام سے تمام مضامین لکھنے کی بجائے ایک مضمون پر اپنا نام مختلف کیوں لکھنا پڑا (جس کا انہیں یقیناً حق حاصل ہے) میں جس بات پر اظہارِ حیرت کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ ادا جعفری مرحومہ پر ان کا یہی مضمون میں لاقربا میں پڑھنے سے پہلے کم از کم تین دیگر ادبی جرائد میں بھی دیکھ چکا ہوں۔ میرے ذاتی خیال میں ایک ہی مضمون کو ایک سے زائد ادبی جرائد میں شائع نہیں کروانا چاہئے ☆۔ بہرحال اگر آپ بطور مدیر اعلیٰ ایسا کرنا مناسب سمجھتے ہیں تو میں اپنا اعتراض واپس لیتا ہوں!

جناب ڈاکٹر عطش درانی کا احسان دانش مرحوم پر مضمون بہت عمدہ تھا اور ان کی شاعری اور حیات کے کئی گوشے اجاگر کرتا ہے۔

پروفیسر زہیر کنجاہی۔ راولپنڈی

سب سے اوّل آپ کا اداریہ پڑھا جو نفاذِ اردو کے بارے میں ہے۔ مگر کیا کیا جائے حاکمانِ وقت تو ایسا ہے جیسے سو رہے ہیں۔ بیگم ثاقبہ رحیم الدین نے انشائیہ کیا لکھا ہے بسر کی ہوئی زندگی کی یادوں کا ایک تسلسل پیش کر دیا ہے انہی یادوں کے سلسلہ میں شفق ہاشمی کا شعر بھی خوب ہے۔

☆ ہمارے علم میں یہ بات نہیں جو ہماری پالیسی کے بھی خلاف ہے جس کا فاضل مقالہ نگار کو بھی علم ہونا چاہئے کہ یہ اعلان متعدد بار ہم الاقرباء کی سابقہ اشاعتوں میں کر چکے ہیں۔ (ادارہ)

جو ہیں کرچیاں میرے خواب کی، جو گُہر ہیں میرے خیال کے
ہیں امانتیں مہ و سال کی، انہیں دیکھو رکھنا سنبھال کے

حمد میں نورین طلعت عروبہ کی حمد کا یہ شعر دل کو بھا گیا

میرے چھوٹے سے گھروندے میں بہاریں اتریں   میرے دامن میں ہوں یارب ترے سو بار کے پھول

اور نعتوں میں سیّد عارف کی "نعتِ نبیؐ" جو آزاد نظم کی صورت میں ہے پسند آئی۔ امین راحت چغتائی کی نعت جو پابند نظم کی صورت میں ہے کسی سے کم نہیں۔ غزلوں میں درجہ ذیل شعر ایسے ملے جن کو رک کر سوچنا پڑا

شاہ رہِ حیات پر اے دل   کیسی مایوسیوں کے سائے ہیں
انور جہاں برنی

آج کے انساں کو آتا ہے صرف یہ ایک ہی کام جلال   اپنے عیب پہ پردہ ڈالو خوبی کی تشہیر کرو
سید قاسم جلال

جھوٹ کو جھوٹ کرامت نے کہا تو فوراً   شہر کے شہر نے ہاتھوں میں اُٹھائے پتھر
کرامت بخاری

نظموں میں تین نظمیں امین راحت چغتائی کی نظم "شاخِ مرجاں" کرامت بخاری کی نظم "ہم کو صحرا کی خاک ہونا ہے" اور اویس الحسن کی نظم "ہوا میں اُڑتی تصویر" اچھی لگیں۔

نقد و نظر کے تحت امین راحت چغتائی کی کتاب "آنچل، آنگن، پھول" پر جناب سیّد منصور عاقل نے خود ایک طویل تبصرہ کیا ہے جو پڑھنے کے قابل ہے۔

مضامین میں محمد انور معین زبیری مجددی نے مرزا عبدالقادر بیدل کی کتاب "بہار ایجادی بیدل" پر تبصرہ کرنے کے لیے کافی محنت و کاوش اور تحقیق و جستجو سے کام لیا ہے۔ بیدل کو سمجھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ غلام ابن سلطان نے "دکن میں اردو ادب کا ارتقا" کے زیرِ عنوان ایک

طویل اور تحقیقاتی مضمون سپردِ قلم کیا ہے۔ غلام ابنِ سلطان اپنے مضمون میں اردو ادب کے ارتقاء کو جنوبی ہند سے لے کر شمالی ہند تک لے آئے ہیں۔ کافی طویل اور عظیم مضمون ہے۔

''گوشہ اقبالیات'' میں سے اقبالؒ اور عشق رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ پسند آیا۔ علامہ اقبالؒ کی تصانیف میں جابجا بے شمار ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں علامہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا عشق ظاہر کیا ہے۔ اور پھر بڑھاپے میں تو یہ حالت تھی کہ جب کوئی علامہ اقبالؒ کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیتا تو اقبالؒ رونا شروع کر دیتے۔

ڈاکٹر طاہر حمید تنولی نے اپنے مضمون ''علامہ اقبالؒ کا تصور زماں'' میں نئے نئے زاویے کھولنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور ایک طویل مضمون لکھا ہے۔

خبرنامہ

الاقرباء فاؤنڈیشن

(اراکین کیلئے)

مرتبہ
سیدہ سارہ سلمان

احوال وکوائف

نونہالانِ الاقرباء کے تعلیمی اعزازات:

- سیدہ سدرہ سالاری دختر بیگم نیّر سالاری و سید ظفر اللہ سالاری (سکریٹری جنرل الاقرباء فاونڈیشن) نے پنجاب یونیورسٹی سے اس سال ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کا فائنل امتحان چھ مضامین میں امتیاز (Distinction) کے ساتھ پاس کیا ہے۔ جس پر انھیں راولپنڈی میڈیکل کالج کے حالیہ کنووکیشن میں طلائی تمغہ (Gold Medal) عطا کیا گیا ہے۔ عزیزہ سدرہ سالاری جنرل میڈیسن کے شعبہ میں اختصاص (Specialization) کا پہلا مرحلہ مکمل کر چکی ہیں اور دوسرے مرحلے کی تکمیل کے لیے آج کل ہولی فیملی ہسپتال (Holy Family Hospital) سے وابستہ ہیں۔

ادارہ سہ ماہی 'الاقربا' اس عظیم الشان کامیابی پر عزیزہ سدرہ سالاری کو، خوش نصیب والدین اور اہل خانہ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے اور مستقبل میں ہونہار بیٹی سدرہ کے لیے ایسی ہی عظیم کامیابیوں کے لیے دعا گو ہے۔

- الاقرباء فاونڈیشن کی مجلسِ انتظامیہ کے رکن بیگم عالیہ سجاد و جناب حسن سجاد کے ہونہار صاحبزادے سید محمد مزمل حسن سجاد کے بارے میں یہ خوش خبری ادارہ سہ ماہی 'الاقرباء' کو ملی ہے کہ انھوں نے فاسٹ یونیورسٹی (Fast University) اسلام آباد سے سوفٹ ویئر انجینئرنگ (Soft Ware Engineering) کا کورس کامیابی سے مکمل کرلیا ہے۔ عزیزی مزمل کے تعلیمی کیریئر کی تکمیل اور پروفشینل کیریئر کے آغاز پر ادارہ انھیں، والدین اور جملہ اعزاء و اہلِ خانہ کو ہدیہ تہنیت پیش کرتا ہے اور مستقبل میں عزیزی مزمل کی کامیابیوں اور بلندیِ درجات کے لیے دعا گو ہے۔

○ سیدہ ماہ نور فاطمہ دختر بیگم رفعت و سید منور عالم ماشاء اللہ شروع ہی سے ہر کلاس میں نمایاں پوزیشن لے کر کامیاب ہوتی رہی ہیں اس بار بھی اُنھوں نے نہم کلاس کے سائنس گروپ میں چھیاسی فیصد (%۸۶) نمبر حاصل کر کے بورڈ کے امتحان میں امتیازی پوزیشن حاصل کی ہے

ادارہ سہ ماہی الاقرباء اُنھیں، والدین اور اعزاء و اہل خانہ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے اور مستقبل میں مزید کامرانیوں کے لیے دعا گو ہے۔

○ سیدہ اریبہ تلمیذ دختر بیگم سیدہ سارہ سلمان و سید سلمان منصور نے امسال اسلام آباد بورڈ برائے ثانوی و اعلیٰ ثانوی تعلیم سے میٹرک سائنس گروپ میں اسی فیصد (%۸۰) نمبر لے کر امتیازی کامیابی حاصل کی ہے اور اُنھیں میرٹ کی بنیاد پر فیڈرل گرلز کالج ایف 7/2 اسلام آباد میں کمپیوٹر انجینئرنگ کے شعبہ میں داخلہ بھی مل چکا ہے۔

ادارہ سہ ماہی الاقرباء مستقبل کے لیے بہترین دعاؤں کے ساتھ عزیزہ اریبہ، والدین و جملہ اہلِ خانہ و عزاء کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہے۔

○ عزیزہ حیا اطہر نے جو محترمہ شہلا احمد (مدیر مسئول سہ ماہی الاقرباء و نائب صدر الاقرباء فاؤنڈیشن) کی ذہین پوتی ہیں اور ہمیشہ ابتداء ہی سے ہر امتحان امتیازی حیثیت میں پاس کرتی رہی ہیں انھوں نے اس بار بھی پانچویں جماعت (5th Class) کا امتحان %۹۵ نمبر حاصل کر کے پاس کر لیا ہے جو ایک ریکارڈ ہے

آپ کی دوسری پوتی عزیزہ حریم اطہر نے تو اپنی بڑی بہن کو بھی پیچھے چھوڑ دیا اور %۹۸ نمبر لے کر تیسری جماعت پاس کر لی۔ اُنھیں ادارہ کی طرف سے خوب خوب شاباش !

ادارہ سہ ماہی الاقرباء دونوں بیٹیوں کی مستقبل میں نمایاں کامرانیوں کے لیے دعا گو ہے اور والدین کو دادی صاحبہ اور دیگر اہل خانہ کو مبارک باد پیش کرتا ہے۔

- جناب خالد راحیل رکن الاقرباء فاؤنڈیشن و برادر حقیقی محترمہ شہلا احمد کی دونوں بیٹیوں عزیزہ طیبہ خالد اور عزیزہ طیبہ خالد نے بھی ماشاء اللہ اُسی ریکارڈ کامیابی کو دہرا دیا ہے جو ان کی رشتہ کی بہنوں حیا اطہر اور مریم اطہر نے قائم کیا ہے۔ عزیزہ طیبہ خالد ساتویں جماعت کے امتحان میں ۸۰% نمبر لے کر کامیاب ہوئی ہیں اور چھوٹی بہن عزیزہ طیبہ خالد پانچویں جماعت میں ۹۶% نمبر لے کر پاس ہوئیں اور اُنھوں نے بھی اپنی بڑی بہن سے زیادہ نمبر حاصل کیے۔

ادارہ سہ ماہی الاقرباء ایسی اعلیٰ کامیابی پر بہت بہت شاباش کہتا ہے اور والدین کو مبارک باد کے ساتھ مستقبل میں بچیوں کی کامرانیوں کے لیے دعا گو ہے۔

- سیدہ تزئین منصور دختر بیگم عائشہ و سید فرحان منصور نے اپنی گذشتہ شاندار کامیابیوں کے ریکارڈ کو برقرار رکھتے ہوئے آٹھویں کلاس (8th Class) کا امتحان بھی A+ گریڈ حاصل کر کے امتیاز کے ساتھ پاس کیا ہے۔

ادارہ سہ ماہی 'الاقرباء' مستقبل کے لیے بہترین دعاؤں کے ساتھ عزیزہ تزئین۔ والدین و جملہ اہل خانہ و اعزاء کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

- ثانی فرشوری فرزندِ دلبند بیگم ناہید جمشید و مرحوم و مغفور جمشید فرشوری نے بیکن ہاؤس سکول سسٹم کے تحت دیئے جانیوالے 'اولیول' کے امتحان میں تین مضامین میں گریڈ A حاصل کیا ہے جو اس لیے بھی قابلِ تعریف ہے کہ عزیزی ثانی کو اس کم عمری میں امتحان سے کچھ ہی پہلے اکلوتے بیٹے کی حیثیت سے اپنے نہایت شفیق باپ کی ناگہانی موت کے صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے (آمین)

ادارہ سہ ماہی 'الاقرباء' عزیزی ثانی سلمہ کے مستقبل میں کامرانیوں کے لیے اس یقین کے ساتھ دعا گو ہے کہ ان کامرانیوں سے ان کے والد مرحوم کی روح ہمیشہ فرحاں و شاداں رہے گی۔

- سید حسان منصور نے جو بیگم عائشہ و سید فرحان منصور کے نہایت خوش خصال بیٹے ہیں لاہور کی

معروف تعلیمی درس گاہ 'گرامر سکول' سے ساتویں جماعت کے امتحان میں سات (۷) مضامین میں "A" گریڈ حاصل کر کے ریکارڈ کامیابی حاصل کی ہے جو ایک اعزاز ہے۔

ادارۂ سہ ماہی 'الاقربا' عزیزی حسان منصور ان کے والدین اہل خانہ و اعزاء کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہے اور مستقبل میں بھی ان کی شاندار کامیابیوں کے لیے دعا گو ہے۔

○ سیدہ انعم منصور پیاری بیٹی بیگم نادیہ فیصل و سید فیصل منصور نے تیسری کلاس کے امتحان میں گریڈ +A لے کر نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ وہ پہلی کلاس ہی سے اپنی کلاس میں یہ اعزاز حاصل کرتی رہی ہیں۔ انھیں نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں میں ایک ذہین طالبہ کی حیثیت سے ایوارڈ بھی ملتے رہے ہیں۔

ادارۂ سہ ماہی 'الاقربا' انعم بیٹی کو شاباش اور والدین و اہل خانہ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔ اور انعم بیٹی کی خوش بختی اور مستقبل میں بھی کامیابیوں کے لئے دعا گو ہے۔

سانحات رحلت

○ صدر الاقرباء فاؤنڈیشن جناب سید منصور عاقل کی حقیقی بھانجی عزیزہ ناہید جمشید کے شوہر، الاقرباء فاؤنڈیشن کے رکن اور پاکستان ٹیلی وژن کی معروف شخصیت جناب جمشید فرشوری طویل علالت کے بعد مورخہ ۴ جون ۲۰۱۵ء کو اسلام آباد میں انتقال فرما گئے ۔۔۔ اِنَّا لِلّٰہ وَاِنَّا اِلَیہ راجعون۔ مرحوم کچھ عرصہ قبل ہی پاکستان ٹیلی وژن سے بحیثیت ڈائریکٹر پروگرامز ریٹائر ہو چکے تھے۔ اُن کی نمایاں اور طویل خدمات کے اعتراف میں اُنھیں خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے پاکستان ٹیلیوژن نے ایک مفصل خصوصی اور یادگار پروگرام بھی نشر کیا جس میں دیگر اہم شخصیات کے علاوہ جناب آغا ناصر نے پاکستان میں ٹیلی وژن کے آغاز ہی سے اُن کی لگن، شب و روز کی والہانہ وابستگی اور ان کی ناقابل فراموش مختلف فنی جہتوں پر روشنی ڈالی۔

مرحوم کے پس ماندگان میں اہلیہ کے علاوہ کم سن اکلوتا بیٹا ثانی فرشوری شامل ہیں جس نے اُن کی وفات کے بعد 'اولیول' کا امتحان پاس کیا ہے۔ ادارہ سہ ماہی ''الاقرباء'' مرحوم کی وفات پر دلی تعزیت پیش کرتا ہے اور ان کے لئے دعائے مغفرت کے ساتھ دعاء گو ہے کہ اللہ تعالیٰ پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے (آمین)

- سید ظفر اللہ سالاری سکریٹری جنرل اور سید مزمل اللہ سالاری، رکن مجلسِ انتظامیہ کی ہمشیرہ سیدہ سلطنت جمال کے شوہر سید جمال قاضی جو سید مدثر اللہ سالاری معتمد مالیات الاقرباء فاؤنڈیشن کے حقیقی پھوپا بھی تھے مورخہ ۲۰ جولائی ۲۰۱۵ء کو کراچی میں وفات پا گئے انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم کی مستقل رہائش انگلینڈ میں تھی اور وہ اپنے اعزاء سے ملنے کراچی آئے ہوئے تھے۔ ادارہ سہ ماہی الاقرباء اور اراکین الاقرباء فاؤنڈیشن اس حادثہ جانکاہ پر سیدہ سلطنت جمال اور اہل خانہ و جملہ اقرباء اور پس ماندگان سے دلی تعزیت کا اظہار کرتے ہیں اور مرحوم کی مغفرت اور عقبیٰ و آخرت میں بلند درجات کے لیے دعاء گو ہیں۔

- سہ ماہی 'الاقرباء' کی مدیر مسئول اور نائب صدر الاقرباء فاؤنڈیشن محترمہ شہلا اسلام امریکہ میں اپنے عزیزوں کے ساتھ ابھی تین ماہ کا طے شدہ قیام مکمل نہ کر پائی تھیں کہ انھیں اپنے حقیقی بہنوئی جناب ضیاء الحسن کی کراچی میں وفات پا جانے کی اطلاع ملی جو اُن کے لیے ایک روح فرسا خبر تھی

ادارہ سہ ماہی 'الاقرباء' اور اراکین الاقراء فاؤنڈیشن اس صدمۂ جانکاہ پر محترمہ شہلا احمد صاحبہ اور عزیزان و پس ماندگان کو دلی تعزیت پیش کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ رب العزت مرحوم کی مغفرت فرمائے اور جملہ پس ماندگان کو اس صدمۂ جانکاہ کو برداشت کرنے کی ہمت واستقامت عطا فرمائے (آمین)

نوٹ. محترمہ شہلا احمد اب امریکہ سے واپس اسلام آباد آچکی ہیں۔

شادیاں

○ بیگم شبنم جلیس و جناب جلیس احمد صدیقی کے فرزند ارجمند عزیزی عمران احمد کی شادی کی پُر رونق تقریبات بشمول سہرابندی، برات اور ولیمہ ۲۲ اور ۲۳ اگست ۲۰۱۵ء کو اسلام آباد میں منعقد ہوئیں جن میں معزز مہمانوں کی کثیر تعداد نے شرکت فرمائی جو عمائدین شہر اور اسلام آباد نیز دیگر شہروں سے احباب و اعزاء پر مشتمل تھی اس کے علاوہ الاقربا فاؤنڈیشن کے اراکین، عہدہ داران اور مجلس انتظامیہ کے ممبروں نے مع اہل خانہ بھرپور اور پُر جوش انداز میں تمام تقاریب میں شرکت کی۔ بیگم و جناب جلیس احمد صدیقی خود بھی 'الاقرباء' کی مجلس انتظامیہ کے رکنِ رکین ہیں۔ عزیزی عمران، بیگم و جناب عارف ممتاز بٹ (مرحوم) کی دخترِ نیک اختر عزیزہ آمنہ ممتاز بٹ سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے ہیں خوش قسمتی سے اس خانوادے سے یہ دوسرا رشتہ استوار ہوا ہے۔

اس مبارک و سعید موقع پر ادارۂ سہ ماہی 'الاقرباء' دلہا دلہن، والدین، اہل خانہ، احباب و اعزاء کو دلی تہنیت پیش کرتا ہے اور دعا گو ہے کہ یہ مزید رشتہ مستقبل میں دونوں خاندانوں کے درمیان اخلاص و محبت اور اخوت و یگانگت کی سدا بہار نوید ثابت ہو۔ (آمین)

○ بیگم ماریہ و جناب جی۔اے۔صابری (سینئر نائب صدر الاقرباء فاؤنڈیشن) کی دخترِ فرخندہ اختر کی شادی و خانہ آبادی کی پُرشکوہ رسومِ حنا و رخصتی ۲۸۔۲۹ اگست ۲۰۱۵ء کو اسلام آباد میں منعقد ہوئیں۔ دلہا عزیزی ٹیلین کی برات والدین کی سرپرستی میں احباب و اقرباء کے ساتھ سٹاک ہوم (سویڈن) سے اسلام آباد پہنچی تو مہمانوں کا اسلام آباد کے ہوائی مستقر (ائرپورٹ) پر شایانِ شان استقبال کیا گیا بیرونِ ملک کے مختلف شہروں بشمول لندن، روم، قاہرہ، جدہ، خلیجی ریاستوں کے مختلف شہروں اور سنگاپور سے دیگر مہمانانِ گرامی کو بھی بھرپور گرم جوشی سے خوش آمدید کہا گیا جو مختلف پروازوں سے اسلام آباد پہنچے۔ رخصتی کی تقریب ایک عظیم الشان جشنِ شادمانی تھا جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیات بشمول اراکینِ پارلیمان، اسلام آباد میں مقیم

ارجن ٹائنہ کے سفیر، آسٹریلیا کے سفارت خانہ کے فرسٹ سکریٹری اقوام متحدہ کے ڈائریکٹرز اور وفاقی حکومت کے عمائدین بھی شریک تھے۔ خصوصاً الاقرباء فاؤنڈیشن کے اراکین نمایاں تھے۔ مزید ایک خاص بات دیکھنے میں یہ آئی کہ ہندوستان سے بھی بعض عزیز واقرباء شادی کی تمام رسوم میں شریک ہوئے جو پُرکشش مشرقی انداز میں ادا کی گئیں۔

ادارہ سہ ماہی الاقرباء اس مبارک موقع پر دلہا دلہن، ان کے والدین اور اہل خانہ کو دل کی گہرائیوں سے ہدیۂ تہنیت پیش کرتا ہے اور عزیزہ ہالہ اور عزیزی یٰسین کے لیے مستقبل میں ازدواجی زندگی کی بہترین راحتوں، مسرتوں اور کامرانیوں کے لیے دعا گو ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رُخصتی

بتقریب شادی خانہ آبادی عزیزہ ہالہ صابری دخترِ نیک اختر بیگم ماریہ صابری و عزیزی جی۔اے صابری

دعاؤں کا لے کر چلی ہو سندیسا تو ہالہ¹ یہ حرفِ دعا یاد رکھنا
خدا تم کو شاد اور آباد رکھے سدا اپنا عہدِ وفا یاد رکھنا
ہو تم صابری خانوادے کی بیٹی بزرگوں کی رسمِ عطا یاد رکھنا
نبیؐ نے بھی بیٹی کو رخصت کیا ہے یہ ہے سنّتِ مصطفےٰؐ یاد رکھنا
نبیؐ کے گھرانے کا ہے یہ بھی صدقہ کہ ہے عائشہ² نام سے تم کو نسبت
ہے یٰسین³ بھی ایک پاکیزہ نسبت یہ قرآن کا معجزا یاد رکھنا
نہ بھولو کہ ہو تم امینِ محبت نشانِ مروّت ، نویدِ مسرت
ملی ہے جو تہذیب آغوشِ مادر سے تم کو بفضلِ خدا یاد رکھنا
کہاں کوئی نعم البدل باپ کی شفقتوں کا تلطف کا ایثار کا
کہاں بھائیوں کا وہ پیار اللہ اللہ محبت کو ان کی سدا یاد رکھنا
سدھاری ہو لے کر روایاتِ روشن کہ سسرال بن کر چلی ہو جو دلہن
جو عظمت کہ شوہر کو بخشی گئی ہے وہی زیست کا مدّعا یاد رکھنا
کریں قصرِ الفت کے دیوار و در بھی نئی شان سے خیر مقدم تمہارا
تم اک قیصر⁴ ملکِ دل بن کے رہنا لیا ہے جو درسِ وفا یاد رکھنا
رکھو یاد یہ بھی کہ وارث ہو تم اہلِ موعود⁵ کے خانۂ با صفا کی
نسب ہی نہیں صرف عظمت کا ضامن ہو کردار بھی با صفا یاد رکھنا
خدا ہو معین⁶ اور ناصر تمہارا دعا لو یہ منصور عاقل سے ، بیٹی
کرو اپنی سسرال میں بھی ہمیشہ محبت کی نشوونما یاد رکھنا

اسلام آباد
۲۹ اگست ۲۰۱۵ء

بہترین دعاؤں کے ساتھ
سید منصور عاقل

تصریحات: ۱۔ہالہ (دلہن) ۲۔عائشہ (دادی اور بھابی) ۳۔یٰسین (دلہا) ۴۔قیصر (عرفیت دادی)
۵۔موعود (ننھیالی خانوادہ) ۶۔معین (دادا)

نظم رخصتی

مرتبہ

سیدہ سارہ سلمان

گھریلو چٹکلے

○ **شہد کی مکھی کے کاٹے کا علاج:** اگر شہد کی مکھی یا کوئی اور کیڑا کاٹ لے تو اُس جگہ فوراً ہلدی اور چونے کا لیپ لگا دیں۔ سُوجن اور درد انشاء اللہ دونوں ختم ہو جائیں گے۔

○ **آنکھوں کے گرد اگر حلقے پڑ جائیں:** لیموں کے عرق میں روغنِ چنبیلی کے چند قطرے ملا کر رات کو سوتے وقت حلقوں پر لگالیں۔ انشاء اللہ حلقے ختم ہو جائیں گے۔

○ **اگر دانتوں سے خون آتا ہو:** زیتون کے تیل میں شہد ملا کر دانتوں پر ملنے سے انشاء اللہ خون کی شکایت دور ہو جائے گی۔

○ **اگر پاؤں کی ایڑیوں کی کھال پھٹنے لگے:** چار چمچ کوکنگ آئل میں ایک چمچ شکر ملا کر اور ہلکا سا گرم کر کے ایڑیوں پر لگالیں۔ انشاء اللہ ایک ہفتہ میں ایڑیاں ٹھیک ہو جائیں گی۔

○ **پیٹ کے درد کے لیے:** سفید زیرہ پیس کر شہد میں ملائیں اور چاٹ لیں۔ دو سے تین دفعہ میں انشاء اللہ فرق پڑ جائے گا۔

○ **وزن کم کرنے کے لیے:** بند گوبھی کھانے میں ضرور شامل کریں۔ سُوپ بنا کر یا سلاد کے طور پر استعمال کریں۔ وزن کم کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

○ **مُنہ میں اگر چھالے ہو جائیں:** دو چائے کے چمچ دہی۔ ایک چٹکی پسے ہوئے سفید زیرے کو آدھا گلاس پانی میں حل کر کے پی لیں۔ تین سے چار دفعہ میں انشاء اللہ چھالے ختم ہو جائیں گے۔

○ **دانت کے درد کے لیے:** لونگ کا سفوف اور لیموں کا عرق خوب مل کر دانت پر لگائیں۔ انشاء اللہ درد ختم ہو جائے گا۔